شعور نے
لاشعور سے کہا

مقصود الحسن عظیمی



شعور نے

لاشعور سے کہا!

فہرست

پیش لفظ 5

شعور نے لاشعور سے کہا! 10

اک نیا دن طلوع ہوا 20

میری ناتواں ہستی 44

پگھلتا برفاب 57

بندہ خوش تے رب خوش 68

سفرِ خود آگاہی 79

کوچۂ علم و عرفان 91

صاحبِ نکتہ فشاں 103

اندر کی رُت بدل گئی 119

استوار تعلق 133

دائرہ 146

گیان دھیان 156
سورس آف انفارمیشن 166
اسے دیکھ کبیر ارویا 189
صراطِ مستقیم 207
یااللہ میں چاہتا ہوں 218
یہ محبوب کیا ہوتا ہے؟ 229
ماں کا مقام 245
پانچواں رشتہ 258
رخشِ خیال 269
خیال کی چوٹ 289
انگاروں کی کاشت 299
ادھورا پن 311
عیدِ صبحِ بہاراں 324

اِقراء.....335
وہ مقامِ قرب تلک گئے 346
اَللّٰہُ اَکبَرُ.....354
تعلیمات قلندر باباؒ 363

پیشِ لفظ

دنیا میں پیدا ہونے کے بعد ہر انسان کے ذہن میں کبھی نہ کبھی کچھ ایسے سوال ضرور اٹھتے ہیں جن کے جواب وہ اپنے اطمینان قلب اور ذوق کی تسکین کے لیے ضرور چاہتا ہے۔ جب کبھی انسان نے اس بات پر غور کیا کہ آخر وہ کہاں سے آیا اور کہاں کو جانا ہے، آیا ہے تو کیوں، یہاں رہ رہا ہے تو کیوں؟ یہ طفولیت، بچپن، لڑکپن، نوجوانی، ادھیڑ عمری اور پھر یہ آکر نہ جانے والا بڑھاپا، یہ صحت، تندرستی، بیماری اور موت، آخر یہ سب کیا ہے؟ یا پھر اسی قبیل کے نہ جانے اور کتنے سوال اُس کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، اور جتنے منہ اتنی باتیں کے مصداق، اتنے ہی جواب اُس کے سامنے آتے ہیں۔

ماں باپ سے لے کر مکتب اور مدرسوں کے اساتذہ، یار دوستوں سے لے کر عُلمائے کرام تک ہر ایک کا جواب وقتی طور تو شعور کو مطمئن کر دیتا ہے لیکن جب کوئی حقیقت شناسی کا ذوق رکھنے والا ذہن اُس جواب پر غور کرنے بیٹھتا ہے، تو ہر جواب لاجواب ہی ثابت ہوتا ہے۔

حقیقت شناسی کا ذوق رکھنے والے ذہن میں جستجو کا مادہ تو ہوتا ہی ہے اور یہ جستجو اُس کو قرار لینے نہیں دیتی، کسی ایسے جواب کی تلاش میں جو کسی بھی کسوٹی پر پورا اترنے کے قابل ہو، وہ فلسفیوں کے افکار، شاعروں کے تخیلات اور مذہب کے نظریات، سبھی کا جائزہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اب جب اُس کا واسطہ متضاد اور مخالف ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے سے متصادم افکار اور نظریات سے پڑتا ہے تو اُس کو یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ وہ کس بات کو اپنانے اور کس کو چھوڑ دے۔ علم کے باغ کا ہر ہر درخت اپنی بو قلمونی اور ندرت کے سبب اس کی توجہ کا طلب گار ہوتا ہے اور وہ خود

کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر کہ کس شجر علم کا پھل یا کون سے افکار و نظریات اس کی ذہنی اور روحانی صحت کے لیے مفید رہیں گے۔

شعور انسانی کی رہنمائی کے لئے قدرت کا فیضاں ازل سے جاری ہے ابد تک جاری رہے گا۔ آدم کے اس دنیا میں آنے کے بعد سے آج تک اللہ کے فرستادہ بندوں نے شعور انسانی کی راہنمائی کا فرئضہ مشن جان کر نبھایا ہے۔ اللہ کے بھیجے ہوئے انبیاء اور رسولوں نے حقیقت کی طرف راہنمائی کا فرض اپنی جانوں کو جوکھم میں ڈال کر پورا کیا۔ جب سلسلہنبوّتو رسالت اپنے اختتام کو پہنچا تو رُشد و ہدایت کی سنت کو اپنانے والے 'انبیاء کے علوم کے وارث، اولیااللہ نے راہِ حیات کو منور کرنے کے لیے انبیاء کی روشن کی ہوئی مشعل کو اٹھالیا۔ اولیاکرام پہلے انبیاء کی بخشی ہوئی روشنی سے اپنے ذہنوں کی آبیاری کرتے ہیں اور جب وہ اپنی طرزِ فکر کو انبیا علیہم السلام کی طرز فکر میں ڈھال لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو دوسرے لوگ اُن کی شخصیت سے متاثر ہو کر خود کو اُن کے رنگ میں رنگنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

انبیاءاللہ کی تعلیمات انسان کے علم میں براہ راست جو اضافہ کرتی ہیں سو تو وہ کرتی ہی ہیں، اپن کا اصل مقصد و منشاانسان کی طرزِ فکر کی اصلاح کرنا ہوتا ہے۔ وہ انسانی فکر کو اُس راہ پہ ڈال دیتے ہیں جس پر قدم قدم چل کر انسان علم و آگہی، حقیقت شناسی اور عرفانِ ذات کی منازل طے کرتا ہوا، لامحدودیت کے عالمین سے واقف اور روشناس ہو جاتا ہے۔ طرزِ فکر کی درستی سے انسان جہاں ایک طرف و دنیاوی معاملات میں، اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے، بہتری اور کارکردگی میں اضافے کا مظاہرہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے، وہاں اس کی اُخری زندگی کے لئے بھی آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

دیکھا جائے تو طرزِ فکر ہی تو وہ چیز ہے جو انسان کے عدم سے وجود میں انے کے بعد اُس کی بنا اور بقا کا سبب ہے۔ یہ اسی طرزِ فکر کا شاخسانہ ہے کہ انسان خود کو کیسا دیکھتا ہے اور اس کائنات کو کیسے، وہ اس دنیا میں کیسی زندگی بسر کرتا ہے اور دوسروں سے کیسا برتاؤ کرتا ہے۔ یہ بھی اسی طرزِ فکر کی وجہ سے ہوتا ہے کہ انسان خوش رہتا ہے یا اُس کی ساری زندگی ناخوشی میں بسر ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کو سکون، خوشی، راحت اور آرام سے گزارتا ہے یا پھر اُس کی زندگی اضطراب، بیزاری، بے اطمینانی اور بے چینی کا مرقع بن کر رہ جاتی ہے۔ انسان اپنے ارد گرد پائے جانے والی چیزوں کو جس طرح سے دیکھتا اور جس طرح اُن سے استفادہ کرتا ہے، اُس کا یہ اندازِ نظر اُس کی طرزِ فکر کا عکس ہی تو ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام اسی بات کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ انسان کو جیسی عینک لگ جاتی ہے وہ دنیا کو اسی رنگ میں دیکھنے لگ جاتا ہے۔

ایک بار مرید نے اپنے مراد کے ہمراہ ٹہلتے ہوئے ایک مسجد دیکھی۔ اُس مسجد کے پانچ دروازے دیکھ کر اُس نے سوچا کہ ان دروازوں کی تعداد کا تعلق پانچ نمازوں سے جڑتا ہے یا یہ انسانی حواسِ خمسہ کی علامت ہیں۔ پھر اس کو خیال آیا کہ پڑھنے والے تو دن رات میں آٹھ نو بار بھی نمازیں پڑھتے ہی ہیں اور حواس بھی محض پانچ کب ہیں۔ ہاں، مشہور فقط پانچ ہی ہیں۔ تو پھر یہ ضرور انسانی ہاتھ کی پانچ انگلیوں کا استعارہ ہیں۔ پھر اُس کو خیال آیا کہ اگر اس مسجد کے بنانے والے کے نزدیک انگلیاں ہی مراد ہوتیں تو دس یا بیس دروازے کیوں نہ ہوئے۔ یہ ضرور پانچ ارکانِ دین کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ مگر کیا دین کے ارکان محض پانچ ہی ہیں؟ کیا قرآنی ادامر و نواہی اسلام کے ارکان نہیں؟ اور وہ تو نہ جانے کتنے بنتے ہیں، اُس نے کبھی گنے تو نہیں۔ تو پھر ان پانچ دروازوں کا کیا مطلب ہوا؟ وہ الجھتا ہی چلا گیا۔ پیشتر اس کے کہ وہ اس بات کی وضاحت اپنے مراد سے چاہتا، اُس کے دل میں ایک اور بات آئی۔ کہیں معمارِ مسجد نے پانچ

دروازے اللہ تعالیٰ کی اُن پانچ صفات کی طرف متوجہ کرنے کا اہتمام کرنے کو تو نہیں بنائے جن کا تذکرہ سورہ اِخلاص میں کیا گیا ہے، یہ بات اُس کے دل کو لگی۔ اُس نے اس خیال کی تصدیق اپنے مراد سے چاہی۔

مراد نے اپنے مرید کی بات سن کر کہا۔ ''بھئی جس کو جیسی عینک لگ جاتی ہے، اُس کو ویسی ہی سوجھتی ہے،

اس کے بعد انہوں نے اُس کو ایک کہانی سنائی۔ ایک بار ایک سادھو کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں اس کو ایک بنیا مل گیا۔ اس بنیے نے سادھو سے کہا۔ 'مہاراج! اگر اجازت ہو تو آپ کے ساتھ ہو لوں۔ اس سے ہم دونوں کو سفر میں سہولت رہے گی۔'

سادھو نے اُس کو اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دے دی۔ اب وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ کچھ ہی دور گئے تھے کہ انہوں نے ایک تیتر کو بولتے سُنا۔ سادھو نے بنیے سے دریافت کیا۔ ''آپ کیا سمجھے؟ یہ تیتر کیا کہہ رہا ہے؟'' بنیے نے کہا۔ ''یہ کہہ رہا ہے۔ لون، تیل، ادرک! لون، تیل، ادرک!۔ سادھو ہنس دیا اور کہا۔ ارے نہیں بھئی یہ کہہ رہا ہے۔۔ سبحان تیری قدرت، سبحان تیری قدرت!۔

اور فرمایا۔ ''ساری بات عینک کی ہی ہوئی، عینک میں جیسا شیشہ ہو گا، ویسا ہی تو دکھے گا! یعنی ساری بات طرزِ فکر کی ہے۔ جس کی جو طرز فکر ہوتی ہے وہ اُسی کے مطابق سوچتا، سمجھتا، دیکھتا، سنتا اور کرتا ہے۔

شعورِ انسانی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ہر بات کو سمجھنے اور جاننے کی کوشش کرتا ضرور ہے۔ چاہے کچھ ہی دیر میں وہ اس کاوش سے باز آجائے، یہ ایک الگ بات ہے۔ فطری تجسس کے سبب شعور میں جانکاری کا جذبہ اور شوق اُس کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ تلاش میں رہے۔ بچپن میں یہ جذبہ اور شوق اپنے عروج پر ہوتا ہے لیکن

جوں جوں عمر بڑھتی ہے معاشرہ کی وہ قدریں جن کے تار مصلحتوں سے بندھے ہوئے ہوتے ہیں، آڑے آنا شروع ہو جاتی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ یہ جذبہ معدوم ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس کتاب میں شامل کئے گئے مضامین ایک ایسے انسان کی اسی فطری تلاش کی کہانی ہے، جو سوچتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ سوچنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اُس کو ایک ہدایت یافتہ بندہ مل جاتا ہے۔ اُس ہادی کی تربیت اُس کے شعور کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ اپنے لاشعور سے استفادہ کرنا سیکھ لیتا ہے۔ اُس لاشعور سے جو سب جانتا ہے کیونکہ لاشعور علم ہے اور شعور حواس ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ اصل، حقیقی اور خالص ترین علم لاشعور ہے اور اس علم کو حواس جس قدر بھی اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں، وہ انسان کا شعور بن جاتا ہے۔

شعور جب تک تربیت نہیں پا لیتا، لاشعور سے اجتناب کرتا ہے، اُس سے گریزاں رہتا ہے اور اس کو اجنبی مانتا ہے۔ بالکل اُس بچے کی طرح جس کو اُس کی ماں کسی بھی اجنبی کے قریب نہیں جانے دیتی۔ لیکن جب کوئی بچہ کسی مہربان اجنبی سے اتفاقاً یا اپنی ماں کے کہنے پر بے تکلف ہو جاتا ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ کتنی بڑی نعمت سے محروم رہ جاتا۔

اس کتاب کے بیشتر مضامین ماہنامہ روحانی ڈائجسٹ کراچی میں 9-1997 کے عرصہ میں ''شعور نے لاشعور سے کہا'' کے عنوان سے ایک سیریل کے طور پر شائع ہوئے۔

ڈاکٹر مقصود عظیمی

۱۴ دسمبر ۲۰۰۵ء۔۔۔ پشاور

شعور نے لاشعور سے کہا!

دور تک پھیلے وسیع و عریض سمندر کے افق پر صبح کی روشنی اندھیروں پر حاوی ہو چکی تھی۔ ستارے منظر سے غائب ہو چکے تھے۔ ابھی سورج نکلنے میں کچھ دیر تھی۔ صبح کی ہوا تازگی اور فرحت سے لبریز محسوس ہو رہی تھی۔ تیرتے بادلوں کے ٹکڑے دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آسمان کے کینوس پر کسی بے نیازی سے شفق رنگ بکھیر دیئے ہوں۔ ساحل پر ایک راہب ٹہل رہا تھا۔ ساحل سے آکر ٹکراتی لہروں کی شوریدہ سر آوازوں، ساحلی پرندوں کی چہکاروں اور نم ہوا کے جھونکوں سے لطف لیتے ہوئے وہ کچھ سوچنے لگا۔ دھیان میں یکسوئی پیدا ہوئی تو سوچ میں گہرائی آتی گئی۔ وہ اپنی سوچوں میں مگن ہوتا چلا گیا۔ وہ ان سوچوں میں کافی عرصے سے گرفتار تھا۔

اُس کی سوچ کا مرکز و محور یہ خیال تھا کہ وہ اپنے خالق، اپنے رب، اپنے مالک، اپنے خدا سے کیوں کر مل سکتا ہے؟۔۔۔ وہ اُس سے کیونکر متعارف ہو سکتا ہے؟۔۔ اُس صانع اکبر کا عرفان کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے جس کی صناعی اور کاریگری کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے؟۔۔ اُس محیطِ کل ذات کا ادراک ہو تو کیوں کر ہو؟ یہ سوچیں اُس پر کافی عرصے سے حاوی اور طاری تھیں۔۔ آخر وہ اللہ کو کیوں کر پا سکتا ہے؟ پا بھی سکتا ہے یا نہیں؟

جب بہت زیادہ سوچ بچار کے باوجود اُس کو اس عقدے کے حل ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔۔ غور و فکر اس گتھی کو سلجھانے سے عاجز آ گئے تو اپنی بے بسی کے اعتراف کے طور پر راہب کی نظریں اوپر اٹھیں اور وہ آسمان کی پنہائیوں میں متلاشی نگاہوں سے جھانکنے لگا۔۔ کہتے ہیں۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے اُس راہب کی راہنمائی اور ہدایت کو ایک فرشتہ بھیجا۔

وہ فرشتہ اُس راہب کو ایک بچے کے روپ میں ساحلِ سمندر پر کھیلتا نظر آیا۔ اُس بچے کے پاس ایک بالٹی اور ایک پیالہ تھا۔ وہ بچہ سمندر سے پانی کا پیالہ بھر بھر کر بالٹی میں ڈال رہا تھا۔ بالٹی سمندر کے پانی سے لبالب بھر چکی تھی مگر وہ بچہ اپنے کام میں مگن تھا۔ وہ سمندر تک جاتا ، پیالے میں پانی بھرتا اور لا کر بالٹی میں انڈیل دیتا۔ پانی لبالب بھری ہوئی بالٹی سے باہر بہہ کر ریت میں جذب ہو جاتا ۔۔ بچہ دوبارہ پیالہ بھرتا اور لا کر بالٹی میں اندیل دیتا۔ بچہ پانی کے باہر چھلکنے کی پرواہ کیے بغیر مزید پانی بھرنے لگ جاتا۔

راہب بچے کی اس کار گزاری کو کافی دیر تک دیکھتا رہا۔ بچہ بالٹی میں پانی ڈالتا رہا اور پانی بالٹی سے چھلک کر باہر بہتا رہا۔ بالآخر جب راہب سے رہا نہیں گیا تو وہ رُکا اور بچے کے پاس جا کر بڑے پیار سے گویا ہوا۔

''تم یہ کیا کر رہے ہو؟''

بچے نے اُس کو دیکھے بغیر جواب دیا۔

''میں سمندر کو اس بالٹی میں ڈال رہا ہوں۔''

راہب اس جواب کے لئے تیار نہ تھا۔ اس نے محظوظ ہوتے ہوئے ، بچے کو سمجھانے کے لئے استفہامیہ انداز میں کہا۔

''بھلا کہیں سمندر بھی اس بالٹی میں آسکتا ہے؟ بچے تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ ایسی کوشش کرنا بھی حماقت ہے۔''

بچہ رُکا۔ اس نے اپنی نظریں راہب کے چہرے پر گاڑ دیں اور بڑے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا:

''اور کیا یہ حماقت اور پاگل پن نہیں کہ تم پیالہ بھر کھوپڑی میں خدا کو سمیٹ لینے کی کوشش کر رہے ہو۔''

راہب یہ بات سُن کر ششدر رہ گیا۔

جب شعور نے صدیوں سے دہرائی جانے والی اس روایت کو سنا تو وہ بھی قائل ہو گیا کہ عرفان اور آگہی اور وصل الٰہی کی کوئی بھی کاوش محض اک سعی لا حاصل ہے۔ لہٰذا وہ کسی بھی ایسی خواہش سے پہلو تہی پر کار بند ہوتا چلا گیا۔ جب بھی فطری تقاضے کے تحت اس کے اندر تلاشِ حق، خدا شناسی، عرفان و آگہی یا خدا سے محبت کی طلب جاگتی تو شعور خود کو بالٹی جتنا محدود اور اللہ کی ذاتِ اقدس کو سمندر کی طرح وسیع اور بے کنار جان کر اس خواہش سے اجتناب پر مجبور ہو جاتا۔

اس مجبوری نے شعور میں ایک احساسِ بے بسی اور محرومی کو جنم دینا شروع کیا۔ یہ احساسِ محرومی بڑھتے بڑھتے ردِ عمل پر منتج ہوا۔ ردِ عمل کے نتیجے میں اضطراب و بے چینی پیدا ہوئی۔ بے چینی اور اضطراب سہتے سہتے جب اُس کی ہمت جواب دینے لگی اور اعصاب چٹخنے لگے تو شکوہ بر لب شعور سراپا احتجاج بن گیا۔ شعور اپنے احتجاج سے خود بھی عاجز آ گیا۔ اس کا احتجاج کس کے خلاف تھا؟ اپنی بے بسی کے خلاف، اپنی عاجزی اور محدودیت کے خلاف یا اپنی ناسمجھی کے خلاف۔۔۔ وہ مزید کڑھ کر رہ جاتا اور پھر یہ کہ احتجاج تھا تو کس سے؟ آخر وہ کس کے سامنے فریاد کناں تھا؟ وہ کس سے اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے، اس مشکل سے باہر آنے اور اس دشواری کو آسان کرنے کی آس رکھتا تھا؟

''اوہ میرے خدا!'' اس نے تھک کر ہار کر اپنے خدا سے دعا کرنی چاہی لیکن اس کی دعا اس کے لبوں پر تھرتھرا کر رہ گئی۔ اُس نے تو خدا کو اپنی پہنچ سے بہت دور مان رکھا تھا۔ جس خدا کو وہ جاننے سے عاجز اور لاچار تھا اُسی سے

دستگیری کی درخواست کرنا اُس کو کچھ عجیب سا لگا۔ اتنی بڑی ذات کو اُس سے بھلا کوئی سروکار کیوں ہوگا؟ اتنی بڑی کائنات کا انتظام و انصرام کرنے والی ذات کو اُس کی بے مایہ ہستی بھلا کیا پرواہ ہوگی؟ جس ذات سے اُس کا نہ کوئی تعلق نہ کوئی ربط، وہ اُس کو کس منہ سے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرے؟ اپنی کم مائیگی اور چھوٹے پن کے احساس پہ وہ گھبرا کر ہی تو رہ گیا۔۔۔ احساسِ کمتری نے اس کو مایوسی اور اداسی کے اندھیروں میں دھکیل دیا۔۔۔ گھٹن کے احساس سے اُس کا دم گھٹنے لگا۔۔ اُس نے خود کو مقید اور محبوس محسوس کیا اور پھر پھڑا کر رہ گیا۔

بیان کی گئی روایت میں راہب کی راہنمائی کے لئے خالق ارض و سما نے ایک فرشتہ بھیجا تھا۔ یہ بات امید کی کرن بن کر خود اسی روایت سے پھوٹ نکلی جس نے شعور کو اندھیروں میں دھکیل دیا تھا۔ جب شعور کی توجہ امید کی اس کرن پر مرکوز ہوئی تو وہ کرن بڑھنا اور پھیلنا شروع ہوگئی۔۔ بڑھتے بڑھتے ایک روشن مشعل بن گئی۔ شعور نے اس روشن مشعل کی طرف قدم بڑھائے۔ آگے بڑھتے ہوئے اُس نے خود کو ایک مینارۂ نور کے روبرو پایا۔ لیکن وہ مینار ہنور کوئی فرشتہ نہ تھا۔ اُس روشن ہیولے کو دیکھتے ہوئے اُس کو کچھ یوں محسوس ہوا گویا وہ ایک خضر صورت، پیرانہ سال بزرگ کے سامنے آگیا ہے۔ ایک ایسے بزرگ جن کے چہرے پر اک عجیب سی رونق تھی۔ ایک نظر میں وہ اُس کو ایک ایسے بوڑھے کی طرح لگے جن کی عمر کا وہ تخمینہ اور کچھ اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا۔ اُس کو اُن کے چہرے پر صدیوں کے تجربے کی چھاپ اور بچوں کی سی معصومیت اور بے نیازی ایک دوسرے میں باہم جڑی اور گھلی ملی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ روشن اور منور ہیولیٰ ایک طرف ماضی کا امین تھا اور دوسری طرف مستقبل کا نقیب۔ ایک طرف خالق کا سا انداز تفاخر تو دوسری طرف مخلوق کی سی عاجزی اور انکسار۔۔ ان کی تقدیس اور احترام کے باوجود شعور ان سے بے تکلف ہونے کی خواہش سے خود کو نہ بچا سکا۔

اُس مینارہ نور کے سامنے ، جس کی ضیاء پاشیوں سے شعور جگمگا اٹھا تھا، اُس نے خود کو بہت چھوٹا اور حقیر جانا۔ اُس نے اُس مینارہ نور کو اپنا ہادی، راہبر اور رہنما مان لیا۔ اس کیفیت نے اُس کی گھٹن کے احساس کو تحلیل کر دیا۔ اس کو سکون اور قرار کا احساس ہونے لگا۔ عطا ہونے والی روشنی نے اُس کے اندر ایک اجالے کی سی کیفیت تو بھر دی لیکن اُس کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ وہ اس عطائے ربانی کو، جس نے اس کے باطن کو اپنی تابناک شعاعوں سے منور کرنا شروع کر دیا تھا کس نام سے پکارے۔ اُس نے اپنے تجسس کو چھپانے کی کوشش کئے بغیر یہ جاننے کو کہ وہ کس سے ہمکلام ہونے جارہا ہے، اپنے اُس ہادی، راہبر اور راہنما سے تعارف چاہا۔ اس نورانی ہیولے نے تبسم ریز لہجے میں کہا۔

''لاشعور!''

اس ایک لفظ نے اس کے اندر کوئی ہلچل مچائے بغیر ایک گداز اور آگاہی بھر دی۔ اُس نے جانا کہ وہ جو شعور نہیں۔ وہ جو اُس کی طرح محدود نہیں۔ وہ جو خود اُس سے ماورا اور بالاتر ہے۔ اُسی کو اس کا ہادی اور راہبر ہونا چاہیے۔ اگر وہ بھی خود اسی جیسا ہوتا تو وہ اس کے اندھیرے بھلا کیونکر دور کر سکتا تھا۔ اس کو روشنی اور تسکین کیسے پہنچاتا۔ شعور رہ نہیں سکا اور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''میری محدودیت کیونکر ختم ہو سکتی ہے؟ لامحدود ذات سے میرا رابطہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟''

شعور کی طلبِ علم اور محدودیت سے نجات کی خواہش سے لاشعور میں جگمگاہٹ کا ایک جھونکا سا لہرایا اور مسکراہٹ کا احساس بکھیرتے ہوئے خیال کی لہروں نے اس کے اندر الفاظ کے قالب میں ڈھلنا شروع کر دیا۔

''اگر ذہن انسانی محدود ہے تو وہ بھلا لامحدودیت کا ادراک کیونکر کر سکتا ہے؟ عرفان و آگہی درحقیقت لامحدودیت سے رابطہ ہی تو ہے۔ محدودیت میں رہتے ہوئے لامحدودیت کو پا لینا ہی اصل راز ہے۔ اصل بات ہی یہ

ہے کہ لاشعور کو غلبہ حاصل ہو جائے۔ شعور خود کو لاشعور سے اس طرح وابستہ کر لے کہ لاشعور کی جھلک شعور میں نظر آئے۔ جب شعور خود کو لاشعور سے وابستہ کر لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو لاشعور کی وہ صلاحیت جس کے باعث وہ لامحدود ہوتا ہے، شعور کو بھی حاصل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس ہی لئے تو مذہب، شریعت اور طریقت، عرفانِ خداوندی کی دعوت سر بلند کرتے ہیں۔۔ اگر شعور میں پھیلنے اور لاشعور کو اپنے اندر سمیٹ لینے کی صلاحیت نہ ہوتی تو عرفان اور وجدان کی باتیں زیر بحث آ ہی نہیں سکتیں۔

شعورِ انسانی نے خود کو ابعاد (Dimensions) کا محتاج بنا لیا ہے۔ وہ ابعاد کے بغیر دیکھنے اور سننے کی اہلیت پیدا کرنے سے انکار کر دیتا ہے، ورنہ یہ کچھ اتنا مشکل بھی نہ تھا۔ مثال کے طور پر مسلمان بچے کے کان میں اس کے پیدا ہوتے ہی اذان دیتے ہیں، عیسائی بپتسمہ کرتے ہیں، ہندو اپنی رسمیں کرتے ہیں، یہودی اپنے طریقے سے بچے کو شعور آشنا کرتے ہیں تا کہ بچہ دنیا میں آنے کی اصل غایت یعنی اللہ سے متعارف ہونے کی راہ پر گامزن ہو سکے۔ لیکن اب یہ ایک بہت ہی عجیب بات ہے کہ شعور کی تربیت کچھ اس انداز سے کی جاتی ہے کہ وہ یہ تسلیم کرنے تک سے منکر ہو جاتا ہے کہ اپنے خالق، اپنے رب، اپنے معبود خدا کو دیکھنا، اُس سے ملنا یا اُس سے راز و نیاز کرنا ممکن ہے۔ اب اور تو اور مسلمانوں نے بھی دیگر مذاہب کے پیروکاروں کی سوچ کو اپناتے ہوئے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ خداوند تعالیٰ کو دیکھا جانا ممکن ہی نہیں۔ اب ان سے اگر کوئی یہ دریافت کر لے کہ بندۂ خدا۔۔ تو پھر آپ گواہی اور شہادت کس بات کی دیتے ہیں۔۔۔ تو ان کے پاس سوائے کٹ حجتی اور کج بحثی کے اور کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

چلیں آپ یہ فرض ہی کر لیں کہ اللہ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یوں بھی تو انسان کی ہر دریافت کسی مفروضے کی وجہ سے ہی تو ممکن ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح ہی کوئی وسیلہ پیدا ہو جائے۔ لیکن جب آپ نے یہ طے کر لیا کہ اللہ کو دیکھا جانا ممکن ہی نہیں۔۔۔ تو اللہ تعالیٰ بھی کہتا ہے، ٹھیک ہے۔۔۔ نہیں تو نہ سہی !

وہ تو یوں بھی بے نیاز ہیں۔ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ (میں تو تمہارے اندر ہوں تو پھر تم دیکھتے کیوں نہیں؟) کہہ دینے کے بعد اللہ تعالیٰ اور مزید کس طرح اور کن الفاظ میں کہیں کہ مجھے دیکھو۔ سیدھی سی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ اُن کو تلاش کیا جائے، دیکھا جائے، اُن سے ملا جائے، تب ہی تو فرمایا، اَفَلَا تُبۡصِرُون۔ جب تک ہم اللہ تعالیٰ کے کہنے کو مان کر، اس کی جستجو نہیں کریں گے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے پر قادر نہیں ہو سکتے اور نہ ہی اُس کو پا سکتے ہیں۔

عدالت میں آپ کو بطور گواہ طلب کیا جائے اور آپ جا کر کہیں کہ میں نے دیکھا تو نہیں لیکن میں گواہی دیتا ہوں کہ ایسا ہے۔ اب ظاہر ہے کوئی بھی عدالت ایسی گواہی کو ہر گز بھی تسلیم نہیں کرے گی اور یہ کہے گی جس نے دیکھا ہو، جو چشم دید گواہ ہو، اُسے آگے آنے دیں تا کہ وہ گواہی دے سکے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں جہاں یہ فرمایا ہے۔ ”اگر سارے سمندر سیاہی بن جائیں اور تمام درخت قلم تو اللہ کی باتیں پھر بھی پوری نہیں ہو سکتیں۔۔۔ وہاں اصل مقصد یہی ہے کہ اللہ کو سمجھنے کے لئے آپ کو محدود طرزِ فکر سے نکلنا پڑے گا۔ اگر آپ محدودیت میں رہتے ہوئے اطلاعات وصول کریں گے تو آپ محدود ہی رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس طرح تخلیق کیا ہے کہ وہ لامحدودیت سے چل کر محدودیت میں داخل ہوتا ہے اور پھر اس پر یہ لازم کر دیا گیا ہے کہ وہ محدودیت سے نکل کر دوبارہ لامحدودیت میں داخل ہو جائے۔ انسان کے اس

سفر دنیا کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی اُن صلاحیتوں کا وقوف حاصل کرے جو اُس کے اندر مستور کر دی گئی ہیں۔ جو انسان اپنے اندر موجود صلاحیتوں سے آگاہ ہو جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا اہل قرار پاتا ہے۔ اسی سبب تو اللہ تعالیٰ انسان کو اپنی بہترین صناعی قرار دیتا ہے۔۔۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ اللہ کی بہترین صناعی نے لامحدودیت سے آگاہ ہونے کے بجائے۔۔۔ خود کو اسفل ترین محدودیت میں مقید کر لیا ہے۔"

شعور نے اس خیال آفرین کلام کی جھلملاتی لہروں کو نہایت توجہ سے اپنے اندر سمیٹ لیا۔ وہ جان گیا کہ بیان کی گئی روایت میں فرشتے نے 'پیالہ بھر کھوپڑی' کہہ کر دراصل اُس مادی ذہن کی طرف اشارہ کیا تھا جو کہ محدودیت کا سمبل ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے فرستادہ فرشتے نے بچے کے روپ میں آکر راہب کو یہی درس دیا تھا کہ خدائے بزرگ و برتر ایک غیر مادی اور لامحدود ذات ہے۔ اس غیر مادی اور لامحدود ذات کے ادراک کے لئے غیر مادی اور لامحدود حواس درکار ہیں۔

لاشعور نے شعور کی تشنگی اور پیاس کی آگ پر اپنی آگہی کی ٹھنڈی پھوار ڈالنے کو۔۔۔ اُس کو مزید نوازتے ہوئے کہا۔

"انسانی شعور کی محدودیت ہی اس کی اسفل زندگی اور گری ہوئی حالت کی ذمہ دار ہے۔ جب تک شعور اس محدودیت سے آزاد ہو کر، اس سے باہر نکل کر لامحدودیت سے آشنا نہیں ہو جاتا وہ کسی بھی دوسری مخلوق پر کوئی شرف یا امتیاز نہیں رکھتا۔ دیگر مخلوقات پر انسانی شرف اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب اُس کے شعور کا پھیلاؤ اُس کی محدودیت پر حاوی ہو جائے۔ قرآنِ حکیم میں "سلطان" کا لفظ اسی برتر اور لامحدودیت سے آشنا شعور کی طرف متوجہ کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ صرف ایسا شعور ہی یہ جانتا ہے کہ فضائے بسیط دبے کراں سے آگے کیا ہے؟۔۔ انسان

دنیا میں آنے سے پہلے کہاں تھا اور مرنے کے بعد کہاں چلا جاتا ہے؟ ہم زندہ کیوں ہیں؟،،، مر کیوں جاتے ہیں؟۔۔۔ زندگی کو قائم رکھنے والی توانائی کہاں سے آتی ہے؟ زندگی کن فارمولوں اور Equations پر قائم ہے؟ زندگی ہے کیا؟۔۔اس کا اصل مقصد اور غائیت حقیقی کیا ہے؟

شعور نے یہ باتیں سُنیں تو اس کو ڈھارس ہوئی ۔ اس نے لاشعور سے اس بات کی مزید وضاحت کی درخواست کی۔ لاشعور سمجھ رہا تھا کہ شعور اب اُس سے مزید کس بات کی وضاحت طلب کر رہا ہے۔ لئے اُس نے شعور سے براہ راست مخاطب ہو کر کہا۔ ''تمہاری محدودیت کی اصل وجہ تمہاری آرام طلبی اور ذاتی مفاد سے وابستگی کے سوا اور کچھ نہیں۔۔۔اس سے آزادی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تم اپنی رفتار بڑھاؤ۔۔۔ ذاتی مفاد کے بجائے آفاقی طرزوں سے وابستگی کی بناء پر شعور کی رفتار اور پھیلاؤ دونوں میں اضافہ ہوتا ہے۔۔ اور اس کا سب سے آسان، موثر اور مجرب طریقہ ہے۔۔ خدمتِ خلق!

جب انسان اپنی ذات سے ہٹ کر نوع انسانی اور مخلوقِ خدا کی خدمت کو اپنا شعار بنالیتا ہے تو اس کا ذہن ذاتی مفاد سے گزر کر آفاقی حدوں میں داخل ہو جاتا ہے اور اس کی رفتار بڑھتے بڑھتے اس قدر زیادہ ہو جاتی ہے کہ وہ ہر فاصلے کی نفی کر دیتا ہے خواہ یہ فاصلہ زمانی ہو یا مکانی۔ شعوری حدود و قیود ان مکانی اور زمانی فاصلوں سے ہی تشکیل پاتی ہیں۔ اس لئے جب شعور یحدود کی نفی ہونا شروع ہوتی ہے تو لاشعور کی اعلیٰ طرزوں سے روشناسی حاصل ہو جاتی ہے۔ لاشعور کی یہ اعلیٰ طرزیں کائنات کے نظام اور خالقِ کائنات کی صفات کا عرفان حاصل کرنے میں معاون اور مددگار ہو کر بالآخر ایک روز ذاتِ الٰہیہ سے قرب و وصل کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

شعور نے طمانیت کے جاں افزا احساس کو اپنے اندر موجزن دیکھ کر لاشعور کی طرف تشکر و اطمینان بھری نگاہ سے دیکھا۔ لاشعور کی طرف سے ملنے والے خیال کی ان لہروں نے اُس کے اندر طمانیت اور سکینت کی سی کیفیت بھر دی۔ اس کو کچھ ایسا محسوس ہونے لگا گویا اس کے تمام مسائل کا حل اس کو مل گیا ہے۔ اس کے اندر آگہی کی جوت جھلملانے لگی تو خوشی اور مسرت کا ایک جاں افزا احساس اس کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔ وہ ایک عالم سرخوشی میں خود سے یہ عہد کرنے لگا کہ اب آئندہ اپنی محدودیت پہ غالب آنے اور اُس سے نجات پانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔

اس کو کچھ یوں محسوس ہونے لگا گویا تپتے ریگزار کے ایک راہ گم کردہ مسافر کو نشانِ منزل مل گیا ہے۔ اس نے اپنے دل میں اس بات کا تہیہ کیا کہ اب وہ اپنی پوری توانائیاں اس منزل تک پہنچنے میں صرف کرے گا جس کا نشان اُس کو اُس کے لاشعور نے دیا ہے۔ اب لامحدودیت کی کھوج لگانا اور اس سے ہم کنار ہونا ہی اُس کی منزل تھی۔

اک نیا دن طلوع ہوا

نہر کنارے، گھنیرے درخت کے چھتنار سائے تلے، تازہ گھاس کی سرسبز مخملیں چادر پر نیم دراز، اکیلے اور تنہا نوجوان کی نگاہیں سامنے پھیلے نیلگوں آسمان کی بے کراں وسعتوں میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ وہ اُس خنکی اور تازگی سے جو پانی کی قربت کا خصوصی انعام ہوتی ہے، غیر محسوس طور سے لطف لیتے ہوئے، خواب آگیں سائے کی ردا اُوڑھے ،آسمان کی پنہائیوں میں کھویا ہوا تھا۔ اُس کی نگاہیں دور خلا میں کسی موہوم نکتے پہ جمی ہوئی تھیں ۔ اُس کا پورا وجود سکوت و تجسس کے سحر سے پتھرایا ہوا تھا۔ وہ کچھ سمجھنا چاہ رہا تھا۔ احساس کی سرحدوں سے دور خوابیدہ، خفتہ اور نا آسودہ سوالوں سے پیدا ہونے والی الجھنوں سے بے پرواہ اور بے نیاز وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ رخشِ خیال اپنی رو میں اپنی مرضی کی اڑانیں بھر رہا تھا۔

آج وہ فارغ تھا۔ اُس فراغت کو ساتھ لئے، وہ اکیلا نہر کنارے ٹہلتا ہوا وہاں آ نکلا تھا۔ سورج غروب ہونے میں ابھی کافی دیر تھی۔ سائے طویل ہونا شروع ہو چکے تھے۔ گھاس کی ہریالی اور درختوں کے مہربان سائے نے اس کو مدعو کیا اور وہ وہاں آ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے ذہن کو ایک کھلی چھوٹ ملی ہوئی تھی۔ اُس کا ذہن اُس وقت ایک معصوم کھلنڈرے بچے کی مانند موج میں آیا ہوا تھا جس کو ایک کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہو۔ وہ ایک وسیع و عریض باغ کی کھلی فضاؤں میں جس سمت چاہتا ہے۔۔۔ دور تک دوڑتا چلا جاتا ہے۔۔ کچھ دور جا کر کسی نئی سمت مڑ جاتا ہے۔ ایک تتلی کی مانند جھومتے ہوئے، کبھی اس پھول پر اور اُس پھول پر یا ایک شوخ پرندے کی طرح کبھی اس ڈال پر تو کبھی اُس ڈال پر کچھ قیام کرتا ہے پھُر پھُر اتا ہے اور آگے بڑھ جاتا ہے۔

دنیا کے ہنگاموں سے بے پرواہ، فکر معاش سے آزاد، روزگار کے جھنجھٹ اور الجھنوں سے بے پروائی کے اُم لمحات میں۔۔اُس کو یہ سب کچھ فرحت آمیز لگ رہا تھا۔۔نہ کوئی پریشانی، نہ کوئی فکر۔۔۔نہ کوئی خوشی، نہ کوئی مسرت ۔۔لیکن پھر بھی اچھا محسوس ہو رہا تھا۔۔۔ایک آزادی کا احساس تھا جو اچھا لگ رہا تھا۔بے فکری کی کیفیت سے سرشار ، بے خیالی کے اُس عالم میں ۔۔۔اُس کی نگاہ خلا سے ہٹ کر ۔۔۔ سامنے پھیلے ہوئے درخت کی ۔۔ پانی پہ جھکی ایک شاخ پر آ ٹکی۔

نگاہ نے اُس ڈالی کے سرے پر ایک نوزائیدہ کونپل کو اپنا مستقر بنا لیا۔ وہ کونپل اپنی نمو کے ابتدائی دور کی تازگی اور نئے پن کی چمک لئے ہوئے تھی۔ جیسے کوئی معصوم سا بچہ ۔۔۔ابھی ابھی نہا کر بیٹھا ہو، اُس کے تازہ حسن اور شاداب خوبصورتی نے اُس کی نگاہ کو مسحور کر لیا۔ وہ ایک ٹک اُسے دیکھے جا رہا تھا کہ قریب کی ایک ڈال سے ایک پرانا پتہ ٹوٹا اور ہوا کے دوش پر تیرتا، نیچے پانی میں جا گرا اور پانی اُسے اپنے ساتھ بہا کر لیتا چلا گیا۔

نظر گرتے پتے کے تعاقب میں پانی کی سطح سے ٹکرائی تو اُس کے ذہن میں ایک جھماکہ سا ہوا۔۔۔اور ایک سوال بن گیا۔

"یہ کیا ہوا؟"

ذہن کی جھیل کی پُر سکون سطح پر سوال کا کنکر گرا اور لہر در لہر سوال پہ سوال اٹھتے چلے گئے ۔۔۔ یہ پتہ کیوں گرا؟ یہی پانی جو اس پتے کو بہا کر کہیں دور لے گیا جب درخت کی جڑوں سے ہوتا پندرہ بیس فٹ کی بلندی تک دور کرتا ہوا اس پتے کی رگوں میں داخل ہوا تھا اُس میں زندگی کی لہر بن کر دوڑ رہا تھا اور اب یہی پانی اُس کا مرقد بن گیا ہے۔

"لیکن آخر یہ پتہ گرا ہی کیوں؟"

سوال کی لہر شعور کے کناروں سے ٹکرائی تو جوابی لہروں نے سوال کی لہر کو اپنی آغوش میں سمیٹ کر اُس کو عدم میں دھکیلنا شروع کر دیا۔۔۔ یہ ایک نظام ہے۔۔۔ قدرت کا تخلیق کردہ نظام۔۔۔ خالقِ ارض و سما کا وضع کیا ہوا۔۔۔ ایک ایسا نظام جس کو بنانے اور چلانے میں اُس کا کوئی شریک نہیں۔

جب زندگی کی لہریں دور کرتے ہوئے کسی درخت کے بیج کو اپنی آغوش میں لیتی ہیں تو بیج پودا بن جاتا ہے۔ جب وہی لہریں پودے کو اپنی گود میں کھلاتی ہیں تو وہ پودا درخت بن جاتا ہے اور جب وہی لہریں درخت میں متحرک ہوتی ہیں تو درخت برگ و بار سے لد جاتے ہیں۔۔۔ یہ پانی اُن کی زندگی بن جاتا ہے اور جب زندگی کی لہر کا دور مکمل ہو جاتا ہے تو پانی کا بہاؤ بھی تھم جاتا ہے اور پتہ خشک ہو جاتا ہے۔ پانی اُس میں دور کرنا بند کر دیتا ہے۔۔ وہ زندگی کے رنگوں سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے اور فنا کا زرد مٹیالا رنگ اُس کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ پتہ اس محرومی سے عاجز آکر۔۔ درخت سے جدا ہو کر کسی نئے سفر پر چل نکلتا ہے۔ پتے کا جھڑنا پتے میں زندگی کے دور کی تکمیل کا نشان ہے۔ ہوا کا جھونکا پتے کو ایک نئی زندگی کی راہ میں گامزن کر دیتا ہے۔ ایک ایسی زندگی جس کا ہمیں شعور نہیں۔

"شعور نہیں؟ کیوں نہیں؟"

سوال کی ایک اور لہر نے سر اٹھایا اور پھیلتی ہی چلی گئی۔ کناروں سے ٹکرائی۔ واپس پلٹی اور ہیجان بن گئی۔ ایک تلاطم اٹھا۔ ذہن میں تلاطم کا شور گونجا۔ شعور نے اس گونج کا یہ مطلب اخذ کیا کہ ہمیں اس کا شعور اس لئے نہیں ہوتا کیونکہ ہمارا علم ادھورا اور نامکمل ہے۔ علم کا ادھورا پن، ہمارے تجسس کی کمزوری اور شوق کے لاغر ہونے کے سبب ہوا کرتا ہے۔۔ تجسس کی قوت محرکہ ہی تو ذہن کو وہ طاقت بہم پہنچاتی ہے جو اُسے علم کی سرسبز اور شاداب وادیوں میں محوِ پرواز رکھتی ہے۔

اُس نے پلک جھپکی۔ پلک جھپکنے کے ساتھ ہی وہ اُسی منظر میں پلٹ آیا جہاں وہ مادی حدوں میں موجود تھا۔ جہاں وہ معصوم اور کومل سی کونپل ہوا کی دوش پر لہرا رہی تھی۔ نیلا آسمان اپنی بے کراں وسعتوں کے باوجود ایک محدود پسِ منظر کی صورت موجود تھا۔ چند ایک پرندے بنا پنکھ ہلائے ہوا میں تیر رہے تھے۔ کچھ بادلوں کی ٹکڑیاں نیلگوں فضا میں جزیروں کی طرح منظر کے حسن میں اضافے کو موجود تھے۔ نہر کا پانی سبک خرامی سے بہہ رہا تھا۔ اُس کے ذہن میں ایک سوال دھیرے دھیرے تیر رہا تھا۔

''اس علم کا حصول کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے جو ادھورا اور نامکمل نہ ہو؟''

''اس کے لئے مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''مطالعہ!'' اُس کے شعور نے فوراً جواب دیا۔

''مطالعہ۔۔۔؟ مگر کتابوں میں اُن باتوں کے جواب کیسے موجود ہو سکتے ہیں جو میرے ذہن میں آج آ رہی ہیں۔ کتابیں تو بہت پہلے کہیں ماضی میں لکھی جا چکی ہیں اور میرے یہ سوال تو موجودہ لمحے کی پیداوار ہیں؟''

''ہاں یہ تو ہے۔'' شعور نے اپنے لاجواب ہونے کا فوراً ہی اقرار کر لیا۔

''تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

اُس نے شعور کو کوئی دوسرا حل تجویز کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے سوچا۔ شعور نے کچھ توقف کے بعد اپنے ذخیرہ علم میں سے ایک جملہ اس کے ذہنی اسکرین پر اجاگر کیا۔

''جن سوالوں کے جواب انسان کی تصنیف کردہ کتب میں دستیاب نہ ہوں ، اُن کے لئے الہامی اور اسمانی کتابوں سے راہنمائی لینی چاہیے۔''

آسمانی کتاب؟

بھلا عظیم کتب میں ایسے چھوٹی چھوٹی باتوں کی وضاحت وتذکرہ کہاں ہے؟

میں نے پڑھا ہے ان میں سے کچھ کو لیکن مجھے تو وہاں ایسی کوئی بات نظر نہیں آ سکی۔ اُس نے سوچا اور سوچتا ہی رہا۔ کچھ دیر مزید بیٹھنے کے بعد وہ یہ سوچ کر وہاں سے اُٹھ کر چل دیا کہ آخر اس کا کوئی نہ کوئی طریقہ ہوگا تو سہی۔

ایک روز اپنے دوستوں کی محفل میں خوش گپیوں کے دوران اُس کے کسی دوست نے کہا۔ ''قرآنِ حکیم میں ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات کا تذکرہ موجود ہے۔'' یہ بات جس وثوق سے کہی گئی تھی اُس کا اُس پر اثر ہوا اور وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ واقعتاً ایسا ہی ہے؟''

اُس کا خیال تھا کہ اس کا وہ دوست اُس کو کوئی مثال دے کر اپنی بات کی وضاحت کرے گا یا اس کو کوئی ایسا واقعہ سنائے گا جس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ سکے مگر اس دوست نے صاف دلی سے کہا۔ ''میں نے تمہاری طرح گہرائی میں اتر کر اس پر کبھی غور تو نہیں کیا لیکن بہر حال یہ بات خود قرآن میں مذکور ہے کہ اس میں ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات بیان کر دی گئی ہے۔ اب یہ کھوج لگانے والوں پر منحصر ہے کہ وہ اس کو کھوجتے ہیں یا نہیں۔''

صاف دلی سے کہی گئی بات سے اور کچھ ہوا یا نہیں اتنا ضرور ہوا کہ اس نے قرآن حکیم کے مطالعے کا دوبارہ آغاز کر دیا۔ ترجمے اور تفسیر کے ساتھ۔ پورا قرآن پڑھ کر اُس نے خود کو ٹٹولا۔ ذہن میں تشنہ سوالوں کی تعداد کچھ مزید بڑھ چکی تھی۔ کئی پیچ مزید الجھ گئے تھے۔ کئی باتیں اُس کی سمجھ سے ہنوز بالا تر تھیں۔ اور کچھ مزید باہر ہو گئی تھیں۔۔ جو وہ تلاش کر رہا تھا وہی اُس کو مل نہیں رہا تھا۔ اُس نے اس خیال کو جھٹکنے کی بھی کوشش کی لیکن وہ بار بار پلٹتا رہا۔

معمولات زندگی اپنی اونچ نیچ کے ساتھ چلتے رہے۔ کبھی کبھی وہ اُن تشنہ سوالوں کے جواب تلاش کرتا اپنے ذہن کے ریگزاروں میں بھٹک کر رہ جاتا۔ ایک روز صبح تلاوتِ قرآن پاک کے دوران جب وہ سورہ بقرہ کی اولین آیات۔۔۔ هدى اللمتقين o الذين يومنون بالغيب۔۔۔ پڑھ رہا تھا کہ اسے یوں لگا گویا آسمان بجلی کے ایک کڑاکے نے اُس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو۔ اُس نے قرآنِ مجید کو بند کر دیا۔ گم سم اک سناٹے کے عالم میں بیٹھا رہ گیا۔

"یہ ہے وہ کتاب جس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے متقیوں کے واسطے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔" یہ جملہ وہ بچپن سے سنتا اور پڑھتا رہا تھا اس نے اس پر کبھی توجہ ہی نہ دی تھی کہ اس کا کیا مفہوم تھا اس لمحے اُس کے اندر جس خیال نے سر ابھارا تھا وہ اس کو بہت عجیب لگا تھا۔

"راہنمائی کرتی ہے متقیوں کی۔ متقیوں کی راہنمائی سے کیا مراد ہے؟ یہ سوال نہیں تھا ایک تیز دھار کلہاڑا تھا جو اس کے بنے ہوئے ذہنی سانچے پر چلا اور اُس کے اندر اتھل پتھل مچانے لگا۔ یہاں اُس کی سوئی اٹکی نہیں بلکہ ٹوٹ گئی تھی۔

بھلا وہ جو متقی بن جائے اُس کو کسی مزید راہنمائی اور ہدایت کی کیا ضرورت؟ اللہ تعالیٰ نے اِس کتاب کو نوع انسانی کے لئے باعث ہدایت کیوں قرار نہیں دیا؟ اگر تمام نوع انسانی نہیں تو اس کو کم از کم مسلمین کے لئے ہی سرچشمہ ہدایت قرار دے دیا جاتا۔۔ بھلا اس میں کیا بات مانع ہو سکتی تھی؟ ایسا کیوں نہیں کیا گیا اور ایسا کیوں کیا گیا ہے؟۔۔ کی تکرار کے جھکڑوں نے اُس کے شعور کو نڈھال کرنا شروع کیا تو وہ قرآن کی تلاوت بند کر کے اٹھ گیا۔

اس کے بعد جب بھی اس کے اندر اس۔۔۔ ''کیوں نہیں؟'' کی تکرار ہوتی اور وہ خود سے الجھتا۔ ایک بار اس نے خود کو بہلانے کے لئے یہ بھی سوچا کہ یونہی ایک شیطانی وسوسہ ہے اور وہ لاحول ولا قوۃ پڑھ کر اس خیال کو جھٹکنے کی کوشش کرتا۔ وہ اس خیال کو جتنا جھٹکتا۔۔ اتنا ہی وہ اُس کی منطق اور قوتِ استدلال کو للکارتا۔

ایک روز جب وہ دوپہر کے کھانے کے بعد اونگھ رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک عدالت کا سا منظر ہے۔ وہ کرسی عدالت کے سامنے موجود ہے۔ اُس پر فرد جرم عائد کی جا رہی ہے۔ اُس سے پوچھا جا رہا ہے کہ اُس نے اللہ کی آخری کتاب سے استفادہ کیوں نہیں کیا؟ اُس نے اس سے منہ کیوں موڑا؟

اُس نے خود کو جواب میں کہتے سُنا۔'' یہ کتاب میرے لیے تھی ہی کب؟ یہ تو متقیوں کے لئے ہدایت اور راہنمائی کے لیے اتاری گئی تھی۔ اس بات کا اعلان تو خود یہ کتاب اپنی اولین آیات میں کر رہی ہے۔ اگر میں متقی ہوتا تو ضرور اس سے مستفیض ہوتا۔''

ایک مترنم اور مدھر ہنسی ابھری اور اس کے ارد گرد پھیلتی چلی گئی۔ ہنسی میں کچھ ایسی بات تھی کہ وہ غنودگی کی حالت سے باہر آ گیا۔ لیکن اس ہنسی کے تاثر سے باہر نہ نکل سکا۔ وہ اس ہنسی کو کوئی مفہوم پہنانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس ہنسی میں اُس کی نادانی اور جہل کا خاکہ اڑایا گیا تھا۔ اُس کی چالاکی اور ہوشیاری پر اس کو داد دی گئی تھی یا

اُس کی معصومیت کا لطف لیا گیا تھا۔ وہ ہنسی خندہ استہزائیہ تھی یا خندہ تفہیمی و تائیدی۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اُس ہنسی کا ترنم اور کھنک اس کو رہ رہ کر یاد آتا۔ وہ فرد جرم اور اپنے جواب سے زیادہ اُس مترنم جھلملاتی ہنسی کو یاد کرتا۔

روز و شب گزرتے چلے گئے۔ ذہن میں اٹھتے بگولوں کے ساتھ اقلیم فہم و ادراک کی سیر کا شوق بھی پلتا رہا۔ اس کی ناتوانی اور قلتِ زادِ راہ بھی آڑے آتی رہی۔ جب بھی کسی بات میں قرآن کا حوالہ آتا۔ اُس کے ذہن میں ''ھدی اللمتقین'' کی صدا گونجتی اور پھر اُس کے ارد گرد ہی مترنم کھنکتی ہنسی بکھرتی چلی جاتی اور وہ اُس ہنسی کے ترنم کی یاد میں کھو سا جاتا جس کا مفہوم اس کے شعور کی گرفت میں نہیں آ رہا تھا۔

وہ جب بھی اپنی الجھن اور اُس الجھاؤ کا جائزہ لیتا جو اس کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھی تو وہ دیکھتا کہ متقی اس کے نزدیک ایسے لوگ تھے جن کا وجود کہیں ماضی بعید میں ہوتا ہوگا۔ آج کل ایسے لوگ کہاں ہیں؟ اب تو جس سے دریافت کریں کہ کیا آپ متقی ہیں؟ تو اس کا زیادہ سے زیادہ جواب یہ ملتا ہے۔ ''کیوں گنہگار کرتے ہو بھائی۔ ہم اس قابل کہاں؟ آپ دعا کریں کہ اللہ ہمیں متقی بنا دے۔''

وہ بات سمجھنے کے لئے دوستوں سے بات کرتا۔ اُن میں کچھ کا تاثر یہ ہوتا کہ وہ درست کہہ رہا ہے۔۔ بات تو واقعی سوچنے کی ہے۔ لیکن اکثر یہ کہتے۔۔۔ ایسا نہیں کہتے۔۔ ایسا تو سوچنا بھی بُری بات ہے۔

''کیوں نہیں کہتے؟ کہیں گے نہیں تو بات کیا خاک سمجھ میں آئے گی۔۔'' وہ اپنی بات پہ اصرار کرتا۔ وہ دلائل دیتے اور وہ اُن کی ہر ہر دلیل میں کوئی نہ کوئی نکتہ نکال لاتا۔ بات کو جس طرح سے وہ سمجھنا چاہ رہا تھا اس طرح سے اُس کو کوئی سمجھا نہیں پا رہا تھا۔ اُس کو کوئی ایسا تسلی بخش جواب نہیں مل رہا تھا جو اُس کو اندر سے شانت کر دے۔

ایک روز وہ کسی واقف کار کے یہاں گیا۔ اُن کے بچے نے بتایا کہ ابو تو گھر پہ نہیں ہیں۔۔ کہیں گئے ہیں اور جلد ہی آنے کا کہہ گئے ہیں۔ وہ واپس ہونے لگا تو گھر سے کہلوایا گیا کہ اُس کے بارے میں وہ صاحب جاتے ہوئے اپنے گھر والوں سے کہہ گئے تھے کہ اگر وہ آئیں تو اُن کو اندر بیٹھک میں بٹھا لیا جائے۔

وہ کمرے میں جا کر بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ اگر کوئی اخبار مل جائے تو وقت گزاری کے لئے وہ اخبار ہی دیکھتا رہے۔ وہاں اخبار تو کوئی نہ تھا البتہ میز پر پلاسٹک کور میں ملبوس ایک کتاب پڑی تھی۔ اُس نے وہ کتاب اٹھالی۔ اُس کتاب کا نام تھا۔۔۔ تذکرہ قلندر بابا اولیاؒ۔۔ اُس نے وقت گزاری کو اُس کتاب کی ورق گردانی شروع کر دی۔ وہ اس قسم کی کتب کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اس قسم کی کتب میں عام طور پر عقیدت میں غلو کے سبب لوگ بزرگوں کی باتوں کو ضرورت سے زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہوتا ہے اور یہاں تک کہ انہیں کوئی مافوق الفطرت ہستی ثابت کرنے کی کوشش میں اکثر سلیقے اور احتیاط کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

رق گردانی کے دوران اُس کی نظر کتاب میں مندرج ایک خط پر پڑی۔ وہ خط مذکورہ بزرگ نے اپنے ایک مرید کو اُس کے سوالوں کے جواب کے حوالے سے تحریر کیا تھا۔ وہ اُس خط کو پڑھنے لگا۔ خط کی عبارت نے اُس کی توجہ کو جذب کر لیا اور اُس خط کے مندرجات میں منہمک ہوتا چلا گیا۔ پڑھتے پڑھتے اس نے الہامی علوم کے حوالے سے پڑھا:

"جتنے بھی آسمانی صحائف ہیں، اللہ تعالیٰ اُن سب کو کتاب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اُن میں قرآن بھی ہے۔ چنانچہ قرآن میں یہ علم موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود بار بار قرآن کو کتاب کے نام سے موسوم کیا ہے۔ جو قرآن نہیں سمجھتے وہ جو بھی چاہیں کہیں، اُن کی زبان کون پکڑ سکتا ہے؟ اس لئے ضروری ہے کہ تم عربی پڑھو اور قرآن کو

قرآن کے الفاظ میں سمجھو۔ بغیر کسی تاویل اور بغیر کسی اثر کے۔ بالکل غیر جانبدار ہو کر۔۔ اس تصور سے کہ اللہ تعالیٰ کیا فرماتے ہیں۔"

یہ بات۔۔ بات کا یہ انداز۔۔ اُس کو ایک نئے پن کا احساس ہوا۔ خصوصاً غیر جانبداری کی ہدایت نے اُس کو اُن کی بات میں وزن اور صداقت کا احساس عطا کیا۔ پھر جب وہ ان کے تحریر کردہ خط کے ان الفاظ پر پہنچا:

"ھدی اللمتقین oالذین یومنون بالغیب۔"

"مفہوم: یہ کتاب اُن لوگوں کو روشنی دکھاتی ہے جو اپنے اندر اللہ کے بارے میں ذوق رکھتے ہیں"

"غیب سے مراد وہ تمام حقائق ہیں جو انسان کے مشاہدات سے باہر ہیں۔ وہ سب کے سب اللہ کی معرفت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایمان سے مراد ذوق ہے۔ ذوق وہ عادت ہے جو تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ اُسے کوئی معاوضہ ملے گا بلکہ صرف اس لئے کہ طبیعت کا تقاضہ پورا کرے۔ متقی سے وہ انسان مراد ہے جو سمجھنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتا ہے۔ ساتھ ہی بدگمانی کو راہ نہیں دیتا۔ وہ اللہ کو اور اللہ کے کاموں کو بالکل الگ سے پہچانتا ہے۔ صحیح طور پر پہچاننے کی وجہ یہ ہے کہ اُس کے اندر ذوق موجود ہے۔ یہ نہ سمجھ لینا کہ ہر انسان کے اندر یہ ذوق موجود نہیں۔ درحقیقت یہی ذوق لائف اسٹریم یعنی چشمہِ حیات۔۔ اس ہی سے زندگی کی بنا ہے۔ انسان اس کو استعمال کرے نہ کرے، یہ اُس کی اپنی مرضی اور مصلحت ہے۔ یہ ذوق ہی انسان کے اندر بستا ہے ورنہ انسان خلا ہے۔"

یہ پڑھ کر اُس کو لگا کہ ایک بہت پرانی پھانس۔۔ جو ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتے اور پھولتے ہوئے اک شہتیر کی صورت اختیار کر چکی تھی۔۔ اچانک ہی نکل گئی ہے۔ اُس کے اندر کا ایک بہت پرانا زخم یک لخت دُکھنا بند ہو

گیا تھا۔ ایک ناسور تھا جو صاحب تذکرہ مسیحائی کی زد میں آکر مٹ کر رہ گیا تھا۔ ایک آگ تھی جو بجھ کر رہ گئی تھی۔ ایک پھوڑا تھا جس کا مواد اچانک ختم ہو گیا ہو۔

اُس وقت اس کے اندر ایک ہی بات کا تاسف رہ رہ کر ابھر رہا تھا۔ یہ کتاب مجھے پہلے کیوں نہیں ملی۔ میرے اتنے سال میری جہالت کی نظر ہونے سے بچ جاتے۔

وہ جوش و تاسف سے بھرا۔۔ وہ کتاب مانگ کر گھر لے آیا۔ رات بھر میں اُس نے اُس کتاب کو پڑھ ڈالا۔ خصوصاً اُن کا وہ خط۔۔ اُس نے اُن کا خط کئی بار پڑھا۔ صبح ہوئی تو اُس کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ آج سچ مچ ایک نیا دن طلوع ہو رہا ہے۔

اُس کو یقین ہی نہیں آرہا تھا وہ بات جو اسے کوئی سمجھا نہیں پا رہا تھا وہ اس قدر آسانی اور سہولت سے اُس کے فہم و ادراک میں اتر چکی ہے۔ خوشی اور سرشاری کا ایک نادر احساس اس کے رگ و پے میں دوڑ رہا تھا۔ صبح دم جب مؤذن نے پکارا تو اس کو لگا گویا رات سچ مچ ختم ہو گئی اور اک نیا سویرا طلوع ہونے کو ہے۔

وہ نماز کے لئے کھڑا ہوا۔ ایک سرشاری اور سرمستی کے عالم میں اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوا۔ سجدے میں اُس کے ہاتھ سے دامن ضبط چھوٹ گیا اور وہ بے اختیار رو دیا۔ خوشی، تشکر اور تاسف کے آنسو اُس کا منہ دھو رہے تھے۔ ایک بیمار کو قرار آرہا تھا۔ ایک مریض شفا پا رہا تھا۔ گداز نے اُس کی صلاحیتِ جذب کو دوچند کر دیا۔ اُس کے ارد گرد پھیلتا طمانیت کا ایک نور اُس کو اپنے اندر اترتا اور پھیلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اپنے اندر کچھ ایسی روشنی محسوس کر رہا تھا جس نے اُس کے سامنے راہوں پر چھائی تاریکی اور اندھیروں کو ختم کر دیا ہو۔

نماز سے فراغت کے بعد وہ قرآنِ حکیم، فرقان مجید کھول کر بیٹھ گیا اور وہیں سے پڑھنا شروع کیا جہاں کئی برس پہلے اُس کی سوئی ٹوٹی تھی۔ ایک نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ، ایک بڑھے ہوئے ادراک اور وسیع تر شعور کے ساتھ اس نے پڑھنا شروع کیا۔

"یہ ہے وہ کتاب جس میں نہیں کوئی آڑ یا ترچھا پن۔۔ بے شک یہی وہ کتاب ہے جو اُن لوگوں کو روشنی دکھاتی ہے جو اپنے اندر اللہ کے بارے میں ذوق رکھتے ہیں۔۔"

اور اسی ذوق کی وجہ سے وہ سمجھنے میں احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ اسی احتیاط اور پرہیزگاری کے سبب وہ اللہ اور اُس کے کاموں کو۔۔۔ خود اپنے اور شیطان کے کئے جانے والے کاموں کے مقابلے میں الگ سے پہچاننے اور جانتے ہیں۔۔ کسی نے دھیرے سے اُس کے کان میں سرگوشی کی۔

حیاتِ جاوداں کی تلاش

پوری دنیا کو فتح کرنے کا خواب دیکھنے والا ایک بادشاہ، اپنے اس خواب کو تعبیر دینے، جب مقدونیہ (یونان) سے چل فتوحات کا پھریرا لہراتا، اسکندریہ (مصر) تک پہنچ گیا اور وہاں کی حسین ملکہ قلوپطرہ کے دام زلف گرہ کا اسیر ہو گیا۔ ایک روز جب فتح کا جشن منانے کے لئے برپا کی گئی محفل ناؤنوش اور رنگ و بو کے دوران، اُس کو یہ اطلاع دی گئی کہ مقدونیہ کی پارلیمنٹ کے اراکین، اُس کی سرگرمیوں اور فتوحات کے دراز ہوتے ہوئے سارے سلسلے سے بیزار ہو کر اُس کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو رہے ہیں، تو وہ جھنجھلا کر رہ گیا۔ رات ڈھلے تک وہ جاگتا رہا اور سوچتا رہا کہ اُس کی یہ تمام فتوحات، کوشش اور سعی اور کامیابیاں آخر کس کام کی؟

سوچوں کے اس گرداب میں چکراتے ہوئے اُس کو ایک عجیب سی بات سوجھی۔ اگر کسی طرح وہ اپنی سلطنت کو دوام اور جاودانی دینے کا اہتمام کر لے تو سارا مسئلہ ہی حل ہو جائے گا۔ اس خواہش پہ غور کرتے ہوئے اُس نے سوچا کہ اگر سلطنت رہی اور وہ خود نہ رہا تو سلطنت کا دوام اُس کے کس کام کا؟ یہ سوچ کر وہ اس خواہش کو ترک کرنے کو ہی تھا کہ اچانک اُس کو خیال آیا کہ آخر وہ اتنا مقتدر العان فاتح اور بادشاہ ہے تو وہ خود اپنی زندگی کو جاوداں بنانے کی کوشش کیوں نہ کرے۔۔ اگر خود اس کی اپنی زندگی کو دوام اور ہمیشگی حاصل ہو جائے تو اور موت کا خوف نہ رہے تو کبھی نہ کبھی تو پوری دنیا پہ غالب ہونے کا اس کا خواب شرمندہ تعبیر ہو ہی جائے۔ یہ بات اُس کے ذہن میں آئی اور جڑ پکڑ گئی۔

اس خواہش کو پورا کرنے اور اس کی تکمیل کے راستے سوچے جانے لگے۔ مشورے شروع ہوئے۔ بادشاہ کی خواہش اُس کے مشیروں اور وزیروں کے لئے حکم کا درجہ اختیار کر گئی۔ اُن میں سے ایک نے تجویز کیا کہ اگر کسی طور آبِ حیات میسر آجائے تو بادشاہ کی خواہش حیاتِ جاوداں اور سلطنت کے دوام۔۔ دونوں ہی باتوں کی تکمیل ہو سکے گی۔ بادشاہ کو یہ بات بہت ہی صائب لگی۔ شاہی فرمان جاری ہوئے۔ آبِ حیات لانے یا اس کا پتہ بتانے والے کے لئے منہ مانگا انعام دیئے جانے کا سلطانی وعدہ مشتہر کیا گیا۔ سلطنت اور مفتوحہ علاقوں کے طول و عرض میں ہر کارے دوڑنے لگے ہر اس اطلاع پر کاروائی کو یقینی بنانے کا اہتمام ہوا، جس سے آبِ حیات کے حصول کی کوئی راہ نکل سکتی تھی۔

کئی لوگوں نے اسے دیوانگی قرار دیا اور کچھ نے اسے راج ہٹ کا کرشمہ گردانا۔ ہر طرح کی چہ مگویوں کے باوجود کوششیں جاری رہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ اگر کسی کو آبِ حیات مل بھی گیا تو کیا ضروری ہے کہ وہ اُسے بادشاہ کو پیش بھی کر دے گا۔ وہ اسے پی کر خود کیوں نہ امر ہونا چاہے گا۔

جعلسازوں اوٹھگوں نے منصوبے باندھنے شروع کر دیئے کہ کسی طور بادشاہ سے آبِ حیات کی خبر دینے کے نام پر انعام واکرام وصول کیا جائے۔ بہت سے لوگوں نے ایسی کوششیں کیں بھی لیکن بادشاہ اور اُس کے درباری ایسے جھانسوں سے بچنا خوب جانتے تھے۔ انہوں نے اطلاع کے غلط ہونے کی صورت میں عبرت ناک سزا کا بھی اعلان کر دیا تھا۔

ایک روز جب بادشاہ نے دربار کیا تو اُس کو بتایا گیا کہ ایک آدمی اذنِ باریابی چاہتا ہے اور یہ کہ اُس کا کہنا ہے کہ وہ آبِ حیات کی بابت جانتا ہے۔ اذنِ شاہی سے اُس شخص کو دربار میں لایا گیا۔

ایک نورانی صورت، ادھیڑ عمر، ایک معزز بزرگ کو اپنے سامنے دیکھ کر، بادشاہ نے اُس کی خوب آؤ بھگت کی۔ اُن کو اپنے پہلو میں رکھی نشست پر بٹھایا۔ اُس بزرگ نے اپنا نام خضرؑ بتایا اور کہا کہ وہ آبِ حیات کا پتہ جانتے ہیں۔ راستہ چونکہ از حد دشوار گزار اور کٹھن ہے اس لئے وہ اکیلے اس مہم کی تاب اور سکت نہیں رکھتے اور دوسرے یہ کہ چشمہ حیات کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اُس کا پانی وہیں موقعے پر جا کر پینا ہی فائدہ دیتا ہے۔ اُس کو وہاں سے کہیں دور لے جانے پر اُس کی وہ جاودانی عطا کرنے والی تاثیر باقی نہیں رہتی۔ دوسرے یہ کہ اُس مقام تک بادشاہ کو اکیلے ہی جانا ہوگا۔ ورنہ ہر کوئی اس کا پانی پی کر امر ہونا چاہے گا۔ ہاں البتہ وہ بادشاہ کی وہاں تک راہنمائی کے لئے اُس کے ہمراہ جانے پر آمادہ ہے۔

اُس بزرگ کی شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی کہ بادشاہ کو اُس کی ہر بات قابلِ قبول لگی۔ اُس نے اپنے چند خاص مصاحب ہمراہ لئے۔ جوان اور توانا گھوڑوں پر سوار یہ مختصر قافلہ اُس بزرگ کی راہنمائی میں اپنے سفر پر روانہ ہوا۔ سفر کا آغاز خوشگوار تھا۔ بادشاہ آنکھوں میں ابدی زندگی کے سپنے لئے، اُس بزرگ کی حکمت و دانائی سے بھرپور باتیں سنتا نحوِ سفر رہا۔ کئی روز و شب کے سفر کے بعد وہ ایک عجیب و غریب پہاڑی سلسلے تک جا پہنچے۔

پہاڑوں کی سختی اور سنگلاخی ہیبت و جلال بن کر ان کے دلوں کو دہلا رہی تھی۔ اُس سلسلہ کوہ میں وہ بزرگ انہیں پر پیچ گھاٹیوں کی اُترائیوں اور چڑھائیوں پر لئے بڑھتے ہی رہے۔ بالآخر وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں بادشاہ نے اس بزرگ رہبر کے کہنے پر اپنے مصاحبین، خدمتگاروں اور سواری کے جانوروں کو وہیں پڑاؤ پہ چھوڑا اور خود اُس بزرگ رہبر کے ہمراہ پاپیادہ آبِ حیات پانے کی آس دل میں لئے آگے بڑھتا چلا گیا۔

بادشاہ دل ہی دل میں اُس بزرگ کی توانائی، حوصلے اور اعلیٰ ظرفی کو سراہتا ان کے ہمراہ چلتا رہا۔ جب چلتے چلتے وہ تھک جاتے تو کچھ دیر کے لئے سستا لیتے اور پھر آگے بڑھ جاتے، ایک دو بار بادشاہ نے اپنے رہنما سے پوچھا بھی کہ ابھی مزید کتنا سفر طے ہونا باقی ہے۔ جواب ملا ہم اپنی منزل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ اب جلد ہی اسے پا بھی لیں گے۔ اونچے نیچے راستوں پر چلتے چلتے بادشاہ تھک تو بہت گیا تھا لیکن ابدی اور لافانی زندگی کا لالچ اس کو تھکن کا احساس نہیں ہونے دے رہا تھا۔

بالآخر وہ بزرگ راہبر اُس بادشاہ کو لے کر ایک غار میں داخل ہوگئے۔ غار بہت تاریک اور ناہموار تھا۔ وہ دیر تک اس ہولناک غار میں محوِ سفر رہے۔ غار کے سفر میں چند ایک جگہ انہیں ویرانوں میں رہنے والی مخلوق نے ستایا بھی لیکن اُس راہبر کی حوصلہ مندی اور بادشاہ کی بہادری کے باعث معاملہ ان کے قابو سے باہر نہیں ہوا۔

اس غار کے خوفناک سفر کا اختتام ایک کھلی سر سبز و شاداب وادی میں ہوا۔ وادی حسن و دلفریبی کا ایک جاذبِ نظر شاہکار تھی۔ اُس گل رنگ وادی میں ہر طرف ہریالی کے ساتھ ساتھ فضا میں ایک دلفریب مہک رچی ہوئی تھی۔ ہوا پھولوں کی خوشبو سے عطر بیز ہونے کے باعث فرحت اور تازگی سے بھری ہوئی محسوس ہوئی۔ غار کی گھٹن سے باہر آکر، اُجنت نظیر وادی میں قدم رکھتے ہی بادشاہ کو یوں لگا گویا اس کا سارا وزن ختم ہو گیا ہو۔ وہ خود کو ایک دم ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ فرحت اور تازگی اُس کو اپنے اندر اترتی اور توانائی اس کو سیراب کرتی محسوس ہوئی۔

وہ عالی مقام بزرگ اس فاتح اعظم کو اس غار کے دھانے سے کچھ دور واقع ایک کھوہ میں لے کر اتر گئے بظاہر وہاں اس کھوہ کی موجودگی کا کوئی نام و نشاں نہ تھا۔ فطرت نے کچھ اس انداز سے اُس کھوہ کی حفاظت کا انتظام کیا ہوا تھا کہ وہاں اس کے ہونے سے صرف وہی باخبر ہو سکتا تھا، جس کو فطرت نے خود اس راز میں شریک کیا ہو۔

اُس کھوہ کے اندر ایک پتھر سے پانی رس رہا تھا۔ وہ پانی رستے رستے قطرہ بنتا اور نیچے گڑے ایک برے سے پتھر پر گرتا۔ نہ جانے یہ عمل وہاں کتنی صدیوں سے جاری تھا۔ اس قطرہ قطرہ ٹپکتے پانی سے اس برے پتھر میں ایک پیالہ بھر جگہ بن گئی تھی۔ جب رستے پانی کا قطرہ اس جگہ گرتا تو اتنا ہی پانی اس لبالب بھری جگہ سے باہر چھلک کر زمین میں جذب ہو جاتا۔ وہ بزرگ وہاں زمین پر بیٹھ گئے اور بادشاہ کو اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بادشاہ خاموش بیٹھا اس بات کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ دیکھیں اب کیا ہوگا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس بزرگ نے بادشاہ کو مخاطب ہو کر بتایا کہ یہ پانی جو وہ دیکھ رہا ہے، آبِ حیات ہے۔

''یہ ہے آبِ حیات؟'' بادشاہ نے بے یقینی سے پوچھا۔

''جی ہاں ! لیکن اس پانی کو پینے سے پہلے آپ ایک مرتبہ اور اچھی طرح سوچ لیں کہ آپ کو یہ پانی پینا بھی چاہیے یا نہیں ؟''

اس کے بعد اس محترم بزرگ نے بادشاہ کو جو کچھ کہا اس کے بارے میں مختلف روایات ہین ۔ ایک روایت ہے کہ خضر نے اس بادشاہ کو قیدِ حیات اور بندِ غم کے اصل میں ایک ہی ہونے کی بات تعلیم کر کے بادشاہ کو ڈرا دیا کہ موت سے پہلے تمہیں غم سے نجات نہیں مل سکے گی اور یہ پانی تمہیں موت سے ہمیشہ کے لئے دور تو لے جائے گا لیکن تم ہمیشہ گرفتارِ غم ہی رہو گے ۔

ایک دوسری روایت کے مطابق اس بزرگ نے وہ پانی خود تو پی لیا لیکن بادشاہ کو نہ پینے دیا ۔ اس پر ایک شاعر نے کہا

؎ کیا کیا خضر نے سکندر سے اب کسے راہنما کرے کوئی

ایک اور روایت کے مطابق خضر نے بادشاہ سے صرف اتنا ہی دریافت کیا تھا کہ یہ پانی پینے کے بعد وہ خود تو امر ہو جائے گا لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے اقتدار میں قائم بھی رہ سکے گا۔ بادشاہ اس بات کی کوئی ضمانت بھلا کیسے دے سکتا تھا؟ وہ جانتا تھا کہ یہ ہمیشگی کی زندگی اگر حاصل ہوئی بھی تو وہ اُس کو حاصل ہو گی اس کی سلطنت کو نہیں۔

روایات جو بھی ہوں یہ بات البتہ طے ہے کہ بادشاہ نے وہ پانی نہیں پیا، وہ آبِ حیات سے محروم ہی رہا۔ اب اس کی وجہ کچھ بھی رہی ہو کیونکہ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ بادشاہ قبلِ مسیح عالمِ جوانی میں ہی انتقال کر گیا تھا۔

شعور نے جب یہ کہانی سنی تو حیرت کا مرقع بن گیا۔ استعجاب نے کئی سوالیہ نشانوں کو اس کے سامنے لا کھڑا کیا۔ سوچ کا ایک سلسلہ آغاز ہو کر دراز ہوتا چلا گیا۔ کڑی در کڑی خیال بنتے رہے۔ غور و فکر نے کئی نہاں خانوں پر دستک دی۔ اس کہانی کے حوالے سے شاخ در شاخ سوالوں کے شگوفے پھوٹتے چلے گئے۔

یہ ہمیشگی اور حیاتِ جاودانی اور لافانی کا بہکاوا دے کر ہی تو شیطان نے آدم کو شجر ممنوعہ کے قریب دھکیلا تھا۔ آدم اسی ہمیشگی اور دوام کی طلب میں تو جنت جیسی جگہ سے نکلنے پر مجبور ہوئے تھے۔ کیا جنت میں انہیں یہ ہمیشگی کی زندگی حاصل نہ تھی؟ لیکن اس سے بھی بنیادی بات تو یہ ٹھہری کہ آخر یہ زندگی ہے کیا؟ جب تک یہ گتھی حل نہ ہو گی ،اس کے فانی ہونے یا لافانی ہونے کی بات طے کرنا ناممکن ہی رہے گا۔

ہر شخص اس وہ جواب دیتا ہے جو کسی اور کا نہیں ہوتا کیونکہ کوئی بھی حقیقت کا علم نہیں رکھتا۔ ورنہ حقیقت تو ایک ہی ہوتی ہے۔ لاکھوں یا ہزاروں نہیں۔ سائنسدانوں، علماء اور ماہرین حیاتیات کا ایک ہی فیصلہ ہے اور اس بات پر سب متفق ہیں کہ زندگی کی کوئی ایک تعریف احاطہ، بیان سے باہر ہے۔ انہوں نے محض کچھ اشیاء کو بے جان اور کچھ کو جاندار قرار دیتے ہوئے، ہر دو کا آپس میں موازنہ کر کے زندگی کی چند خصوصیات کا نام ہی زندگی رکھ دیا ہے۔

ماہرین اور فلاسفر کے تمام مباحث میں جو قدر مشترک نکلتی ہے، وہ یہ ہے کہ زندگی دراصل حرکت کا دوسرا نام ہے۔ لیکن اگر کوئی شرارت سے اپنی گھڑی، گاڑیا سائیکل کی بابت کہہ دے کہ وہ بھی تو حرکت کرتی ہیں تو کیا ہم انہیں بھی زندہ قرار دے لیں تو وہ برا مان جاتے ہیں اور اگر کہیں ان کی توجہ الیکٹران کی اپنے مرکز کے گرد حرکت، زمین کی اپنے محور یا مدار کی حرکت کی طرف مبذول کروا کر پوچھیں کہ کیا یہ سب بھی جاندار ہیں، تو وہ اس بات کا جواب اثبات میں دینے کے بجائے کہتے ہیں۔ 'نہیں یہ سب محض حرکت ہیں، زندگی نہیں۔''

ویسے واقعی یہ ایک عجیب حرکت ہے ، کہ ایک حرکت تو زندگی ہے لیکن دوسری حرکت زندگی کے ذیل میں نہیں آتی یعنی زندگی تو حرکت ہوئی۔ لیکن حرکت زندگی نہیں ہے۔ شعور کو اس گورکھ دھندے نے الجھا کر رکھ دیا۔ تو وہ لاشعور کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لاشعور نے شعور کی الجھن رفع کرتے ہوئے اس کو بتایا۔

'بھئی یہ گورکھ دھندہ اس لئے محسوس ہوتا ہے کہ حقیقت کی خبر نہیں۔ حقیقت شناس لوگ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ زندگی سوائے اس کے اور کچھ بھی نہیں کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کا چاہنا ہے یعنی جب تک اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں ایک جاندار زندہ بھی رہتا ہے اور حرکت بھی کرتا ہے۔ زندگی کے تقاضے ہمارے اندر تب ہی متحرک ہوتے ہیں ، جب اللہ انہیں کسی جاندار میں متحرک کرتا ہے۔ زندگی کا وجود اللہ تعالیٰ کی صفات کا مرہونِ منت ہے۔ اللہ کی صفات سے ہی تو زندگی کو قیام ہے اور اللہ کی مشیت یعنی اللہ کا چاہنا، زندگی کو چلانے کی پالیسی ہے۔ اللہ تعالیٰ زندگی کو اس کے قیام کے دوران کیا رنگ دیتے ہیں ، یہ امر اللہ کی مرضی یا مشیت کہلاتا ہے۔ خود کو اللہ کے ساتھ وابستہ کر دینا ہی عرفان ہے۔ خود کو اللہ کے سپرد کر دینا ہی روحانیت ہے۔ خود کو اللہ کی مرضی پر چھوڑ دینا ہی نفیِ ذات ہے۔ نفی ذات کا مفہوم اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ بندہ اپنی مرضی کو چھوڑ دے اور اللہ کی مرضی یا مشیت کو سمجھے۔ 'بحبل اللہ جمیعاً' کا ایک مفہوم اللہ کی مرضی بھی ہے یعنی آپ اللہ کی مرضی کو خود پر مضبوطی سے لاگو کر لیں اور اس بارے میں دورائے ہر گز نہیں ہونی چاہئیں۔

شعور کو یہ بات بالکل نئی لگی۔ اس سے پہلے شعور نے ایسی کوئی بات کہاں سنی تھی۔ اس نے حالتِ استعجاب سے باہر لائے جانے پر اپنے لاشعور کی طرف ممنونیت اور احسان مندی کے احساس کے ساتھ توجہ جاری رکھی اور سوچا کہ زندگی کا مفہوم تو سمجھ میں آگیا۔ اب اگر یہ بھی طے ہو جائے کہ زندگی کا مقصد کیا ہے یعنی اگر اللہ کا چاہنا ہی زندگی

ہوا تو اللہ کے چاہنے کا مقصد کیا ہے؟ اللہ نے یہ کیوں چاہا کہ ہم زندہ ہوں۔ زندہ رہیں۔ آخر اللہ تعالیٰ ہمیں زندہ رکھ کر ہم سے کس مقصد کی تکمیل کے خواہاں ہیں؟ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم اللہ کے کسی مقصد کی تکمیل کر لیں گے کیونکہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ کسی مقصد کو حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہو اور وہ پورا نہ ہو تو پھر اس زندگی کو عطا کرنے کا مقصد کیا ہے؟''

لاشعور نے شعور کے اس سوال پر اظہار پسندیدگی کو اُسے ایک دلپذیر مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ اس سوال پر بہت ہی کم لوگ غور کرتے ہیں۔ اگر مقصدِ حیات واضح ہو جائے تو سارا مسئلہ ہی نہ سلجھ جائے۔ اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اللہ نے جن واِنس دونوں کو صرف اور صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے یعنی ان کی زندگی کا اصل مقصد عبودیت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ قرآن کی وہ آیت جس میں یہ ارشاد ہوا ہے۔وَمَا خَلَقْتَ الْجِنِ وَا لاِنْسِ الا لَیْعَبِدُوْنِ وہاں مَا اور اِلا پہ غور کر کے دیکھنا چاہیے۔ ان دونوں تراکیبِ الفاظ 'نہیں پیدا کیا' اور سوائے اس کے کہ یہ دونوں مصروف عبودیت رہیں' کی بجائے جو مفہوم رائج ہوا وہ یہ ہے کہ سوائے عبادت کرنے کے انہیں کسی اور کام کے لئے پیدا نہیں کیا گیا ہے۔ اب اگر یہ بات مان لی جائے تو پھر ہمارا سونا، جاگنا، کھانا، پینا، شادی بیاہ کرنا، اولاد پیدا کرنا اور اس کی پرورش کرنا، یہ سب کیا ہے؟ اگر ہمیں نہیں پیدا کیا سوائے اس کے کہ ہم اس کی عبادت کریں تو پھر ان افعال اور اعمال کی بابت کیا حکم بنتا ہے جن کے بغیر تسلسلِ حیات برقرار نہیں رہ سکتا؟ اب اگر عبودیت کا مفہوم رسومِ عبادت ہی لیا جائے تو نتیجہ ظاہر ہے کہ الجھاؤ ہی تو پیدا ہو گا۔

شعور نے اپنی فکر پہ اک چوٹ سی پڑتی محسوس کی۔ اس معروف آیتِ قرآنی کے اصل مفہوم سے لاعلمی کے احساس پر جہاں ایک طرف اس نے ندامت محسوس کی وہاں اپنی سوچ کی اصلاح پر، تفکر میں گہرائی پیدا ہونے پر وہ جھوم کر ہی تو رہ گیا۔

لاشعور نے افکار تازہ کی ایک مزید لہر شعور کے ادراک میں داخل کی۔ 'اس مقصدِ حیات کے حوالے سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسان کو خلافتِ الٰہیہ عطا کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں بھی استدلال قرآن ہی کی ایک آیت سے کیا جاتا ہے لیکن کتنے لوگ ہیں جو واقعتاً اس منصب جلیلہ کے اہل ہیں اور اس پر فائز بھی ہیں۔ اب کیا یہ ایک خود تردیدی صورت حال نہیں بن جاتی کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ ایک پوری نوع اپنی خلافت کے لیے پیدا فرمائے، اس کو زندگی عطا کرے، اس زندگی کو قیام دینے کے لیے وسائل فراہم کرے اور اس پوری نوع کی حالت یہ ہو کہ ڈھونڈنے پر ایک شخص بھی ایسا نہ ملے جو خلافت الٰہیہ کا اقرار کرنے پر قادر ہو۔ کیا یہ ایک طرح سے گستاخی اور حکم عدولی نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک کام کرنا چاہتے ہیں اور وہ کام ہے کہ ہو کر نہیں دے رہا۔ 'اِنّی جَاعِلٌ' (میں چاہتا ہوں) یعنی اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ وہ ایک کام کریں اور اس کام کی یہ مجال ہو کہ وہ کام ہو کے نہ دے۔ درحقیقت عبودیت کی طرح ہم نے خلافت الٰہیہ کا مفہوم بھی اپنی سہولت کے مطابق ہی اخذ کیا ہوا ہے۔ اصل مفہوم کی تو ہمیں ہوا تک نہیں لگی۔ ان دونوں اصطلاحاتِ قرآنی کا اصل مفہوم کیا ہے اور ان دونوں کا آپس میں کیا ربط اور تعلق ہے؟ اس پر بہت احتیاط سے غور و فکر ہونا چاہیے۔؛

ندرتِ فکر اور تازگی افکار کے اس جھونکے نے شعور کے وجدان میں ایک بالیدگی اور انشراح کی کیفیت بھر دی۔ اس نے آگہی کو حاضر اور اپنی توجہ کو لاشعور کی طرف قائم رکھتے ہوئے کچھ اور جاننے کی طلب کو مدھم ہونے سے بچانے کی جستجو کو جاری رکھا تو لاشعور نے بات کی مزید وضاحت کی۔

'اس بارے میں ایک اور بات جو بہت توجہ طلب ہے۔۔۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود کہا ہے۔ ''میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے مخلوق کو محبت کے ساتھ تخلیق کیا تاکہ میں پہچانا جاؤں''۔۔یعنی مخلوق میرا عرفان حاصل کرے۔ اس کا مفہوم اس کے علاوہ اور کیا ہوا کہ انسان کو زندگی اللہ کی پہچان اور اُس کا عرفان حاصل کرنے کے لیے دی گئی ہے۔ جب یہ بات طے ہوگئی تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمیں واقعی یہ بات معلوم ہے کہ عرفان کیا ہوتا ہے؟ اس کے حصول کا عملی طریقہ کیا ہے؟ کیا ہم اس کے لیے حقیقتاً کوئی کوشش بھی کر رہے ہیں یا ہماری تمام تر سعی اور کاوش زبانی جمع خرچ ہی کی حد تک رہتی ہے؟ کیا ہم واقعی اللہ کے راستے پر ہیں بھی یا یہ بھی محض ایک دعویٰ ہی ہے؟

لاشعور کے ان پے در پے سوالوں نے شعور کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے اندر بہت سے دروازے اور کھڑکیاں یکے بعد دیگرے، ایک ایک کر کے کھلتے چلے جا رہے ہیں اور ہر دروازے سے باہر نکلنے والا راستہ شاہراہِ تفکر سے جا کر مل رہا ہے۔ اُس نے ایک عالم بے خودی میں صرف اتنی بات محسوس کی کہ اس بے جہت اور بے کنار سفر کی خود میں ہمت نہیں پا رہا۔ اُس نے بات کو اپنے دامن آگہی میں سمیٹنے کے لئے، بات کو اپنی گرہ میں باندھنے کے لئے لاشعور سے کہا۔' یہ بات تو سمجھ آگئی کہ زندگی کا مقصد عرفان، خلافت اور عبودیت ہیں اور

اللہ نے زندگی اسی لیے دی ہے لیکن ان تینو ں باتوں کا باہمی ربط اور تعلق کیا ہے؟ اور ہم ان کے حصول کے لئے عملی طور پر کیا کر سکتے ہیں؟ یا یہ کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

شعور کو راہ پہ آتے دیکھ کر لاشعور میں مسکراہٹ کا ایک جھونکا سا لہرایا اور اُس نے تبسم ریز لہجے میں کہا۔

'عبودیت ، نیابت اور عرفان الٰہی کا باہمی ربط اور تعلق تو آپ کو خود تلاش کرنا ہے۔ رہی بات عملی طور پر کچھ کرنے کی تو اس ضمن میں یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے کہ انسان اللہ سے اپنی قربت کے احساس کو اپنے اندر اجاگر کر لے۔ عبادت یا عبودیت ہو، نیابت یا خلافت ہو یا عرفان اور پہچان ہو، یہ تبھی ممکن ہو سکتے ہیں کہ انسان کے اندر اللہ کی موجودگی کا احساس ہمہ وقت موجزن ہو۔

جب یہ احساس زندہ اور متحرک ہو جاتا ہے کہ انسان اللہ کے سامنے حاضر ہے تو اس کے اندر وہ نظر کام کرنے لگتی ہے جو غیب میں دیکھتی ہے اور جب وہ نظر کام کرنے لگتی ہے تو انسان اپنی زندگی کے اُس مقصد سے واقف اور آشنا ہو جاتا ہے جس کے لیے اللہ نے اس کو وجود بخشا، اُس کو عدم سے وجود میں لایا ہے، اُس کو زندگی اور اُس کے قیام کے وسائل فراہم کئے ہیں۔ یہ آگاہی اور واقفیت اُس کو اپنے مقصدِ حیات کی طرف کشاں کشاں گامزن رکھتی ہے ورنہ انسان بھٹک تو رہا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر اس احساس کو فزوں تر کرنے کے لئے ہی تو یہ بات فرمائی کہ میں تو تمہاری رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہوں۔ اب جو ذات ہماری رگِ جاں سے بھی زیادہ قرب ہو، اس کی موجودگی سے بے خبری میں کس کا دوش ہوا؟ اس بے خبری کا خاتمہ کرنے کے لئے انسان کو جو اہتمام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ وہ صرف اس ذات کی طرف متوجہ ہو جائے اور نہ صرف یہ کہ متوجہ ہو جائے بلکہ مستقلاً، لگاتار اور ہمہ متوجہ رہے۔

شعور نے جب یہ سب اچھی طرح سے سمجھ لیا تو اس نے تائید میں سوچا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے یہ بھی تو ارشاد فرمایا ہے اور میں تو تمہارے اندر ہوں، تو تم دیکھتے کیوں نہیں؟ بے شک دیکھنے کے لیے متوجہ ہی تو ہونا ہے۔ بات کا لطف لیتے ہوئے شعور نے کروٹ لی اور سوچا کہ وہ ابدیت اور جاودانی کی بات بھی سمجھ لینی چاہیے۔ اس نے لاشعور سے کہا' حضرت خضرؑ نے بادشاہ کو چشمہ حیواں تک لے جا کر اُس کو آبِ حیات پینے کیوں نہیں دیا تھا؟

لاشعور نے شعور کو بتایا کہ خضر نے انتہائی دل نشین انداز اور موثر پیرائے میں بادشاہ پر یہ واضح کر دیا تھا کہ ہمیشگی کا حامل ہونا، جاودانی اور لافانی ہونا صرف اس ذاتِ کبریا کو زیب دیتا ہے جو خالق اور لا احتیاج ہے۔ کیونکہ اس صفت اور صلاحیت کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ لا احتیاج ہونا لازم آتا ہے۔ مخلوق ہوتے ہوئے احتیاجات اور محتاجی سے چھٹکارا ممکن ہی نہیں لہذا مخلوق اور محتاج ہونے کے ناطے ایسی خواہش کرنا ایک شیطانی عمل سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ وہ بادشاہ اب اتنا بودا اور عقل سے عاری بھی نہ تھا کہ خدا بننے کے چکر میں پڑ کر مارا جاتا۔ اُس کو یہ بات سمجھ آگئی تھی کہ ایسے پانی کا کوئی وجود ہو ہی نہیں سکتا جو انسان کو خود اس کا اپنا خالق بنا دے۔ اس نے اپنے راہبر سے صرف اتنا ضرور پوچھا کہ وہ اس کو وہاں تک کیوں لایا تھا۔ جب کہ یہ بات وہ اُس کو وہاں اُس کے محل میں بھی تو بتا سکتا تھا۔ اس پر بزرگ نے اُس فاتح اعظم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ ''کیا یہ بات آپ کو وہاں اپنے تخت پر بیٹھ کر سمجھ آسکتی تھی؟'' بادشاہ کا سر نفی میں ہلا اور اس نے آنکھیں جھکا دیں۔

کچھ ساعت توقف کے بعد جب اُس نے نظر اٹھا کر اپنے راہبر کی طرف دیکھنا چاہا تو وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ بادشاہ یکہ و تنہا اس سنگی پیالے کے پانی کے پاس کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر دھیرے سے مسکرایا اور اُس نے وہ پانی پیا اور وہاں سے اُٹھ کر اپنے مصاحبوں کی طرف چل دیا۔

میری ناتواں ہستی

وہ ایک متوسط مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اُس کا باپ ایک سرکاری ملازم تھا۔ اس لئے اُس کا تبادلہ کبھی اس شہر اور کبھی اس شہر ہوتا رہتا تھا۔

اُس کی ماں کوئی بہت زیادہ مذہبی عورت نہ تھی لیکن عید، میلاد، شبِ برات اور محرم کے ختم اور نذر نیاز پابندی سے کیا کرتی۔ گھر میں کوئی پریشانی ہو جاتی، شوہر کا بے وقت تبادلہ ہو جاتا یا وہ اپنے افسروں سے لڑنے کے نتیجے میں معتوب ہو جاتا تو وہ اپنے شوہر سے چوری چھپے صدقہ خیرات بھی کر دیا کرتی۔ رمضان کے روزوں کا پورا اہتمام کرتی لیکن نماز کی کچھ زیادہ پابند نہ تھی۔ اُس کے باپ کو اس بارے میں کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنی دنیا میں مگن رہنے والا بندہ تھا۔ اپنے بیوی بچوں سے اُس کا رویہ بہت حد تک دوستانہ تھا۔ وہ سیر و تفریح کا شائق تھا۔ جب بھی کبھی موقعہ ملتا، وہ اپنی بیوی بچوں کو لے کر کہیں نہ کہیں سیر یا پکنک کا پروگرام بنا لیا کرتا۔

ماں اس بات کا بہت اہتمام کرتی کہ بچے اپنی پڑھائی میں دلچسپی لیں، جھوٹ نہ بولیں، غلط بیانی نہ کریں اور صاف ستھرے رہیں۔ گھر آئے مہمانوں کے سامنے تمیز اور ادب آداب کا خیال رکھیں ورنہ بعد میں بہت کھنچائی کرتی۔

صبح جب اُس کا باپ دفتر چلا جاتا تو ماں پورے گھر کی صفائی کرتی۔ اکثر فرش ضرور دھوتی۔ میلے برتن اور کپڑے دھوتی، بچے سکول سے واپس آتے تو انہیں نہلاتی۔ اگر باپ نے دوپہر کو گھر آنا ہوتا تو دوپہر کا کھانا پک جاتا ورنہ بازار سے روٹی منگوا کر چٹنی یا رات کے بچے ہوئے سالن سے کام چلا کر کھانا پکانے کا وقت بچا کر گھر کے کاموں میں لگی رہتی۔

اگر کبھی کوئی بچہ گھر سے ننگے پاؤں باہر نکل جاتا تو اُس کی شامت آجاتی۔ بری طرح شور کرتی۔ میں صفائی کرتے کرتے ہلکان ہو جاتی ہوں، تم کو اتنا بھی خیال نہیں۔ اگر بچے کپڑے گندے کر کے آتے تو اُن کی ٹھکائی ہونا طے ہوتا۔ اُس کا باپ اور اُن کے رشتے دار وغیرہ اُس کی اس صفائی پسندی کی عادت کے پس پردہ کوئی نفسیاتی وجہ بتاتے لیکن اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اس بات سے بہت خائف رہتی تھی کہیں اُس کے بچے بیمار نہ ہو جائیں۔ اس لئے وہ حفظانِ صحت کے اصولوں کو گھر میں لاگو کرنے کی پوری کوشش کرتی۔

وہ کل چار بہن بھائی تھے اُن میں وہ سب سے بڑا تھا۔ اُس کے اندر اپنے لباس سے ایک عجیب سی بے نیازی تھی۔ وہ کپڑے میلے تو نہیں کرتا تھا لیکن اُس کے کپڑے کچھ ہی دیر بعد ڈھیلے ڈھالے لگنے لگتے۔ کبھی آستین کے بٹن کھل جاتے، کبھی ایک طرف کا کندھا ڈھلکا ہوا ہوتا، شلوار یا پائجامے کا ایک پائچا اونچا ہوتا تو دوسرا نیچا۔ کبھی دونوں پائچے ٹخنوں سے اوپر اٹھے ہوتے اور کبھی ایڑیوں میں گھسٹ رہے ہوتے۔ پتلون پہنتا تو کبھی آدھی شرٹ اندر تو کبھی سائڈ سے باہر۔ پتلون کی کریز اُس سے چند منٹ بھی قائم نہیں رہ پاتی۔ وہ پتلون بھی یوں پہنتا گویا پاجامہ پہن رکھا ہو۔

اُس کا باپ اُس کے اس انداز پر اس کو براہ راست کچھ کہنے کی بجائے اُس کی ماں کو کہتا۔ ''اس کو تم کپڑوں کی بجائے گدڑی پہنایا کرو۔' اس پر وہ جواب دیتی۔ اُس کو وہ بھی پہنا کر دیکھ لو یہ اُس کا بھی حشر بگاڑ کر نہ رکھ دے تو میرا نام بدل دینا۔' ماں اس کے بالوں میں کنگھی کرتی اور ساتھ میں اُس کو سمجھاتی کہ بال خراب نہیں کرنا۔ لیکن چند ہی لمحوں بعد اُس کے بال بکھرے ہی ملتے۔

اُس کو اپنی پڑھائی کے حوالے سے یہ مشکل رہتی تھی کہ وہ کسی چیز کو رٹا بالکل نہیں لگا سکتا تھا۔ سوائے چند صورتوں اور پہاڑوں کے اُس کو کوئی چیز حفظ یاد نہیں ہو سکی تھی۔ جو بھی چیز یاد کروائی جاتی وہ اُس کو یاد کرتا لیکن جب پوچھا جاتا تو وہ اس مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کرتا اس پر اس کے نمبر کٹ جاتے۔ مطالعہ کرنے میں اس کی رفتار عام لوگوں کی نسبت بہت تیز تھی۔ پڑھائی میں وہ زیادہ بُرا نہ تھا۔ کلاس میں استاد اُس کے سوال پوچھنے کی عادت کے باعث اس کو ذہین مانتے تھے۔ اپنے اساتذہ کے نزدیک وہ ایک موڈّب اور تمیز والا لڑکا تھا۔ اپنے دوستوں اور ساتھیوں میں تہذیب اور شائستگی کا مظاہرہ کرتا۔ اُن سے بھی آپ جناب کہہ کر بات کرتا۔

کلاس میں اُس کو ایک عجیب سی دشواری رہتی۔ اکثر وہ بات سنتے سنتے کہیں کھو سا جاتا۔ استاد کلاس میں کوئی بات سمجھا رہا ہوتا اور وہ اُس کے ہلتے ہوئے ہونٹ دیکھتے دیکھتے خیالوں میں کھو جاتا۔ ایسے میں اگر استاد اُس کو اپنی طرف متوجہ سمجھ کر اس سے کچھ پوچھ لیتا تو گڑبڑا کر رہ جاتا۔

اُس کی ماں کبھی کبھار گھر میں جب فارغ ہوتی تو یا شام ڈھلے تک اُس کا باپ گھر واپس نہ آتا تو وہ اُن کو کوئی نہ کوئی قصہ یا کہانی سنانے بیٹھ جاتی۔ کبھی کسی بادشاہ کی کہانی، کبھی چاند شہزادی کا قصہ، کبھی اپنے بچپن کا کوئی واقعہ یا کبھی اُن کے نانا کے حوالے سے کوئی بات سناتی۔ ایسے موقعوں پر اُسے یوں لگتا گویا وہ اُن تمام واقعات کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھ رہا ہو۔ حالانکہ وہ ادھ کھلی آنکھوں سے اپنی ماں کے چہرے کو تک رہا ہوتا۔

ماں جب کوئی قصہ یا کہانی سناتی تو وہ اُس کہانی کے کرداروں کو زندہ اور متحرک محسوس کرتا۔ بعد میں جب وہ اسکول کالج کے دور میں داخل ہوا تو اُس کو مطالعہ کا چسکا پڑ گیا۔ وہ جب بھی کوئی کتاب پڑھتا تو اتنا محو ہو جاتا کہ اُس کو اپنے ارد گرد کا کوئی ہوش ہی نہ رہتا۔ اُس کو غیر نصابی کتب کا جتنا زیادہ شوق تھا نصابی کتب سے اس کی اتنی ہی جان جاتی

تھی۔ وہ نئی جماعت کی کتابیں لاتا اُن کو چند ایک روز میں پڑھ لیتا۔ اُس کے بعد جب بھی اُس کتاب کو دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ یہ تو اُس نے پڑھی ہوئی ہے اور وہ اُس میں دلچسپی نہ لے پاتا۔ کتابوں کے مطالعہ کا شوق اتنا بڑھا کہ اُس کی ماں اس کی بابت اکثر یہ کہتی۔ ''اس کو بے شک کھانے کو نہ دو چند کتابیں دے دو۔''

اس ماحول میں وہ لڑکپن سے نوجوانی کی حدود میں داخل ہو گیا۔ اُس نے میٹرک کر لیا تو اُن دنوں اس کا باپ ایک قصبے میں تعینات تھا۔ اُس کو اسی قصبے کے کالج میں داخل کر دیا گیا۔ کالج تک پہنچتے پہنچتے اپنی ماں سے اُس کا ربط و تعلق قدرے بے تکلفی کا ہو گیا۔ بلکہ کبھی کبھار وہ دوستانہ انداز میں چھوٹی موٹی باتوں پر اُس سے راز و نیاز بھی کر لیا کرتی۔ اس سے وہ شہہ پا کر کبھی کبھی شوخی پر اتر آتا اور چہکتا رہتا۔

ایک روز قصبے کے اکلوتے بازار میں اُس کو ایک بزرگ نظر آئے۔ اُن کی شخصیت میں کوئی ایسے بات تھی کہ اُس نے خود کو اُن کی طرف کھنچتا ہوا محسوس کیا۔ اُس نے پاس جا کر اُن کو سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دیا۔ بڑی شفقت سے اُس کا حال چال پوچھا۔ یہ دریافت کیا کہ وہ کس کا بیٹا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کہاں پڑھتا ہے؟ پڑھائی میں کیسا ہے؟ اُس کو ان سے باتیں کر کے اچھا لگ رہا تھا۔ اُن کے انداز میں کچھ ایسی اپنائیت سی تھی کہ وہ خود کو کچھ اہم سا محسوس کر رہا تھا۔

یوں بھی اُس کو اپنے سے بڑی کے لوگوں سے بات کرنا اچھا لگتا تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس سے اُس کو اُن کے تجربات اور علم سے کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔ وہ اُن سے سوال پوچھتا۔ ایسے جن سوالوں کے جواب اُس کے ماں باپ یا استاد دینے سے گریز کرتے تھے یا وہ اُس سوالوں کو اُن سے دریافت کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ وہ بڑے بوڑھوں کی

محفل میں بیٹھ کر جو کچھ سنتا ، اُن کو اپنے ہم عمر دوستوں کے سامنے بڑھا چڑھا کر بیان کرتا۔ اُن پہ اپنی قابلیت کا سکہ جمانے کی کوشش کرتا۔

اُس بزرگ نے اُس کو اپنا نام عبد اللہ بتایا۔ وہ مستری کا کام کیا کرتے تھے۔ اُن کے کالج کے سامنے کھیتوں کے بیچ اُن کا ایک ٹیوب ویل تھا۔ اُن کی عمر اسی سال کی ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود اُن کی صحت قابلِ رشک تھی۔ وہیں بازار میں کھڑے کھڑے انہوں نے اُسکو کتنی ہی کارآمد باتیں بتائیں وہ کافی دیر تک اُن کے ساتھ کھڑا باتیں کرتا رہا۔

چند روز بعد کالج میں اوپر تلے چند پریڈ خالی تھے۔ اُس نے اُس روز کالج لائبریری سے چند کتابیں اپنے نام جاری کروالیں اور انہیں لے کر کسی گوشہ عافیت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ کالج کے سامنے کھیتوں میں پرال کا ڈھیر، سردیوں کی دھوپ، چند کتابوں کا ساتھ۔۔۔۔ اُس نے نگاہیں اُٹھائیں۔ اس کے سامنے مستری عبد اللہ کھڑے تھے۔ وہ تعظیماً اُٹھ کھڑا ہوا۔ 'کیا ہو رہا ہے؟' انہوں نے مشفقانہ انداز میں اُس سے پوچھا۔

'یہاں بیٹھا یہ کتاب پڑھ رہا تھا'۔ سُن کر انہوں نے اُس سے دریافت کیا۔ 'کیوں کالج میں پڑھائی نہیں ہو رہی؟'؛ وہ انہیں بتانے لگا کہ اُس کے تین پریڈ خالی ہیں اور وہ وہاں یہ کتابیں دیکھنے چلا آیا تھا۔ وہ وہیں اُس کے پاس بیٹھ گئے۔ انہوں نے اُس کی لائی ہوئی کتابیں دیکھیں۔ اُن پر تبصرہ کیا۔ ایک کتاب کی بابت انہوں نے کہا کہ ایسی کتابیں اُس کو نہیں پڑھنی چاہیئں۔ اُس نے اُن سے بحث شروع کر دی کہ ہر طرح کی کتاب پڑھنی چاہیے تاکہ علم حاصل ہو سکے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ ہر کتاب علم نہیں دے سکتی۔ بلکہ بعض کتابیں ذہن کے لیے اتنی ہی مضر ہوتی ہی جس

طرح سڑا ہوا باسی کھانا صحت کے لئے۔ یہ بات اُس کے لیے ایک نئی بات تھی۔ انہوں نے کہا۔' بعض کتابیں گندی نالی کی مانند ہوتی ہیں۔ کیا ایسی نالی کا پانی پیا جا سکتا ہے؟ علم ہی حاصل کرنا ہے تو خود اپنے اندر اتر و!'

کافی دیر اُن کے درمیان اسی پہ بات ہوتی رہی۔ اس اثنا میں انہوں نے ایک اور بات یہ کہی۔' اگر تمہیں علم حاصل کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو علمِ لدّنی سیکھنا۔'

علم لدّنی؟ یہ کیا ہوتا ہے؟ وہ اس علم کو کس کتاب سے سیکھ سکتا ہے؟ اس علم کا اس سے پیشتر اُس نے کبھی کوئی ذکر کیوں نہیں سُنا؟ وہ اُن سے اس علم کی بابت بہت کچھ جاننا چاہتا تھا لیکن وہ اتنا بتا کر بات ٹالتے رہے۔ البتہ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے کہ یہ علم قرآن میں موجود ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اُس کو یہ علم خود ہی سکھا دیتا ہے۔ پھر انہوں نے بات کا رخ بدلنے کو ایک سیلاب کی بابت بتانا شروع کر دیا جس میں کتنے ہی گھر بہہ گئے تھے، کتنے ہی لوگ لاپتہ ہو گئے تھے اور خود انہوں نے کس مشکل سے اپنی جان بچائی تھی۔

جب اُس نے گھنٹی کی آواز سُنی تو اس نے اُن سے اجازت چاہی۔ جب وہ جانے لگا تو انہوں نے اُس کو درود شریف پڑھنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا۔ درود شریف کا اکثر ورد کرنے والے کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔

یوں تو یہ بات اُس نے کئی بار سُنی اور پڑھی۔ فضائل درود اور بگڑے کاموں کا سنورنا اس کے مطالعے سے گزرا ہوا تھا لیکن جس انداز میں اس بزرگ نے اُس کو کہا تو اُس نے خود کو اس بات پر آمادہ پایا کہ وہ درود شریف پڑھا کرے گا۔

اُس نے گھر آ کر اپنی ماں سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ مستری عبد اللہ سے ملنا، اُن سے ہونے والی گفتگو، اُن کا اُس کو علمِ لدّنی سیکھنے کی بات کہنا۔ اُس کو درود شریف پڑھنے کی تاکید کرنا وغیرہ۔ اُس کی ماں نے اتنا ہی کہا۔ ''تُو بھی نہ جانے کیسے کیسے لوگوں سے ملتا رہتا ہے۔''

اس نے ماں سے علمِ لدّنی کی بابت پوچھا۔ ماں نے صاف دلی سے کہا۔ ''مجھے کیا پتہ یہ کیا ہوتا ہے؟'' اس پر اُس نے ماں سے درود شریف پڑھنے کی بابت پوچھا جس پر اُس کی ماں نے کہا یہ بات تو صحیح ہے اس کا واقعی فائدہ ہوتا ہے۔ وہ ماں سے پوچھتا۔۔۔ کیا فائدہ ہوتا ؟ کیسے فائدہ ہوتا ہے؟ ماں نے یہ کہہ کر جان چھڑائی بس کہہ جو دیا فائدہ ہوتا ہے۔ جب فائدہ ہوگا تو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔

وہ اکثر و بیشتر درود شریف پڑھا کرتا۔ کبھی چھوٹ جاتا تو وہ باقاعدگی سے تسبیح لے کر بیٹھ جاتا اور درود کا ورد کیا کرتا۔

اُس کے مطالعے کی حدود قصے، کہانیوں، ناولوں اور افسانوں سے بڑھ کر ادب، فلسفے، منطق اور نفسیات تک پھیل گئیں۔ کبھی کبھار وہ دینی اور مذہبی کتب بھی لے آیا کرتا۔ لائبریریوں کے علاوہ دوستوں اور ملنے جلنے والوں سے بھی کتابیں مانگ لیا کرتا۔ جو کچھ پڑھتا اس پہ حتیٰ المقدور عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی کرتا، یوگا کی کتاب پڑھتا تو اُس میں دی گئی مشقیں آزمانے بیٹھ جاتا۔ حکمت کی کوئی کتاب ہتھے چڑھتی تو گھنٹوں نبض پہ ہاتھ رکھے کلائیاں ٹٹولتا رہا۔ جب کچھ سمجھ نہ آتی تو اُس کو چھوڑ کر کسی اور طرف راغب ہو جاتا۔

نفسیات کی کوئی کتاب پڑھتا تو ملنے جلنے والوں کو اُن کے مسائل کے نفسیاتی تجزیئے کر کے بتاتا۔ کوئی دینی کتاب پڑھ لیتا تو نماز روزے کا اتنی شد و مد کے ساتھ اہتمام شروع ہو جاتا کہ رات کو دو بجے اُٹھ کر وضو کرنے بیٹھ جاتا۔ ماں

ہڑ بڑا کر اٹھتی۔ معلوم ہوتا کہ صاحبزادے تہجد ادا کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ دین و مذہب کی باتیں کرتا، میلادوں اور ختمِ قرآن کی تقریبات میں شرکت کرتا۔ جھوم جھوم کر درود و سلام پڑھتا۔ اُس کی طبیعت میں تلون اور سیلانی پن کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کا بھی پکا تھا۔

کئی سال یونہی گزر گئے۔ زندگی اپنی رفتار سے بہتی رہی۔ وہ زندگی بسر کر رہا تھا یا زندگی اُس کو بسر کر رہی تھی۔ اس بات کا اُس کو کچھ زیادہ شعور نہ تھا۔ گریجویشن کرنے تک اُس کے والد کی دو بار مزید تبدیلی ہو چکی تھی۔ آج کل وہ روزگار کی تلاش میں تھا۔ فارغ وقت میں چند ایک بچوں کو ٹیوشن پڑھا دیا کرتا تھا۔

ایک روز وہ چاندنی رات میں چھت پر اکیلا لیٹا ہوا مسحور کن چاندنی کا لطف لے رہا تھا۔ چاند کو دیکھنے میں اُس کو کچھ ایسا مزا آ رہا تھا جو الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے چاندنی اُس کے اندر تک اتر رہی ہو۔ چاندنی میں وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا کرتا۔ اُس کو ایک سکون اور طمانیت اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ جیسے جھیل کی سطح پر لہریں اٹھنا بند ہو جائیں تو جھیل کا حسن اور خوبصورتی کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ جیسے بادِ نسیم کا کوئی جھونکا چلتے چلتے تھم سا گیا ہو۔

چاند کو تکتے تکتے وہ چاند اور چاندنی سے متعلق کوئی شعر گنگنانے لگا۔ پھر نہ جانے کیسے اُس کی ذہنیر و درود شریف پڑھنے کی طرف مائل ہو گئی۔ وہ گنگنانے کے انداز میں صلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ محمد وسلم پڑھنے لگ گیا۔ پھر وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور نہایت اہتمام کے ساتھ درود شریف کا ورد کرنے لگا۔ ورد کرتے کرتے اُس کے ذہن میں ایک مدہم سا خیال آواز بن کر ابھرا۔

''تم کیا پڑھ رہے ہو؟ اس کا مطلب کیا ہے؟''

اُس نے جواب میں سوچا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اے اللہ تو حضور نبی کریمؐ پر درود و سلام بھیج''

''کیا تم اللہ کو حکم دے رہے ہو کہ وہ اپنے نبی ﷺ کے لئے وہ کرے جو تم اُس کو بتا رہے ہو؟'' اس کے ذہن میں ایک لہراتی ہوئی آواز گونجی۔

''نہیں تو۔۔۔ میں کون ہوتا ہوں اللہ کو کچھ ایسا کہنے والا کہ وہ کیا کرے۔۔ میں تو اللہ سے عرض کر رہا تھا۔۔ اُس نے گھگھیا کر سوچ کی اُٹھتی لہر کو دبانا چاہا۔

''تم ہوتے کون ہو؟ تمہاری حیثیت کیا ہے؟ تم آخر کس Capacity یا حیثیت میں حضور نبی کریم ﷺ کی بابت اللہ سے درخواست کر رہے ہو؟ کیا تم اللہ کو ان ﷺ کی بابت سفارش کرنے کی گستاخی کے مرتکب نہیں ہو رہے؟'' اندر کی آواز بلند ہونا شروع ہو گئی۔

''اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے اُس سے اُس ذاتِ اقدس کی بابت جو رحمۃ للعالمین ہے، یہ کہنا کہ وہ اُن پر ہدیہ درود و سلام بھیجے کوئی غلط بات نہیں۔ ہم سبھی کرتے ہیں اور یہی کرتے آ رہے ہیں۔'' اُس نے اپنے اندر سے اٹھتی آواز کو دبانے کو دل ہی دل میں کہا۔

اس پر اُس کے اندر سے ایک مزید سوال طلوع ہوا۔ کیا تم اپنی ہستی اور حیثیت سے بڑھ کر بات نہیں کہہ رہے؟

اس خیال نے اُس کے اندر ایک تلاطم کی کیفیت پیدا کر دی۔ وہ تلاطم ایک جوار بھاٹا بن گیا۔ اُس کے ہلتے لب ساکت ہو گئے۔ اضطراب نے اُس کے لبوں پر مہر سکوت لگا دی۔ اُس نے سوچا۔

''واقعی میں ایک حقیر امتی کون ہوتا ہوں نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس کو اللہ تعالیٰ جل شانہ کے حضور Recommend کرنے والا؟ سوال کی شدت اور تکرار نے اُس کی سوچوں کو اپنی لپیٹ میں کچھ اس طرح لیا کہ اُس کے اندر گرداب نے ایک بہت بڑے بھنور کی صورت اختیار کر لی۔ اُس کو یوں لگا گویا وہ اُس بھنور کی چکر پھیری کی لپیٹ میں آ کر نیچے ڈوب رہا ہے۔

''میں تو عرض کر رہا تھا۔'' اس نے ڈوبتے ڈوبتے سوچا۔

''تم عرض بھی حکمیہ انداز میں کرتے ہو؟ اندر سے اٹھنے والی آواز میں طنز کی آمیزش نے اُس بھنور کو اور گہرا اور تیز کر دیا۔

''تمہیں معلوم ہے یہ درود کیا ہوتا ہے جسے تم اللہ تعالیٰ سے 'عرض' کر کے حضور ﷺ پہ بھجوا رہے ہو؟'۔۔ایک اور سوال۔۔۔ایک اور طنز۔۔اُس بھنور سے ابھرا اور وہ بالکل ہی ڈوب گیا۔ اب اُس سے درود پڑھنا دو بھر ہو گیا۔ اب وہ درود پڑھتا بھی تو کس منہ سے؟ اس کو اپنی جہالت کا اعتراف کرنے میں ہی عافیت نظر آئی۔

کئی دن تک وہ اسی ادھیڑ بن میں رہا۔ اس کو اس بات کا کوئی حل نہیں سجھائی دے رہا تھا۔ وہ جب بھی درود پڑھنے لگتا اُس کے اندر اٹھتے سوالوں کا گرداب بھنور بننا شروع ہو جاتا اور وہ ڈوب کر رہ جاتا۔ اُس نے بہت غور کیا لیکن اُس کو کوئی ایسی بات نہ سوجھ سکی جو اس کے اندر سے اٹھتے بگولوں جیسے سوال کا مکو ٹھپ سکے۔

اُس نے چند بے تکلف دوستوں سے اس بارے میں بات کی۔ ایک دوست نے کہا۔ با تحیثیت کی نہیں، نہ ہی یہ ہے کہ تم ہوتے کون ہو؟ یہ تو خود اللہ تعالیٰ کا اپنا حکم ہے۔۔۔اور پھر اُس نے قرآن کی اُس آیت کا حوالہ دیا جس میں کہا گیا۔'' بے شک اللہ اور اُس کے فرشتے نبی کریم پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو تم بھی اُن ﷺ پر

درود و سلام بھیجو۔'' اس کو اپنے دوست کی بات سُن کر امید کی ایک کرن نظر آئی۔ اُس نے خود کو سمجھایا کہ لو دیکھ لو۔ اللہ تعالیٰ خود حکم دے رہا ہے اسی لیے ہمارا نبی پر درود بھیجنا فرض بنتا ہے۔ اُس کو توقع تھی کہ یہ دلیل سامنے آنے پر اُس کے اندر اطمینان اور سکون پھیل جائے گا۔ اُس نے رات کو حسبِ معمول نماز سے فارغ ہو کر تسبیح لی اور درود شریف کا ورد کرنے لگا۔ ابھی تسبیح کے نصف دانے بھی نہ گرنے پائے تھے کہ اُس کے اندر سے کسی نے ایک عجیب سے لہجے میں سوال پوچھا۔

''اللہ تمہیں ایک کام کرنے کا حکم دے رہا ہے اور تم اللہ سے کہہ رہے ہو کہ تو ہی یہ کام کرتا رہ۔ چہ خوش؟ اور پھر یہ درود ہے کیا جس کو اللہ خود بھی مسلسل بھیج رہا ہے، اپنے فرشتوں کو بھی اُس نے اسی کام پہ لگایا ہوا ہے اور وہ مسلمانوں کو بھی حکم دے رہا ہے؟ اپنی مثال دے کر، اپنے فرشتوں کی مثال دے کر وہ تمہیں ایک کام کرنے کا کہہ رہا ہے لیکن تم ہو کہ وہ کام بھی واپس اللہ ہی کے ذمہ لگا رہے ہو کہ ہم سے نہیں ہوتا بس تو ہی کر سکتا ہے سو تو ہی کرتا رہ۔۔۔ بھئی واہ۔۔۔ واقعی بہت خوب!''

اُس کے اندر سناٹا چھا گیا۔ اُس نے سمجھ لیا کہ شیطان اُس کے پیچھے پڑ گیا ہے اور وہ اُس کو نبی ﷺ پہ درود نہیں بھیجنے دے رہا۔ لیکن جب وہ اندر سے اُٹھتی آواز کے سوال پر غور کرتا تو اُس کو محسوس ہوتا کہ بات میں واقعی دم ہے اُس کو اس بات کا حل تلاش کرنا چاہیے اور پھر اتنی سی ہی تو بات ہے کہ آخر یہ درود ہے کیا؟

اُس کا شعور جب اس جنگ سے نڈھال اور بے حال ہو گیا۔ اس کی کوئی پیش نہ چل سکی تو ایک روز وہ نماز میں درود پڑھتے ہوئے رو پڑا۔

''رحم پروردگار۔۔ تیری ذات کے علاوہ اور کون ہے جو میری راہنمائی کر سکتا ہے۔ میرے اندر ایک پھانس اتر گئی ہے۔ تو میری مدد فرما۔ اس کانٹے کی چبھن اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی۔۔ تو ہی اس کو نکال سکتا ہے۔ اے اللہ اس کانٹے کو نکال دے جو میری روح کو زخمی کئے دے رہا ہے۔ اس دعا کے بعد اُس کو قدرے سکون سا ملا۔

اسی دن بچوں کو پڑھانے کے دوران کسی لفظ کا مفہوم دیکھنے کے لیے اس نے لغت اٹھائی۔ مطلوبہ لفظ دیکھ ہی رہا تھا کہ اس کی نظر درود کے لفظ پہ پڑی۔ وہاں اُس نے اس کے دیئے گئے مطالب کو بہت دھیان سے پڑھا۔ رحمت، برکت، بخشش کی دعا، دعا، سلام، تسبیح اور تعریف۔ وہ ایک ایک مطلب کی گہرائی میں اتر کر اس کو اس آیت کی روشنی میں پرکھتا رہا۔ بادی النظر میں اُس کا مسئلہ حل ہو چکا تھا۔ لیکن وہ اپنی حیثیت کی بابت گتھی کو حل نہیں کر پا رہا تھا۔

وہ لغت میں لکھے لفظوں کو گھورتا رہا، اُن کو تکتا رہا۔ اس کا ذوق آگہی مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ پھر اُس کی توجہ درود کے فوراً بعد لکھے چھوٹے سے حرف پر پڑی اور وہ حرف پھیلتا چلا گیا۔ درود کے لفظ کے فوراً بعد اس لفظ 'ف' کا کیا مطلب؟ یہ تو فارسی کا مخفف ہے۔ یعنی درود فارسی کا لفظ ہے۔ لیکن عربی میں تو ہم صلی اللہ کہتے ہیں۔

اب اُس نے عربی لغت تلاش کی۔ وہاں ''صل'' کے مادہ سے بنے ہوئے تمام الفاظ اُس کو ایک ہی پٹی میں مل گئے۔ اتصال۔ ایصال۔ متصل، وصل، وصال، صلوٰۃ اور مصلی۔۔۔۔ اور ان تمام الفاظ کے مفاہیم میں جو چیز مشترک تھی وہ تھا۔۔ 'ربط اور تعلق'۔

اب اُس کا مسئلہ بالکل حل ہو گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اُس کا لاشعور اُس کو کس بات کی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ اُس نے اُس رات نہایت عاجزی سے سر جھکاتے ہوئے جب صلیٰ اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ محمد وسلم کہنا شروع کیا تو اُس کے ذہن میں اس کا مفہوم ایک دُعا کا تھا۔

''اے اللہ تو اپنے حبیب حضور نبی کریم الصلوٰۃ والسلام سے میرا تعلق جوڑ دے۔''

اُس کو اپنی حیثیت کا علم ہو چکا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں یہ فرما رہا ہے کہ اللہ اور اس کے فرشتے نبی مکرم ﷺ سے رابطے میں رہتے ہیں۔ اور جو بات ماننے والے لوگ ہیں اُن کو چاہیے کہ وہ بھی اپنا تعلق اُن ﷺ سے اس طرح استوار کر لیں جس میں مکمل خود سپردگی ہو۔ اُس خود سپردگی میں کوئی کمی یا کوتاہی نہ ہونے پائے۔ اُس کو یہ بات سمجھ آگئی تھی کہ درود شریف پڑھنے کے کیا فائدے ہوتے ہیں۔ درود شریف پڑھنے والے بندے کا تعلق اور ربط اللہ کے حبیب سے قائم ہو سکتا ہے۔ وہ اور ذوق و شوق سے درود شریف پڑھنے لگا۔ اب اُس کا درود شریف پڑھنا کوئی سفارش یا Recommendation نہیں تھا بلکہ اپنی ناتوانی کا اظہار اور خواہشِ تعلقی ایک درخواست اور عرضی بن چکا تھا۔ اُس کو احساس ہو چکا تھا کہ اللہ کے حکم کے تحت اُس کو اپنے نبی ﷺ سے تعلق اور ربط قائم کرنا فرض ہے اور اُس کے حکم سے وہ صرف اللہ کی امانت اور دادرسی سے ہی عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ یہ بخشنے والے خداوند کی بخشی ہوئی عنایت ہی ہو سکتی ہے۔ اس سعادت کو زورِ بازو، لفظی ہیرا پھیری اور چترچالاکی کے ذریعے حاصل کرنا ایک خام خیالی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

اس رات گئے اُس کو یوں لگا گویا اُس نے چشمِ تصور سے فرشتوں کو اپنی دُعا، ایک عرضی کی صورت، ایک سبز مخملیں تھال میں رکھ کر ایک نہایت عالی مرتبت، ذی وقار ذات ﷺ کے سامنے پیش کرتے ہوئے دیکھا ہو۔

اب اُس کے اندر لابھنور مٹ گیا تھا۔ اُس کے اندر پھیلتے اطمینان نے اُس کو اتنی توانائی بخشی کہ وہ مسکرا دیا۔

پگھلتا برفاب

وہ دفتر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ انٹر کام پر اُس کی سیکرٹری نے بتایا کہ واپڈا کے ایکسٹینین مسٹر احمد اُس سے فون پر بات کرنا چاہ رہے ہیں۔

اُس نے فون اٹھایا تو دوسری جانب ، حسبِ توقع ، نرم لیکن پُر جوش لہجے اور محبت بھرے لفظوں میں اس کا حال چال دریافت کرنے کے بعد خلوص اور اپنائیت سے پوچھا گیا۔

''کیا ہو رہا ہے ؟''

اس نے بتایا کہ کچھ خاص نہیں ، وہی روٹین کے معمولات ہیں۔ آپ اپنی کہیں۔

اِس پر اُدھر سے کہا گیا ، میں کارِ سرکار سے آپ کے شہر آیا ہوں۔ کاموں سے فارغ ہو چکا ہوں۔ آج واپس جا رہا ہوں۔ خیال آیا کہ کیوں نہ آپ سے بھی ملتا چلوں۔

''زہے نصیب ! ہاں کیوں نہیں۔ بلکہ ایسا ہے کہ آج میں بھی فارغ ہی ہوں۔ آپ یہیں تشریف لے آئیں تو ملاقات بھی ہو جائے گی اور گپ شپ بھی۔ اُس نے احمد صاحب کو مدعو کرتے ہوئے کہا۔ تھوڑی سی ردوکد کے بعد احمد صاحب نے اُس کی دعوت قبول کر لی۔ اُس نے فون رکھ کر چپراسی کو بلا کر آنے والے مہمان کی تواضع کرنے کی بابت کہا اور چند ایک ضروری کاموں کے بارے میں ہدایات دے کر فارغ ہو کر احمد صاحب کا انتظار کرنے لگا۔

احمد صاحب سے اُس کی پہلی ملاقات اپنے ایک دوست کے دفتر میں ہوئی تھی ۔ اُس وقت وہ اسی شہر میں تعینات تھے۔ ان کے چہرے مہرے اور انداز و اطوار میں کچھ ایسی بات تھی جس کے سبب وہ اس کو پہلی ہی نظر میں بھا

گئے تھے۔ اُن کے اندر ایک طرح کی معصومیت سی تھی۔ اُن کا تعلق کسی سرحدی قبیلے سے تھا لیکن اس کے باوجود وہ نہایت صاف اور شستہ اردو بول رہے تھے۔ جوان کے بہت زیادہ تعلیم یافتہ ہونے کی دلیل تھی۔ لہجے میں مٹھاس اور حلاوت تھی۔ کچھ ہی دیر کی ملاقات میں وہ اُس کو اپنائیت کا ایک احساس دے کر رخصت ہوتے ہوئے باقاعدہ گلے ملے تو اُس کو روایتی گرم جوشی سے بڑھ کر محبت کی فراوانی کا احساس ہوا تھا۔

چند ایک ملاقاتوں کے بعد اُن کی واقفیت دوستی میں ڈھل گئی۔ وہ محکمہ برقیات کے ملازم اور یہ ایک کاروباری انسان، امپورٹ ایکسپورٹ کا دھندا کرنے والا۔ اُس کو اُن کی باتوں میں ایک چاشنی سی محسوس ہوتی اور وہ اُس کی باتوں کا لطف لیا کرتے۔ خُو بُو کے لحاظ سے وہ ایک سرکاری افسر ہونے کے باوجود ایک مشفق اور مہربان انسان تھے۔ نرم اور مرنجان مرنج سے۔ ان کی طبیعت میں ایک عجیب طرح کا گداز تھا۔ ان کی سوچوں میں گہرائی تھی، جب کبھی وہ موڈ میں آکر اپنے مخصوص شرمیلے پن کو جھٹک لیتے تو ان کی باتوں کا تاثر اور بھی بڑھ جاتا۔ ان کے دلائل میں وزن اور انداز میں قطعیت ابھر آتی۔ اِن سب باتوں نے اس کو ان کا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اُن کے نزدیک علم کی اصل، مادی سائنس سے کہیں زیادہ ارفع اور اعلیٰ صورت رکھتی تھی اور یہ علم اگر کہیں دستیاب تھا تو وہ صرف روحانی بزرگوں کے پاس تھا۔ ان کے خیال سے وہ بہت محظوظ ہوا کرتا تھا۔ اس موضوع پر ان کے خیالات سننے کی خاطر وہ اُن سے طرح طرح کے سوال کیا کرتا۔

جب وہ مل بیٹھتے تو ملکی سیاست یا مہنگائی کے بارے میں باتیں کرنے کی بجائے سائنسی ترقی اور اس کے بے شمار مظاہر کے پس پردہ کام کرنے والے اصول اور قوانین سے لے کر قیافہ شناسی اور جفر و نجوم تک، طب و حکمت سے لے کر موسیقی کی لے، تال اور سرگم تک، قرآنِ حکیم کی آیات کی تشریح و توجیہ سے لے کر پیروں فقیروں کے قصے

کہانیوں تک ان دونوں کے درمیان گھنٹوں باتیں ہوا کرتیں۔ اُن کے جانے کے بعد بھی وہ ان سے کی گئی باتوں کی بازگشت اپنے ذہن میں محسوس کیا کرتا تھا۔ اُس نے محسوس کیا تھا کہ ان کی گفتگو کے دوران کسی نہ کسی طور ایک غیر محسوس انداز میں اکثر کسی نہ کسی ولی اللہ یا پیر فقیر کا حوالہ ضرور آجاتا تھا اس سے اُس کو اُن کے اولیاء اللہ سے خصوصی لگاؤ اور اُنس کا اندازہ ہوتا۔ کئی بار انہوں نے اُس کو کسی بزرگ سے ملوانے کی بات بھی کی تھی۔

اس بات پہ اس کی طبیعت کبھی مائل نہیں ہوئی اور وہ اس بات کو ہمیشہ ٹال ہی دیا کرتا تھا۔ دل ہی دل میں وہ اس بات کو ایک پڑھے لکھے انسان کی ضعیف الاعتقادی سمجھ کر لطف لیا کرتا تھا اور ایسا کرنے میں وہ خود کو اس لئے حق بجانب سمجھتا تھا کیونکہ پیروں فقیروں کے بارے میں اس کی رائے حسنِ ظن کی بجائے بدظنی کے زیادہ قریب تھی۔ اس کا ماننا یہ تھا کہ ایسے لوگ محض اک قصہ پارینہ ہیں۔ ان کا وجود اب مخصوص کتابوں ہی میں ملتا ہے۔ اس کے ذہن میں پیر و مرشد کا تصور ایک ایسے شخص کا تھا جو لوگوں سے مٹھی چاپی کروانے، ان کے مال کو اپنا سمجھنے، اخلاقی برائیوں سے آلودہ ہونے، عقیدت مندوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھانے، مریدوں پر ناجائز تصرف کرنے اور مخلوقِ خدا سے اپنی پرستش کروانے کی خواہش کو پورا کرنے کی مہارت اور ہنر سے واقف ہوتا ہے۔

اور فقیر۔۔ وہ تو اس کے نزدیک گدڑی پہننے والے، غلیظ اور میلے کچیلے وہ لوگ تھے جو عزتِ نفس نام کی کسی چیز سے ہرگز بھی واقف نہ تھے۔ وہ لوگ اگر کوئی کام کرنا جانتے بھی تھے تو وہ تھا بے شرمی اور ڈھٹائی کا لبادہ اوڑھ کر مانگنا اور مانگ کر کھانا۔ اُس کو تو اس خیال سے ہی وحشت ہوتی کہ وہ اپنے ہی جیسے کسی انسان سے حاجت روائی کی آس لے کر جائے اور اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جائے۔

احمد صاحب اس کے ایسے خیالات کے اظہار پر نہ کبھی ناراض ہوتے اور نہ ہی جز بز۔ وہ اس سے تعلق خاطر کے لیے یا پھر اس کی دلجوئی کو اتنا کرتے کہ پیر و مرشد یا فقیر کی بجائے صوفیا کرام اور اولیاء اللہ کا نام لے آتے۔ یہ بات اکثر خود بھی کہتے کہ ان شعبدہ باز جعلی پیروں فقیروں نے لوٹ مار مچائی ہے اُس کا خود ان کو اتنا فائدہ نہیں ہوا ہو گا جتنا انہوں نے قوم کو نقصان پہنچایا ہے۔ سب سے بڑا نقصان تو یہ ہوا ہے کہ لوگ پیر و فقیر کے نام سے ہی متنفر ہو گئے ہیں، یہ شیطان کی ایک ایسی چال ہے جس نے لوگوں کو اللہ کے دوستوں اور علوم کے اصلی سرچشموں تک پہنچنے سے ہی محروم کر دیا ہے۔

اُن کا کہنا تھا کہ پیر در حقیقت ایک ایسے خدا رسیدہ بزرگ اور دانا انسان کو کہتے ہیں جو کسی کی تربیت کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتا ہے اور اس کو قدم قدم چلا کر عرفان نفس سے گزارتا ہوا عرفانِ ذات کی ارفع اور اعلیٰ منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ نہ کہ کوئی ایسا پیر فر توت جو معصوم لوگوں پر پیر تسمہ پا بن کر سواری گانٹھتا پھرے۔ فقیر تو وہ ہوتا ہے جو فقر و استغنا جیسی اعلیٰ اور ارفع صفات سے آراستہ و پیراستہ ہو کر مخلوق سے ایک تعلقِ انس و محبت اور خالق سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہوتا ہے نہ کہ یہ شرم و حیا سے عاری، بھکاری اور گداگر۔ اصلی پیری فقیری چیز دیگر است۔ اور یہ آج کل کی پیری فقیری تو ایک مذموم کاروبار سے بڑھ کر اور کچھ نہیں۔

اس بارے میں احمد صاحب اُس کو اپنے ہم خیال لگتے بلکہ اُس کو اُن کی رائے اپنی جذباتی سوچ کے مقابلے میں زیادہ دقیق اور پُر اثر لگتی۔ اُن کی ایک اور بات جس نے اُس کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا وہ یہ تھی کہ وہ جب بھی کسی بات کو مباحثہ بنا کر ان سے اپنی بات تسلیم کروانے کی کوشش کرتا تو اگر وہ اُس کی بات سے متفق ہوتے، تو وہ اُس کی بات کو فوراً مان لیتے اور کہتے کہ جی ہاں آپ درست کہہ رہے ہیں اور اگر اُن کو اُس کی بات سے اتفاق نہ ہوتا تو پھر اپنی

بات سنانے سے پہلے تمہید باندھنے کو یہ کہتے 'میرا خیال ہے اگر آپ اس مسئلے کا خود ہی غیر جانبداری سے جائزہ لیں گے تو آپ بات کی تہہ تک خود ہی پہنچ جائیں گے۔ یا یہ کہ آپ ایسا کریں کہ اپنی بات کا اس بات سے موازنہ کر کے خود ہی فیصلہ کریں۔ جب آپ ان دونوں باتوں کا موازنہ کریں گے تو حقیقت آپ پر خود ہی واضح ہو جائے گی اور پھر اس کے ساتھ ہی وہ اپنی بات کہہ سناتے۔ بعد میں جب وہ اُن کی کہی ہوئی بات پہ غور کرتا تو اُس کو اُن کی کہی ہوئی بات میں، اپنی بات کے مقابلے میں زیادہ وزنی اور سچائی لیے ہوئے محسوس ہوتی اور دل ہی دل میں اُن کا اور بھی گرویدہ ہو جاتا۔

احمد صاحب آئے تو حسب سابق اس کو ایک خوشگوار احساس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ انکی صحبت میں اس نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ گفتگو حالاتِ حاضرہ سے شروع ہو کر مختلف موضوعات پر باہمی تبادلہ خیال سے ہوتی ہوئی نہ جانے کیسے خدا شناسی کے موضوع پر جا پہنچی۔ تو احمد صاحب نے بتایا کہ جب انہیں اعلیٰ فنی تربیت کے لیے جاپان بھیجا گیا تھا تو وہاں ان کے قیام کے دوران ایک بار ان کے جاپانی ساتھیوں میں سے ایک صاحب نے ان سے دریافت کیا تھا کہ آپ لوگ خدا کا تذکرہ تو بہت کرتے ہیں تو کیا آپ خدا کے وجود کو ثابت بھی کر سکتے ہیں یا نہیں؟

انہوں نے بتایا کہ اس پر میں نے اُن سے کہا کہ آپ کی تمام تر سائنسی اور مادی ترقی کا دارومدار کس چیز پر ہے؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ برقی توانائی پر۔ اس پر میں نے ان سے کہا، آپ نے دیکھی ہے کبھی یہ برقی توانائی؟ جس پر انہوں نے بات لا کر الیکٹران کے سر ڈال دی کہ الیکٹران کا بہاؤ ہی تو کرنٹ یا برقی توانائی کہلاتا ہے اور چونکہ الیکٹران جسامت میں فوٹان سے چھوٹا ہوتا ہے لہذا اُس کو نہیں دیکھا جا سکتا، اور چونکہ الیکٹران کو دیکھا ہی نہیں جا سکتا

اس لئے اُس کے بہاؤ کو دیکھنا بالکل ہی نا ممکن بات ہے۔ انہوں نے البتہ یہ ضرور تسلیم کیا کہ ہاں اس برقی توانائی کو اس کے مختلف مظاہر کے ذریعے ضرور محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اس پر میں نے اُن سے کہا۔ لیجئے آپ نے تو میرا مسئلہ خود ہی حل کر دیا ہے۔ اور پھر میں نے اٹھ کر کمرے میں موجود ٹی وی آن کر دیا۔ ٹی وی پر مختلف چینل تبدیل کئے اور پھر ٹی وی بند کر کے میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ نے ابھی ابھی کیا دیکھا؟ انہوں نے میرے ٹی وی کو آن کرنے، اُس کے مختلف چینل لگانے اور پھر اس کا سوئچ آف کرنے کا تذکرہ کیا۔ تو میں نے اُن سے کہا۔ میں نے یہ کام صرف اس لئے کیا تا کہ آپ کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کروا سکوں کہ وہ نشریاتی لہریں جو برقی کرنٹ سے بھی لطیف ہیں، اس ٹی وی کا سوئچ آن کرنے سے پہلے بھی یہاں، بلکہ ہر جگہ موجود تھیں اور جب میں نے سوئچ آن کیا تھا تو ان لہروں کا مظاہرہ ہم نے ٹی وی سکرین پر دیکھا اور اب جب میں نے ٹی وی آف کر دیا ہے، تب بھی یہ لہریں اس فضا میں موجود ہیں۔ اگر ہم اپنے ٹی وی کو آن کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، اس میں کرنٹ نہیں چھوڑتے، تو ہم یہ مختلف چینل ہر گز نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہم ان لہروں کی موجودگی سے باخبر نہ ہوتے تو ان لہروں سے مستفید بھی نہ ہو سکتے۔

پھر میں نے اُن سے کہا کہ اب اسی طرح آپ ریڈیو کی مثال پر غور کریں۔ اس وقت بھی فضا میں کتنے ہی ممالک کے کتنے ہی ریڈیو اسٹیشنوں کے پروگرام نشر ہو رہے ہیں۔ ہم جس سٹیشن کو سننا چاہئیں، اپنے ریڈیو کو اس سٹیشن کی لہروں کی فریکوئنسی کے مطابق سیٹ کر کے سن سکتے ہیں۔ خدا، جو ان ریڈیو، ٹی وی اور برقی توانائی کی لہروں سے کہیں زیادہ لطیف اور ارفع و اعلیٰ ہے، انہی لہروں کی طرح ہمہ وقت ہر جگہ موجود ہے۔ آپ کو اپنے اندر لگے اُس ریڈیو، ٹی وی سیٹ، باطن میں لگی اس مشین کو یا اُسے کچھ بھی کہہ لیں، جو اللہ اور اُس کے بنائے ہوئے کائناتی نظام سے

متعلق لہروں کو آپ کے ادراک اور حواس میں داخل کر سکتی ہے، سے کام لینا آجائے۔۔۔ اگر آپ اُس کا سوئچ آن کرنا سیکھ جائیں گے تو آپ اُس کو دیکھ بھی لیں گے اور سُن بھی سکیں گے۔ بات صرف وہ طریقہ سیکھنے کی ہے۔

اُن جاپانیوں پر تو معلوم نہیں احمد صاحب کی اس دلیل کا کیا اثر مرتب ہوا ہوگا، اُس کو البتہ اس بات نے بہت ہی متاثر کیا۔ اُس کو اُن کی یہ دلیل انتہائی دل نشین لگی۔ وہ اس دلیل کا مختلف جہتوں سے اپنے ذہن میں جائزہ لے ہی رہا تھا کہ اُس کے اندر ایک بہت ہی پُرانی دبی ہوئی خواہش سوال بن کر اُس کے لبوں پر آگئی۔ اُس نے اُن سے کہا، 'ہم اپنے اندر لگی اس مشین سے کام لینا کیوں کر سیکھ سکتے ہیں؟ میرا مطلب ہے ہم اس کے استعمال سے کیونکر واقف اور آگاہ ہو سکتے ہیں؟

احمد صاحب تو جیسے اسی سوال کے منتظر تھے، انہوں نے مسکرا کر اس کے سوال کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔

'بات کچھ یوں ہے کہ ہر انسان کا تعلق اللہ سے دہرا تعلق ہے۔ یہ تعلق ایک طرف اللہ کو بندے سے اور دوسری طرف بندے کو اللہ سے رابطے میں رکھتا ہے۔ یعنی ایک طرف تو اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے جڑے ہوا ہے اور دوسری طرف مخلوق کے لیے ضروری ہے کہ وہ بھی اللہ سے، اپنے خالق سے ربط میں رہے۔

میں چونکہ بجلی کے محکمے میں کام کرتا ہوں اس لئے آپ کو بجلی ہی کی مثال دے کر اپنی بات کی وضاحت کروں گا۔ ہم بات کر رہے تھے برقی توانائی کی تو جیسا کہ آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ کسی بھی ایسی مشین میں جو بجلی سے چلتی ہے، اُس میں دو تاریں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ ایک تار کرنٹ کو جنریٹر یا پاور ہاؤس سے اُس مشین تک لاتی ہے اور دوسری تار کرنٹ کو اُس مشین سے واپس جنریٹر یا پاور ہاؤس تک لے جاتی ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی تار خراب ہو یا ٹوٹا ہو تو

اس کرنٹ کے مشین تک آنے یا اُس کے واپس جانے میں تعطل واقع ہونے کے سبب مشین درست ہونے کے باوجود ، وہ کام نہیں کر سکتی جس کے لئے اس کو بنایا گیا ہے۔

اب اس مثال میں تین چیزیں زیادہ قابلِ غور ہیں ۔ ایک تو کرنٹ ، دوسرے تار اور تیسرے مشین۔ یہ کرنٹ یا بجلی سب سے پہلے پانی کے ڈیم یا تھرمل اسٹیشن کے جنریشن پلانٹ میں بنتی ہے وہاں سے اس کو گیارہ ہزار کلو وولٹ کی طاقت سے بہت مضبوط تاروں کے ذریعے شہروں تک لایا جاتا ہے۔ ہر شہر میں گرڈ اسٹیشن بنے ہوئے ہوتے ہیں جو اس طاقت کو خود میں جذب کر کے اس کو ۴۴۰ وولٹ کی طاقت سے پورے شہر میں پھیلا دیتے ہیں۔ گھروں یا فیکٹریوں کے باہر لگے ہوئے ٹرانسفارمر آپ نے ضرور دیکھے ہوں گے۔ یہ ٹرانفارمر اس بجلی کو گھر یا فیکٹری کی ضرورت کے مطابق ۲۲۰ وولٹ میں منتقل کر کے مہیا کرتے ہیں۔ جس طرح بجلی پیدا کرنے کی طاقت پانی میں پوشیدہ تھی اسی طرح صفات خداوندی ہر مظہر فطرت میں مستور ہیں۔ ان سے واقفیت اور آگاہی کے لیے بھی ایک نظام قائم ہے۔ جب تک انسان اس نظام سے آگاہ اور واقف نہیں ہو جاتا۔ وہ اپنے اندر کی اس مشین کو نہیں چلا سکتا، جو اسی مقصد کے لئے اس کے اندر نصب کی گئی ہے۔

اس مشین کو بھی بالکل ٹی وی ریڈیو کی طرح پہلے بجلی مہیا کرنا لازم ہے ورنہ وہ اپنا کام سرانجام دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جب بجلی مہیا ہو جائے تو اس مشین کو چلانے اور اس کو اس کا کام مناسب طور پر سرانجام دینے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کرنٹ کی واپسی کا مناسب انتظام ہو۔ اگر کرنٹ مشین تک پہنچ بی رہا ہو اور وہاں سے اس کی واپسی کا راستہ ہی نہ ہو۔۔۔ یا یہ کہ اگر ہو بھی اور درست کام نہ کر رہا ہو۔۔۔ تو بھی مشین اپنا وہ کام قطعاً نہیں کر سکتی جس مقصد کے لئے اُس کو بنانے والے نے بنایا ہے۔

اب اس بات کو ذرا مزید واضح کرنے کی اجازت دیں تو میں یہ عرض کروں گا کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے ربط اور تعلق تو مشین کو مہیا کئے جانے والے کرنٹ کی مانند ہمہ وقت قائم ہے اور جب تک اللہ انسان کو زندہ رکھتا، یہ ربط اور تعلق قائم رہتا ہے۔ لیکن انسان اپنے خالق، اپنے مالک اور اپنے رب کی طرف متوجہ ہی نہیں تو اُس کے اندر نصب کی گئی مشین کام نہیں کرتی بالکل ویسے ہی جیسے کسی مشین سے کرنٹ اور بجلی کے واپس بہاؤ کا تار ٹوٹا ہوا ہو یا پھر سوئچ ہی آف ہو۔

اب رہی بات اس مشین کے درست استعمال کا ڈھنگ سیکھنے کی تو اس کے لئے آپ کو اللہ تعالیٰ کے کسی ایسے بندے سے رابطہ کرنا ضروری ہے جو اس مشین کے نظام کو بخوبی جانتا ہو۔ نہ صرف یہ کہ خود اُس کے اپنے اندر کی مشین ٹھیک کام کر رہی ہو بلکہ وہ دوسروں کو یہ فن تعلیم کرنے کی قابلیت بھی رکھتا ہو۔ اللہ کے وہ بندے جو اس کام میں مہارت رکھتے ہیں، وہی آپ کے مشین کو مہیا کردہ 'بجلی' کے کنکشن کو آن کرنے کا ہنر سکھا سکتے ہیں۔ یاد رکھیں آپ کے اندر کی مشین کو کوئی باہر سے کبھی نہیں چلائے گا۔ یہ کام تو انسان کے خود ہی کرنے اور سیکھنے کا ہے۔

احمد صاحب کی باتوں کی راست پہنچ اور سیدھی سادی منطق نے اس کے اندر ایک اتھل پتھل مچا دی۔ وہ بظاہر بڑے سکون سے، آنکھیں نیم وا کئے، ٹھوڑی کو ہتھیلی پہ رکھے، ان کی باتوں میں محو ہو چکا تھا۔ اس کا شعور ان کی دی ہوئی مثال کی سادگی اور ندرت کی داد دے رہا تھا۔ اُس نے اُن سے مزید کچھ سننے کی خواہش کے زیرِ اثر سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اور اللہ کے ایسے بندے کی پہچان کیا ہو گی؟''

اُن کی آنکھوں میں ایک چمک لہرائی اور انہوں نے اپنے لہجے میں کوئی تبدیلی لائے بغیر دہرایا۔

''پہچان؟''

اور کہا۔ ”پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ کی صفات کا عکس ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسے لوہے کی مانند ہوتا ہے، جو آگ میں رکھا گیا ہو۔ آگ میں رہنے والا لوہا، گرم ہو کر اپنی دھاتی اور مادی صفات کے ساتھ ساتھ آگ کی غیر مرئی صفات یعنی حرارت اور روشنی کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہوتا ہے۔ لوہا ایک ٹھوس مادی شے ہے اور آگ ایک لطیف چیز۔ آگ کی حرارت، جس کو مادی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں، لوہا اپنے اندر جذب کر کے حرارت اور آگ کا قائم مقام بن جاتا ہے۔ گرم لوہے کی کیا پہچان ہوتی ہے اُس کو اُس کی سرخی سے پہچانا جاتا ہے اور اگر دیکھنے والی آنکھ کی بصارت سرایت کی جانے والی حدّت کی رنگت کو نہ دیکھ سکے تو ہم ایسے ہاتھ کو لوہے کے قریب لے جا کر اس کی حدّت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے احمد صاحب نے ہاتھ دراز کر کے ایک خیالی لوہے کی حدّت کو محسوس کرنے کا مظاہرہ کیا۔ اُس کو اُس وقت احمد صاحب کے چہرے پر پھیلی ہوئی سرخی میں گرم جوشی سے زیادہ حدّت جذبات کا تاثر مل رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اُس حدّت کے زیر اثر خود اُس کے اپنے اندر کوئی چیز پگھلنا شروع ہو چکی ہے۔

اس نے دھیرے سے لہجے میں پوچھا۔ ”آپ جانتے ہیں کسی ایسے گرم لوہے کو؟ میرا مطلب ہے کسی ایسے بندے کو جو میرے اندر لگی مشین آن کرنا سکھا سکتا ہو؟ سوال سن کر احمد صاحب کرسی پر ڈھیر سے ہو گئے۔ جواب میں انہوں نے صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ پوچھنا چاہ رہا تھا؟ کون ہے وہ؟ کہاں ہے وہ؟ کیسا ہے وہ؟ لیکن نہ جانے کیوں وہ گنگ ہوا بیٹھا رہا۔ ان سوالوں نے اس کے اندر تکرار پکڑ لی اور پھر شاید وہ تمام سوال اس کے پورے بشرے پر ہی پھیل گئے تھے۔ احمد صاحب نے ان سوالوں کے جواب میں آہستہ سے کہا۔

”میرا مرشد“

''آپ کا مرشد؟'' میرا مطلب ہے کہ آپ کے پیر صاحب؟ وہی نا! جن کا آپ اکثر تذکرہ کرتے ہیں؟'' گویا معمے کا سرا اُس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔

''جی ہاں میرے مرشد، جن کے فیض سے مجھ جیسے ہزاروں کی بگڑی سنور گئی ہے۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ وہ کیا ہیں اور کیسے ہیں۔ بس اتنا سمجھ لیں کہ اگر میں اُن سے نہ ملا ہوتا تو آج میں یہ کچھ نہ ہوتا جو میں اب ہوں۔ میرا وجود، میری ذات، سب کچھ انہی کا مرہونِ منت ہے۔ اب تو میری صرف ایک ہی ہے کہ میں ان میں جذب ہو کر فنا ہو جاؤں'' کہتے کہتے احمد صاحب کی آنکھوں کی نمی پھیل کر قطرہ بنی اور لڑھک کر ان کے گالوں پر بہہ نکلی۔

وہ کام جو بڑی بڑی کتابیں، طویل مباحثے نہ کر سکے وہ عشق کی حدت سے پگھلتے ہوئے بر فاب نے کر دکھایا۔ اُس کو ایسا لگا کہ اُن کی آنکھ سے نکلا وہ قطرہ، ایک قطرہ آب نہیں بلکہ ایک سنو بال ہے یا ایک ایسا ایوالانشے جو خود اُس کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جا رہا ہے۔ اُس کو اپنی ہستی بے مایہ اور بے وقعت سی لگی۔ احمد صاحب نے مرشد کے عشق سے مغلوب ہو کر جو اظہار کیا وہ ان کے گداز کی علامت ہی نہیں تھی بلکہ اُس ہجر و فراق کی بات بھی سنا گیا جس کی تپش اُس نے ابھی چند ہی لمحے پہلے احمد صاحب کے چہرے پر محسوس کی تھی۔ اُس بندے کو ایک بار دیکھنا تو چاہیے، جس کے عشق و فراق کی حدت نے احمد صاحب جیسے لوگوں کو اک پگھلا بر فاب بنا دیا تھا۔ وہ اُوپر سے کتنے جمے ہوئے دکھتے تھے اور اندر سے کیسے پگھلے ہوئے تھے۔ اُس نے سوچا۔

احمد صاحب کے جانے کے بعد بھی وہ کتنی ہی دیر تکا پنے اندر صدیوں کے جماؤ کو پگھلتا ہوا محسوس کرتا رہا۔ وہ خود تو چلے گئے تھے لیکن اپنی حدت جذبات اور گرمی، تاثر اس میں منتقل کر گئے تھے۔ یہ کیسی آنچ تھی جس نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اُس کو اس کا لطف محسوس ہو رہا تھا وہ اس کیف سے باہر نکلنے پر تیار نہیں ہو رہا تھا۔

بندہ خوش تے رب خوش

''اُٹھ جاؤ بیٹے صبح ہو گئی ہے۔''

ماں کی ممتا بھری آواز اس کو خواب کی دنیا سے باہر کھینچ لائی۔ اس آواز میں گھلی مٹھاس اُس کو اپنے اندر اُترتی محسوس ہوئی۔ نیند اور بیداری کے درمیان معلق شعور، نیند کی پُر خمار وادی کی دہلیز عبور کر کے بیداری کی محدود اور مقید فضا میں داخل ہونے سے ہچکچا رہا تھا۔ نیند کا خمار اس کے اعصاب پر سکون طاری کئے ہوئے تھا اور اس پُر سکون کیف کے لطف کو طول دینے کی خواہش کے زیر اثر، سُنی کو ان سنی کر گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ دوبارہ پکارے جانے کا منتظر بھی تھا۔ وہ اس محبت اور پیار بھری آواز کو دوبارہ سننے کا متمنی تھا جس نے اس کو خواب کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال کر بیداری کی دہلیز پر کھڑا کیا تھا۔

ماں نے دوبارہ پکارا۔

''اُٹھ جاؤ بیٹے۔''

اس کی سماعت میں جلترنگ کا رس گھلتا چلا گیا۔ اس کی ماں کی آواز میں، لب و لہجے اور انداز میں پیار ہی پیار گھلا ہوا تھا۔ پیار کی ان لہروں کو اُس نے اس سے پیشتر کبھی یوں محسوس نہ کیا تھا، جس طرح سے وہ اُس کو اُس وقت محسوس ہو رہی تھیں۔ آج ایسی کیا بات ہوئی۔ اس نے نیم بیدار ذہن میں اپنی ماں کے پکارے گئے الفاظ کو دُہرایا۔ ماں کے الفاظ میں کوئی نیا پن نہیں تھا۔ وہ یہی الفاظ، یہی لب و لہجہ اور یہی انداز وہ اپنی شعوری زندگی کی ابتدا سے ہی سنتا تھا۔

کبھی کبھار جب وہ کسل مندی اور سستی کا اظہار کرتا تو ماں اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتی اور انگلیاں اُس کے بالوں میں پھیرتی تو اس کی کسل مندی اور سستی دور ہو جاتی اور وہ نہ چاہنے کے باوجود اُٹھ کر بیٹھ جایا کرتا۔

ماں تو مجھ سے ہمیشہ سے ہی اتنا پیار کرتی رہی ہے۔ مجھی کو اس سے پیشتر اس کا اتنا ادراک کبھی نہ ہوا تھا۔ آخر کیوں؟

ممتا۔۔ ہمارے ارد گرد پھیلی ہوا ہی کی مانند لطیف ہونے کے باوجود، انسانی زندگی کی بقاء اور نشوونما کی ضامن ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ماں کے دل میں اولاد کے لئے ممتا کے پیار اور محبت کا خزانہ انڈیل نہ دیتے تو انسان کی پیدائش ممکن تھی اور نہ ہی اس کی نشونما۔ یہ اس کی لطافت کے سبب ہی تو تھا کہ انسان اس کی موجودگی اور اہمیت دونوں سے ہی صرف نظر کئے رہتا ہے۔ انسان چونکہ مادیت کے ٹھوس شکنجے میں جکڑا رہتا ہے اس لئے وہ اکثر لطیف چیزوں کی اہمیت اور افادیت کو محسوس کرنے میں ناکام رہتا ہے اور بات یہاں تک بڑھ جاتی کہ وہ سب سے زیادہ لطیف ذات، خالقِ ارض و سماوات، رب کائنات کے وجود کو ماننے میں بھیتا مل کرنے لگتا ہے۔

اس کی سوچ کے دائرے بنتے اور پھیلتے چلے جارہے تھے کہ سوچ کی ایک نئی لہر اس کے شعور کے کناروں سے ٹکرائی۔ اللہ تو اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بڑھ کر پیار کرتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے پیار کو ماں کی ممتا اور محبت سے تشبیہ دیتے ہوئے اس کی وسعت اور پھیلاؤ کا اندازہ کروانے کو اسے ستر ماؤں سے بڑھ کر قرار دیا۔ یعنی ایک بندے کے لئے کم از کم ستر ماؤں کا پیار ایک طرف اور اپنی مخلوق سے اللہ کا پیار دوسری طرف۔ لیکن اللہ تو لا محدود ذات ہے۔ اِس طرح تو اُس کا پیار محدود قرار پاتا ہے۔ ستر ماؤں سے بڑھ کر۔۔۔ کتنا زیادہ اور کتنا بڑھ کر اس کی کوئی حد نہیں بتائی۔ یعنی کم از کم ستر ماؤں جتنا پیار، اللہ کے اس پیار کا جو اس کو اپنے بندوں سے ہے۔ نقطہ آغاز ہوا۔ اس پیار

کی آخری حد کا تعین نہ کیا گیا ہے اور نہ ہی کیا جانا چاہیے۔ جس ذات کے پیار کی شدت کا عالم یہ ہو کہ وہ ستر ماؤں کے پیار اور ممتا کے برابر پیار اپنی محبت کی ابتداء کرتا ہو، اُسکی محبت اور ممتا کو محسوس نہ کرنا اُس ذات سے تعلق ہی نہ رکھنا ، اس ذات کا عرفان حاصل نہ کرنا ، اس کی خلافت اور نیابت کے لئے خود کو آمادہ اور تیار نہ کرنا ، اس ذاتِ مطلق کی عبودیت سے پہلو تہی کرتے رہنا اور اس کے حکمکی خلاف ورزی اور اس کی سرتابی کے مسلسل مرِ تکب ہوتے رہنا، کتنی بُری بات ہے۔ یہی تو وہ ظلم اور جہالت ہے جس کے لئے قرآن میں ظلوما کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

اُس کی فکر نے ابھی اتنی ہی مسافت طے کی تھی کہ اُس کی سماعت میں اُس کی ماں کے الفاظ کا جلترنگ ایک بار پھر بج اٹھا۔

''اٹھ بھی جاؤ، ورنہ دیر ہو جائے گی۔''

''جی اچھا'' کہہ کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

اُس کی نگاہ اپنی والدہ کے چہرے پر پڑی۔ اس کو بیداری میں داخل ہوتے دیکھ کر ایک شفیق سی مسکراہٹ نے اُس کا استقبال کیا۔ عادت کے زیر اثر اس نے ماں کو سلام کیا تاکہ اس کو یہ یقین ہو جائے کہ اس کا بیٹا خوابوں کے دیس سے پلٹ آیا ہے۔ ماں کو جب یہ تسلی ہوگئی کہ وہ پوری طرح سے بیدار ہو چکا ہے اور اب وہ دوبارہ سو نہیں جائے گا تو وہ اس کے لیے ناشتہ بنانے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

گزری سوچ ابھی اُس کے ذہن سے محو نہیں ہوئی تھی۔ اس کا دھیان اُدھر ہی لگا ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں آنے والا خیال، اُس کو فکر کی وادیوں میں محوِ پرواز رکھتے ہوئے تھے۔ وہ نئی اور انجانی سوچوں پر حیران بھی تھا اور اُن

سے لطف بھی لے رہا تھا۔ ماں میرا کتنا خیال رکھتی ہے آج سے پہلے میں نے کبھی ایسا کیوں محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ اسی خیال کو اپنے ذہن میں دہرا رہا تھا کہ اس کے اندر ایک اور خیال آواز بن کر گونجا۔

''اللہ میاں تو ماں سے بھی ستّر گنہ زیادہ خیال رکھتے ہیں، تم نے تو کبھی اس بات کو بھی محسوس کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔''

بات تو درست ہے لیکن میں تو ابھی اپنی ماں ہی کی محبت کا جواب نہیں دے پا رہا جواب دینا تو دور رہا مجھے تو اُس کے پیار کا مکمل احساس اور ادراک ہی نہیں ہے، تو اس ستر گنہ سے زیادہ محبت کا حق بھلا کیونکر ادا کر سکتا ہوں۔ میں تو اپنی ماں کو بھی راضی رکھنے میں اکثر ناکام ہی رہتا ہوں۔ اس ذات کو جو میرے محسوسات، میری فہم اور ادراک سے بھی ماوراء ہے کیونکر راضی رکھ سکتا ہوں۔ اس نے قنوطیت سے سوچا۔ مجھے تو اپنی ماں کو بھی خوش کرنا نہیں آتا۔ اس کی رجائیت نے اس کو ایک اور بات یہ سجھائی کہ اگر میں اپنی ماں کو خوش کرنے کا راستہ ڈھونڈ لوں تو شاید مجھے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا طریقہ بھی معلوم ہو جائے۔

وہ ان ہی سوچوں میں غلطاں ناشتہ کر رہا تھا کہ اُس کی ماں نے اُس سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے، آج تم کچھ چپ چپ سے ہو؟''

اُس نے ایک فوری فیصلے کے تحت ذہن میں اٹھنے والے اس سوال کو اپنی ماں سے ہی پوچھنے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا۔

''امی! میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہ رہا تھا۔''

ماں نے منہ سے کچھ کہنے کی بجائے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا، گویا کہہ رہی ہو۔

''ہاں بولو کیا بات ہے؟''

اُس نے کہا۔

''امی! کیا آپ مجھ سے راضی ہیں؟''

ماں کے چہرے پر حیرت کا ایک تاثر لہرایا۔ اس نے کچھ توقف کیا جیسے وہ اس سوال کا پس منظر سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو یا اس سوال کے بعد پوچھی اور کہی جانے والی بات کا اندازہ لگا رہی ہو۔ جب وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکی تو بولی۔

''ماں تو اپنی اولاد سے راضی ہی رہتی ہے۔ پر تم نے یہ کیوں پوچھا؟''

اس نے ماں کو براہ راست جواب دینے پر آمادہ کرتے ہوئے قدرے ٹھٹک کر کہا۔

''نہیں امی! پہلے آپ میری بات کا جواب دیں۔''

ماں نے بجائے جواب دینے کے الٹا اُس سے ہی پوچھ لیا۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے نزدیک کوئی بندہ اپنی ماں کو کیونکر راضی کر سکتا ہے۔ اگر اولاد اپنی ماں کو خوش کرنا چاہتی ہے تو اُس کو کیا کرنا چاہیے؟''

''اولاد اپنی ماں کی تابعداری کرے، اُس کا حکم مان کر، اُس کی کہی ہوئی باتوں پر عمل کر کے، اُس کی خدمت کر کے اُس کو خوش رکھ سکتی ہے۔''

اس نے چالاکی سے تین چار ممکن جواب ایک ہی جملے میں سمو دیئے۔

ماں اُس کی یہ بات سن کر دھیرے سے مسکرائی گویا کہہ رہی ہو میں تمہاری چالاکیوں کو خوب اچھی طرح سمجھتی ہوں اور کہا۔

''اور جب اولاد چھوٹی ہوتی ہے۔ یہی چند دن، چند ماہ یا چند سال کی عمر تک ۔۔۔ تو؟''

''تو کیا؟ اس تو کا کیا مطلب ہوا؟''

اُس نے اِس سوال کو اپنی سکت سے بہت زیادہ مشکل پاتے ہوئے بے ساختگی سے کہہ دیا۔

ماں نے وضاحت کی ''جب بچے چھوٹے ہوتے ہیں تو کیا وہ ماں کو خوشی نہیں دیتے۔ جب ابھی وہ اس قابل ہی نہیں ہوتے کہ وہ ماں کی کوئی بات مان سکیں، اُس کی کوئی خدمت کر سکیں اور اس کی تابعداری کر سکیں تو اس وقت تمہارے سوال کا کیا جواب رہ جاتا ہے؟''

وہ سوچنے لگا واقعی اس بات کا بھلا کیا جواب ہو سکتا ہے؟

ناشتہ ختم کرنے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک اپنی ماں کی کہی ہوئی بات پر غور کرتا رہا لیکن اس کو کوئی بات نہ سوجھ سکی۔ ماں نے بھی مزید کچھ نہ کہا۔ پھر وہ دفتر چلا گیا۔ دفتر جاتے ہوئے بھی وہ اسی بات کو اپنے ذہن میں دہراتا رہا۔ دفتر پہنچا تو اُس کو احمد صاحب کا خط ملا۔ انہوں نے اپنے خط میں اُس کو دی گئی کتاب کے بارے میں پوچھا تھا کہ وہ اس کو کیسی لگی اور دوسرے اس کو یہ یاد دلایا تھا کہ اس ماہ کے آخری ہفتے میں کراچی جانا ہے۔

احمد صاحب کی دی گئی کتاب ''قلندر شعور''۔۔دیکھنے میں تو ایک چھوٹا سا کتابچہ تھی لیکن اس کتاب نے اس کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ اب تک اُس نے اِس کتاب کو کئی بار پڑھ ڈالا تھا، لیکن اُس کی تشنگی کسی طور ختم نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے ذہن میں کئی خوابیدہ سوالوں کے جواب اُس کو اس کتاب میں مل گئے تھے۔ نہ صرف مل گئے تھے بلکہ اُس کے شعور کی دسترس میں بھی آ چکے تھے۔ اس کتاب کی وجہ سے علم و آگہی کی کئی نئی جہتیں اس کے سامنے واضح ہوئی تھیں۔ اُس کے ذہن میں کئی نئے دریچے وا ہوئے تھے اور کئی نئے روزن کھل گئے تھے۔

اس کتاب میں مصنف نے انتہائی سادگی اور سلاست کے ساتھ کائناتی نظام میں کام کرنے والے فارمولوں سے لے کر جنسی کشش کے قوانین تک روحانی علوم کے حوالے سے نہایت عام فہم انداز اور دلنشین اسلوب سے بیان کئے تھے۔ وہ اپنی کتب بینی کے ذوق کو اپنی والدہ کے شوقِ مطالعہ کی دین سمجھتا تھا۔ بچپن سے اُس کی والدہ نے اُس کو کتب بینی کی کچھ اس غیر محسوس انداز میں تربیت دی تھی کہ اُس کو خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب مطالعہ کا شوق اس کی عادت اور لت بن گیا تھا۔ کتابیں پڑھنا خواہ وہ کسی بھی قسم کی ہی کیوں نہ ہوں اس کی عادت سی بن چکی تھی۔ ادب و شعر و سخن سے لے کر فلسفۂ حیات تک کسی بھی موضوع پر اُس کو اگر کوئی کتاب دستیاب ہو جاتی تو وہ اُس کو ضرور پڑھ ڈالتا اور اگر اُس کو کوئی کتاب اچھی لگتی تو وہ اس کو نہ صرف دوبارہ بھی پڑھتا بلکہ دوستوں کو بھی بتاتا کہ فلاں کتاب میں اُس نے یہ کچھ پڑھا ہے۔

اِس کتاب کو پڑھ کر اُس کے علم میں کماحقہٗ اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ اُس کو باطنی علوم کے راستوں پر عملی طور پر چلنے کی ترغیب بھی ملی تھی۔ اس کتاب نے اُس کی سوچوں پر ایک گہرا نقش چھوڑا تھا۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اُس کو اپنی سوچوں میں ایک واضح تبدیلی کا احساس ہونے لگا تھا۔ علم و آگہی کی باتوں کے علاوہ اس کتاب نے اپنی طرزِ

فکر کا قبلہ درست کرنے کی جس انداز میں اُس کو ترغیب دی تھی اس نے اُس کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ وہ آج تک علم و عرفان کے تعاقب میں تو رہا تھا لیکن اس بات کا علم اس کو پہلی مرتبہ اس کتاب ہی کی وجہ سے ہوا تھا کہ علم و عرفان کا کتنا گہرا تعلق طرزِ فکر سے ہے، خاص طور پر اس طرزِ فکر سے جو انبیاء کی طرز فکر ہے یہ بات اُس کو پہلی بار اس کتاب سے ہی معلوم ہوئی تھی۔

مصنف نے سادہ زبان میں علمیت کا رعب گانٹھے بغیر چھوٹے چھوٹے واقعات اور اپنی روز مرہ زندگی کی مثالیں دے کر اپنی طرزِ فکر میں تبدیلی لانے کی بابت بتا کر قاری کو اپنی طرز فکر اور انداز نظر میں تبدیلی کی دعوت دی تھی۔ کم ہی کتابیں ایسی تھیں جنہوں نے اُس کو اِس قدر متاثر کیا تھا کہ اس کے دل میں مصنف سے ملنے، اس کو ذاتی طور پر جاننے کی خواہش کروٹیں لینے لگی تھیں۔ اس نے اپنے ذہن میں مصنف کی شخصیت کے کئی خاکے بنا ڈالے تھے۔ کتاب پڑھ کر اس کے ذہن میں ایک عظیم اور بارعب شخصیت کی تصویر ابھرتی اور احمد صاحب سے سنی ہوئی باتوں کی روشنی میں اس کے ذہن میں ایک نرم خو، مدھم اور مشفق انسان کا تصور ابھرتا۔ وہ ان دونوں تصورات کو ملاتا تو اس کے ذہن میں بننے والی تصویر گڈ مڈ ہو کر رہ جاتی۔ اتنا بہت سا علم رکھنے کے باوجود کوئی انسان بارعب ہونے کے بجائے شفیق اور ملنسار بھلا کیونکر ہو سکتا ہے۔ یہ بات اُس کو سمجھ نہیں آرہی تھی۔ کیونکہ اس کا مشاہدہ یہ تھا کہ تحربِ علمی میں مبتلا اکثر لوگ بے رحم ناقد بن جاتے ہیں۔ وہ ہر ایک کی اصلاح اپنے بڑھے ہوئے علم کے زور پر کرنا چاہتے ہیں جس سے ان کی شخصیت میں ایک طرح کی سختی اور دُرشتی سی آجاتی ہے۔

اُس کو وہ منظر اچھی طرح یاد تھا جب اُس نے احمد صاحب کے چہرے پر پھیلتا دھواں، تڑخنے کے آثار اور آنکھوں میں نمی دیکھ کر یہ اندازہ کیا تھا کہ اُن کے مرشد ایک انتہائی مشفق اور پُر محبت انسان ہوں گے۔ تبھی تو احمد

صاحب اُن سے اس طرح سے متاثر ہیں کہ اُن کا تذکرہ کرتے ہوئے اُن کی پلکیں بھیگ بھیگ جاتی تھیں۔ اس نے سوچا اور یہ سوچ کر صبر کر گیا کہ جب ملاقات ہو گی تو دیکھا جائے گا۔

احمد صاحب کو خط لکھنے کے دوران کئی بار اُس کا دھیان صبح اپنی ماں سے ہونے والی باتوں کی طرف مبذول ہوا اور اُس نے چاہا کہ وہ اُس کی بابت بھی اُن کو کچھ لکھے۔ اس نے سوچا کہ اب یہ بھی تو محبت ہی کی ایک قسم ہے جو احمد صاحب کو اپنے مرشد سے ہے۔ وہ اُس پیار کا معما بھلا کیا حل کرے؟ اُس کو نہ تو کبھی کسی سے ایسا پیار ہوا تھا اور نہ ہی اُس کو اس کا کوئی اندازہ تھا۔ کیا احمد صاحب کا عشق یکطرفہ ہے اُن کے مرشد بھی اُن سے اتنا ہی پیار کرتے ہوں گے کہ احمد صاحب کو یاد کرتے ہوئے اُن کی پلکیں بھی بھیگ جاتی ہوں گی۔ اُس نے اندازہ کرنے کی کوشش کی لیکن اُس کو یہ ایک بے تکی سی بات لگی کہ دو بندے ایک دوسرے کی چاہت میں آنسو بہا رہے ہیں۔ اُس نے سوچا کہ محبت تو ایک قوت ہے جو توانائی عطا کرتی ہے۔ ایک ماں اپنی محبت کی طاقت سے اپنی اولاد کی تخلیق اور پرورش کا عظیم کام سرانجام دیتی ہے نہ کہ بیٹھی آنسو ہی بہایا کرتی ہے۔

آج صبح ہی تو اُس کا دھیان اپنی ماں کی محبت کی طرف گیا تھا۔ اُس سے اُس کی محبت کی اُس فراوانی کا خیال آیا تھا جو خالقِ کائنات کو اپنی مخلوق سے ہے۔ اُس نے اُس محبت کے ناطے ماں سے اُس کو راضی رکھنے اور اُس کی خوشی دینے کی بات کی تھی۔ اب یہ ایک اور ہی طرح کی محبت اُس کی توجہ اپنی طرف جذب کر رہی تھی۔ ایک مرید کی اپنے مرشد سے محبت۔ اس کی بابت اُس کو اس سے پہلے نہ تو کوئی تجربہ تھا اور نہ ہی یہ چیز اُس کے مشاہدے میں تھی۔

وہ اپنے دوستوں سے پیار کرتا تھا۔ اُن میں سے کچھ کی صحبت میں رہنا اُس کو اچھا لگتا تھا۔ مرد عورت کے مابین کشش کو خود اس نے بھی کئی بار محسوس کیا تھا۔ اردو ادب میں بے شمار افسانے اور شاعری میں محبوب اور محب کے ہجر

وفراق اور وصل وشاد کامی کے حوالے سے اس کو کئی اشعار یاد تھے۔ ان افسانوں میں کہیں عورت کی محبت اور وفا کا رنگ نمایاں تھا تو کہیں مرد کے عشقِ بلا خیز کے کارنامے۔ وہ محبتوں کے ان مختلف رنگوں سے کسی نہ کسی طور ضرور آشنا تھا۔ لیکن آج صبح اس کے فلسفہ محبت میں ایک نئی جہت در آئی تھی۔ وہ اپنی ماں سے محبت کے حوالے سے نہیں بلکہ ماں کی خود اُس سے محبت کے حوالے سے سوچتے سوچتے احمد صاحب کا اپنے مرشد سے محبت اور پھر مرشد کی اپنے مرید سے محبت کے حوالے سے سوچنے لگ گیا۔ شام کو جب وہ گھر پہنچا تو اس نے ماں سے کہا۔

''امی! صبح آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا بلکہ الٹا مجھ ہی سے سوال کر کے مجھے الجھا دیا تھا۔۔آپ کے سوال سے مجھے کوئی جواب نہیں بن پڑ رہا۔ آپ ماں ہیں۔۔۔ میری اچھی امی جان ۔۔۔ آپ ہی اس بات کا بہتر جواب دے سکتی ہیں۔''

ماں نے اپنے بیٹے کی بات سنی تو وہ مسکرا دی۔ اس کو اپنے بیٹے کی کھوجی طبیعت کا خوب اندازہ تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ وہ جس چیز کے پیچھے پڑ جاتا ہے اُس کو حاصل کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر بھی اُس نے ایک تجاہل عارفانہ سے کہا۔

''کون سا سوال؟ کیا پوچھا تھا تم نے؟''

''وہی کہ ماں کو خوش کرنے کے لئے اولاد کو کیا کرنا چاہئے؟''

سوال دُہرا کر اس نے آنے والے جواب کو سمیٹنے کے لئے ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے ماں کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ ماں کی آنکھوں میں چمک در آئی تھی۔ اُس نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔

''پگلے ہو تم تو۔۔ ماں کو راضی کرنا ، ماں کو خوش کرنا بھلا کون سا کوئی مشکل کام ہے۔ ماں تو اپنے بچے کو دیکھ دیکھ کر ہی خوش ہوتی رہتی ہے۔ وہ تو اپنے بچے کو دیکھ دیکھ کر ہی نہال ہوتی رہتی ہے۔ بچہ مسکراتا ہے تو ماں کھل اٹھتی ہے۔ بچہ کلکاری مار دے تو ماں واری صدقہ ہو جاتی ہے ۔ خوشی سے بے حال ہو جاتی ہے۔ اگر اولاد اپنی ماں کو خوش رکھنا چاہتی ہے تو اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ خود خوش رہے۔ کوئی ماں اپنے بچے کو دُکھی نہیں دیکھ سکتی۔ ماں اپنے بچے کو پریشان دیکھتی ہے تو اُس کا دل کٹ کر رہ جاتا ہے۔ خدمت اور فرمانبرداری کا اپنا ایک مقام ہے۔ لیکن جب اولاد اپنی ماں کی کوئی خدمت کرنے کے قابل نہیں ہوتی تب بھی تو ماں اپنے بچے سے خوش ہوتی ہے ، خدمت کا خوشی سے وہ تعلق نہیں ہے۔ جو سمجھا جاتا ہے یہ تو ضرورت کی باتیں ہیں۔''

اس نے کھلی ہوئی باچھوں کے ساتھ کہا۔

''یعنی بچہ خوش تے ماں خوش ، واہ امی آپ نے تو میرا دل خوش کر دیا۔ اتنی سادہ سی بات مجھے کیوں سمجھ نہیں آرہی تھی۔''

''اس لیے کہ تم ماں نہیں۔''

ماں نے اُس کو اپنی ممتا کے چھتنار ہونے کا احساس دلانے کو کہہ دیا۔

ماں کی باتوں نے اُس کو اتنا ہلکا پھلکا کر دیا کہ وہ گنگنا اٹھا۔ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں جاتے ہوئے اُس نے سوچا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ''بندہ خوش تے رب خوش'' یہ سوچ کر اس کو لگا کہ اب زندگی بسر کرنا کچھ اتنا مشکل کام بھی نہیں۔ زندگی گزارنا اس کو یکدم ہی کچھ آسان سا لگنے لگا۔ آج ماں نے مجھے زندگی کی راہ پر گامزن رہنے کے لئے زادِ راہ بھی تھما دیا ہے۔ اس نے ممنونیت سے سوچا۔

سفرِ خود آگاہی

کراچی جاتے ہوئے اُس کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ اُس نے یوں تو زندگی میں بہت سے سفر کئے تھے۔ سفر کرنا اس کو ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔ اس کو اپنے بچپن سے ہی سفر کرنے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔ اس کے والد ایک سرکاری ملازم تھے۔ جب بھی ان کا تبادلہ ایک شہر سے کسی دوسرے شہر ہوتا اور وہ ایک نئی منزل کی طرف عازمِ سفر ہو جایا کرتے۔ اس وقت اس کو کچھ زیادہ شعور نہ تھا لیکن کسی نئی جگہ جانے کا اشتیاق اس کو درپیش سفر کی رغبت ہی دلاتا تھا۔

ایک شہر میں بنے تعلقات اور دوستیاں چھوڑنے کا قلق تو ہوتا، وہ دوستوں کو چھوڑتے ہوئے رو بھی دیتا۔ نئے شہر یا نئے قصبے میں نئے ماحول میں نئے سرے سے میل ملاپ کی ابتدا ہوتی۔ وہ نئے اسکول یا نئے کالج میں داخل ہوتے۔ شروع شروع میں اجنبیت محسوس ہوتی پھر رفتہ رفتہ نئے دوست بن جاتے۔

ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ انہیں امتحانات کا آغاز ہونے سے پیشتر ہی کوچ کرنا پڑا تھا۔ اس لئے اس کو دوسرے شہر جا کر امتحان دینے واپس اسی شہر کا سفر کرنا پڑا تھا۔ اُس کے والد نے اپنے ایک دوست کے یہاں اُس کے رہنے کا بندوبست کر دیا تھا اور وہ امتحان سے فارغ ہو کر واپس اپنے والدین کے پاس چلا جاتا تھا۔

پھر جب اس نے عملی زندگی میں قدم رکھا اور ملازمت پیشہ زندگی اختیار کرنے کی بجائے اپنے کاروبار کا آغاز کیا تو کاروباری سلسلے میں اس کو کبھی کبھار ایک شہر سے دوسرے شہر اور چند ایک بار تو ایک ملک سے دوسرے ملک جانے کے مواقع بھی ملتے رہے تھے۔ ذاتی طور پر اُس کو رات میں سفر کرنا زیادہ اچھا لگتا تھا۔ اس سے ایک طرف تو اس کا اگلا پورا دن اپنے کام نپٹانے کو مل جاتا اور دوسری طرف رات میں سفر کے دوران وہ اپنی سوچوں کو منضبط کرنے، آئندہ کی منصوبہ بندی کے ذہنی کام فراغت سے کرنے کے مواقع کا بھرپور فائدہ اٹھاتا۔

رات میں جب ساتھی مسافر اونگھ رہے ہوتے تو وہ اپنی سوچوں کی محفل سجا لیا کرتا۔ اپنی کارکردگی کے جائزے لیتا، درپیش مسائل سے عہد برآ ہونے کی ترکیبیں سوچتا، اپنے الجھے کام نکالنے کے ڈھنگ ترتیب دیتا۔ چند ایک بار اُس نے کچھ ایسے سفر بھی کئے تھے جن کا مقصد محض اپنے پرانے دوستوں سے ملاقات رہا تھا۔ اُس کو ہم خیال اور ہم مزاج دوستوں سے مل کر، ان سے تبادلہ خیال کر کے، اُن سے اپنے معرکوں کی داد وصول کر کے، ایک طرح کی طمانیت بھی ملتی اور آئندہ کے لائحہ عمل کو طے کرنے کے لیے مشورے بھی حاصل ہوتے۔

لیکن آج کا سفر نہ تو ہجرت اور تبادلے کے سفر جیسا کوئی سفر تھا۔ نہ کوئی کاروباری فائدہ پیشِ نظر تھا، نہ ہی کوئی تعلیمی معرکہ سر کرنا تھا اور نہ ہی کسی دوست سے ملنے جیسا کوئی ولولہ امڈ رہا تھا۔ اس سفر کا اصل غایت احمد صاحب کے بابا جی سے ملاقات تھی جن سے وہ غائبانہ طور پر احمد صاحب کی وجہ سے متعارف ہوا تھا۔

اُس نے ان کی تحریر کردہ چند ایک کتابیں بھی پڑھ لی تھیں۔ اُن کتب کا مطالعہ سے اُس کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کے ساتھ ساتھ اُس کے علم میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔ لیکن یہ سب بھی اس کو اُن سے ملاقات پہ ابھار نہیں سکا تھا۔ بابا جی سے ملاقات کے شوق کو اصل مہمیز احمد صاحب کے والہانہ پن اور جذبہ عشق نے لگائی تھی۔ اس سفر کے پس پردہ جذبہ شوق سے زیادہ اس کے ذوقِ تجسس کی کارفرمائی کا دخل تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اُن کے مرشد میں ایسی کیا خاص بات ہے جس نے اُن جیسے پڑھے لکھے سمجھدار انسان اور ایک ذمہ دار افسر کو اُن کا ایسا دیوانہ بنایا ہوا تھا کہ وہ افسر ہو کر بھی کسی طور افسر نہیں لگتے تھے۔

دورانِ سفر بھی احمد صاحب کی گفتگو کا محور ان کے مرشد کی ذات ہی تھی۔ اُن کے افکار، اُن کے اقوال، اُن کے قصے، اُن کی باتیں، تحریری معرکہ آرائیاں، تقریری جہاد، سوال و جواب کی نشستیں، خدمتِ خلق کے ضمن میں

ان کی جامع کاوشیں ، پیچیدہ اور لاعلاج امراض کے لئے رنگ اور روشنی سے علاج ، پریشان لوگوں کے روحانی اور نفسیاتی مسائل کا حل تجویز کرنے ، عوام الناس کو سکون آشنائی سے روشناس کروانے کو مراقبہ ٹیکنالوجی کو متعارف کروانے اور اس ضمن میں لوگوں کی عملی تربیت کے لئے اپنی مدد آپ کی بنیاد پر ہر شہر میں مراقبہ ہالز کے نام سے سینٹرز کا قیام اور اُن کی نگرانی، اُن سے منسوب لوگوں کی توقعات کی باتیں۔

وہ یہ باتیں سنتے سنتے اپنے ذہن میں باباجی کی شخصیت کی بابت تصویر کشی کرنے لگ جاتا۔ اُن کے کئے جانے والے کاموں اور کارناموں کے لئے درکار قوتِ کار کے لیے تو کوئی نو گز لمبا چوڑا انسان یا کوئی روبوٹ ہونا چاہیے۔ بیسیوں کتابیں لکھنا، روزانہ ڈھائی تین سو خطوط کا جواب لکھنا، درجنوں مریض دیکھنا اس پر مستزاد۔ لیکن اتنے بہت سے کاموں کے لیے قوت کار ہی نہیں وقت بھی تو درکار ہوتا ہے۔ اگر وہ دن رات کام کرتے ہوں تو وہ سوتے کس وقت ہوں گے ؟ اُس سے رہا نہیں گیا۔ جب احمد صاحب نے بتایا کہ وہ عموماً تین گھنٹوں سے زیادہ نہیں سوتے تو بے یقینی نے اُس کے اندر انگڑائی لی۔ اتنا کم سونے والا انسان یا تو بیمار ہوتا ہے یا پھر سو جاتا ہے۔ یعنی یا وہ بے خوابی کا مریض ہے اور اگر نہیں تو وہ لازماً بیمار ہو جائے گا۔

اُس نے میڈیکل سائنس کے حوالے سے تبصرہ کیا۔ احمد صاحب اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے اور اپنے مرشد ہی کے حوالے سے بتانے لگے کہ جب کسی انسان کا شعور لاشعور کے تابع ہو جاتا ہے تو اس کے کام کرنے کی رفتار عام انسانوں سے کہیں زیادہ ہو جاتی ہے۔ شعور کو لاشعور کے تابع رکھنے کے لیے کم کھانا ، کم بولنا، کم سونا ضروری ہوتا ہے۔ ویسے بھی عام روزمرہ کی زندگی کا مشاہدہ بھی ہے کہ یکسوئی سے کئے جانے والے کام نسبتاً کم وقت میں مکمل ہو جاتے ہیں۔

اس کے ساتھ احمد صاحب کے علاوہ اُن کے دو اور دوست بھی سفر کر رہے تھے۔ وہ بھی احمد صاحب ہی کی طرح انہی با با جی سے بیعت تھے۔ اُن کے دادا مرشد حضور قلندر با با اولیاءؒ کے عرس کی تقریبات میں شامل ہونے جا رہے تھے۔ ایک جگہ اُس نے اپنے ذہن میں موجود بیعت سے متعلق تصورات کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے احمد صاحب سے دریافت کیا۔ ''یہ بیعت ہونا کیا ہوتا ہے؟''

احمد صاحب کے جواب دینے سے پیشتر اُن کے ایک ساتھی نے کہا۔ ''بیعت کا لفظ اگرچہ بیع یعنی بکنے سے مشتق ہے اور عام طور پر اس کا مفہوم یہی لیا جاتا ہے کہ کوئی بندہ خود کو خدا کے لئے کسی اللہ والے کے حوالے کر دے۔۔ یعنی وہ اپنی ہر بات کو کسی اللہ والے کے کہنے کے مطابق ڈھالنے کا عہد کرتا ہے۔ ہمارے یہاں اس کا مفہوم قدرے وسیع معنوں میں لیا جاتا ہے اور ہم سلوک کی منازل طے کرنے، روحانی علوم سیکھنے اور اپنی ذات اور اپنے رب کا عرفان حاصل کرنے کو ایک استادِ کامل کی شاگردی اختیار کرنے کو بیعت کہتے ہیں۔

آپ یوں سمجھیں کہ ایک بچہ حساب یا انگریزی سیکھنا چاہتا ہے۔ وہ کسی ایسے آدمی کو استاد پکڑے گا جو اُس کو حساب یا انگریزی سکھا دے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص روحانی اور باطنی علوم سیکھنا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ کسی روحانی علوم کے ماہر کو اپنا استاد بنائے گا۔ ایسے روحانی استاد کو عام زبان میں مرشد یا پیر صاحب کہتے ہیں اور شاگرد کو مرید۔'' احمد صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے اپنے ساتھی کی بات کو بڑھایا۔

''اس کا مطلب ہوا کہ آپ روحانی علوم سیکھ رہے ہیں۔ تو کیا آپ روحیں بھی بلا سکتے ہیں؟'' اُس نے سادگی سے پوچھ لیا۔

اُس کی بات سُن کر تینوں کے چہرے پر ایک تاثر سا لہرا گیا۔ وہ اُس تاثر کو کوئی معنی نہ پہنا سکا البتہ اُس کو اتنا اندازہ ہوا کہ اُس کی یہ بات سُن کر ان کو کچھ اچھا نہیں لگا۔

اس بار احمد صاحب سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے۔

"المیہ یہ ہے کہ لوگوں نے روحانی علوم کو شعبدے بازی، جادوگری اور عملِ حاضرات کے ہم پلہ قرار دیا ہوا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں لوگوں کا تو کوئی قصور بھی نہیں کیونکہ کسی نے انہیں ان میں فرق سے آگاہ بھی تو نہیں کیا۔ آپ اس کی بجائے یہ سمجھیں کہ روحانی علوم سے اصل میں کیا مراد ہے؟ روحانی علوم سے مراد وہ علوم ہیں، جو بندے کا تعلق اپنی روح سے قائم ہونے کے بعد، بندے کو حاصل ہوتے ہیں۔ ان علوم کو روحانی علوم اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ علوم خود آپ کی اپنی روح آپ کو دیتی ہے۔ ان علوم کو کسی کتاب سے، یا کسی استاد سے نہیں سیکھا جا سکتا۔ یہ علوم وہی علوم ہیں جو اللہ نے آدم کو عطا کئے تھے۔ ان ہی علوم کے حاصل ہونے پر آدم فرشتوں کے لئے مسجود قرار پائے تھے اور انسان نیابتِ الٰہیہ سے سرفراز کیا گیا تھا۔

اس مادی زندگی میں ہم روح سے دوری کے سبب ان علوم کا شعور ہی کھو چکے ہیں۔ اس لئے روحانی علوم کے حصول کے لئے سب سے پہلی شرط یہی قرار پاتی ہے کہ ہم اپنی روح سے واقف ہو جائیں۔ ہمارا تعلق خود اپنی روح سے قائم ہو جائے۔ جب ایسا ہو جاتا ہے تو انسان بقدر تعلق روحانی علوم سے آراستہ و پیراستہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جوں جوں یہ تعلق استوار اور مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے اسی قدر ان علوم میں ترقی اور اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

اپنی روح سے واقف ہونا اپنے اندر کی دنیا سے آگاہ ہونا اور باطنی علوم کا حصول یہ سب باتیں ایک دوسرے سے مربوط اور منسلک ہیں۔ ہمارے مرشد کریم نے ہمیں ہماری روح سے واقف کروانے کے لئے ہمیں کچھ اسباق بتائے

ہیں۔ ہم اُن اسباق پر اُن کی نگرانی میں عمل پیرا رہتے ہیں۔ جب ہمارا تعلق ہماری روح سے قائم ہو جائے گا، ہم روحانی علوم بھی سیکھ ہی لیں گے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ اس وقت ہمارا روح سے تعلق نہیں۔ روح سے تعلق ہی تو زندگی کی بنا ہے۔ جب تک روح اس جسم کو متحرک رکھے ہوئے ہے، ہم زندہ رہتے ہیں اور جب روح اس جسم سے اپنا رابطہ اور تعلق منقطع کر لیتی ہے ہم زندہ نہیں رہتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ روح کا جسم سے جو تعلق ہے، وہ یک طرفہ ہے۔ ہم اپنی روح کا عرفان رکھے بغیر زندہ ہیں۔ جب ہم اپنی روح کی آگہی کے ساتھ زندہ رہنا سیکھ لیتے ہیں تو یہ تعلق دو طرفہ ہو جاتا ہے۔

ہمیں اس تعلق کا جو روح کا اس جسم سے ہے، شعور اور آگہی حاصل ہو جاتی ہے، اس وقت ہم یہ جان لیتے ہیں کہ روح اس جسم کو کس طرح سے سنبھالے ہوئے ہے۔ روح اس جسم کو ایک لباس کی طرح پہنے ہوئے ہے۔ اس لباس کے اندر اصل انسان یعنی ہماری روح حرکت کرتی ہے اور اس کے نتیجے میں لباس بھی حرکت کرتا ہے۔ جس طرح لباس کی حرکت کے نتیجے میں اس جسم میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہو سکتی، اسی طرح اس جسم کی حرکات سے روح میں حرکت پیدا نہیں ہو سکتی۔ بلکہ روح کی تحریکات کے تحت اس جسم میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور افعال و اعمال سرزد ہوتے ہیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے جسم کی حرکات سے جسم پر پہنا ہوا لباس اس کے ساتھ حرکت کرنے کا پابند ہے۔ روحانی علوم ہمیں یہی باتیں تعلیم کرتے ہیں۔ ہم پہلے تو روح سے واقف ہوتے ہیں۔

جب ہماری واقفیت اس ضمن میں درجہ بدرجہ بڑھتی ہے اور جب ہم روح سے قریب تر ہو جاتے ہیں، تو وہ علوم جو روح کو حاصل ہیں، وہ علوم روح کو براہ راست اللہ تعالیٰ نے علم الاسما کے نام سے عطا کئے تھے۔ ہم علوم سے روشناس ہو جاتے ہیں۔ دراصل انہی علوم کو روحانی علوم کہا جاتا ہے۔ انہی کو باطنی علوم بھی کہتے ہیں۔ یہی وہ علوم

ہیں جن کے حاصل ہونے پر انسان دیگر مخلوقات سے ممتاز ہو جاتا ہے، اس کو وہ شرف اور فضیلت حاصل ہو جاتی ہے، جس کے لئے اس کو تخلیق کیا گیا ہے۔"

گاڑی مختلف اسٹیشنوں پر رکتی چلتی اُن کو منزل کی جانبلئے رواں دواں تھی۔ وہ احمد صاحب کی گفتگو کے تاثر میں کھویا ہوا، ان کی کہی ہوئی باتوں کا جائزہ لینے ان کو اپنے ذہن میں دہراتا اونگھ سا رہا تھا۔ جب ذہن میں سوالوں کے بلبلے ابلنا بند ہو جائیں تو ہر آدمی اپنے اندر ایک گہرا سکوت و سکون محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ کھڑکی سے باہر تیزی سے پیچھے کو دوڑتے مناظر کے حوالے سے سوچنے لگا۔ یہ سفر و حضر، یہ مسافر و مقیم، یہ جادہ و منزل، یہ سوار اور سواری، یہ ناظر اور نظارہ، سب گردش ازلی کے تحت ایک دوسرے کے تعاقب میں ہونے کے ساتھ ساتھ ہم رکاب اور ہم دوش بھی ہیں۔ ایک دوسرے کی طرف بڑھ بھی رہے ہیں اور ایک دوسرے سے گریز بھی رکھتے ہیں۔

گاڑی کا رکنا حضر تو چلنا سفر، ایک پڑاؤ سے دوسرے پڑاؤ تک کا فاصلہ جادہ اور کچھ کے لیے دوسرا پڑاؤ ہی منزل ۔ کبھی مسافر راستے پر چلتا ہے اور کبھی راستہ مسافر کو چلاتا ہے۔ کہیں مسافر راستوں میں گم ہو جاتا ہے اور کبھی راستے خود مسافر کے اپنے اندر کھو جاتے ہیں۔ انہیں پنہاں راستوں اور گم مسافتوں کی کھوج کا نام ہم کبھی سفر رکھ لیتے ہیں اور کبھی سیر۔ کب سفر ختم ہو جاتا ہے اور کہاں سے سیر کا آغاز ہوتا ہے اور کب سیر، سیر و فی الارض کے درجے کو چھو لیتی ہے۔ وہ اک عالم بے خیالی میں یہی کچھ سوچتے رات گئے تک ٹرین سے باہر اندھیروں میں مدغم مناظر کو پیچھے بھاگتے دیکھے جا رہا تھا۔ ہم آگے بڑھ رہے ہیں یا یہ مناظر پیچھے ہٹتے ہمیں آگے دھکیل رہے ہیں؟ یہ مناظر اپنی جگہ برقرار ہیں اور صرف ہم اپنی بے قراری کے ہاتھوں ان کے قرار میں شامل نہیں ہو پا رہے ۔۔ وہ سوچ نہیں رہا تھا۔ خیالات کی اک ریل چل رہی تھی۔ وہ اس کے بہاؤ میں مخل نہیں ہونا چاہ رہا تھا۔

اُس نے نگاہ کو باہر سے اندر ٹرین کے ڈبے میں کھینچ لیا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا وہ تینو ں اپنی اپنی سیٹوں پر آنکھیں بند کئے گاڑی کی رفتار اور ہچکولوں کے جھولے میں جھولتے اونگھ رہے تھے۔ اُن تینو ں کے انداز نشست میں یکسانی نے اُس کو اُن کی طرف متوجہ کر دیا۔ وہ انہیں دیکھتا رہا۔ وہ تینو ں آنکھیں بند کئے خاموش بیٹھے، اُس کے اپنی طرف متوجہ ہونے سے بے نیاز اور بے خبر بیٹھے جھولتے رہے ۔ گاڑی کی وسل کی آواز ایک جناتی کُوک کی طرح اندھیروں میں پھیلتی چلی گئی ۔ بر یکوں نے آہنیپہیوں کو اپنی آغوش میں لپٹا لیا۔ گاڑی کی رفتار دم توڑنے لگی۔ اُس وقت احمد صاحب نے قدرے آواز سے درود شریف پڑھا۔ اس کے ساتھ ہی اُن تینو ں کے جسموں میں گویا زندگی لہرا گئی۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں ۔ اُس کو اپنی طرف متوجہ پا کر انہوں نے اُس کی توجہ کی رسید اپنی مسکراہٹ کی صورت دی۔

''آپ سوئے نہیں؟'' احمد صاحب نے اُس سے دریافت کیا۔

''جی نہیں ! میں یونہی بیٹھا آپ کو دیکھتا رہا۔''

''شاید کوئی سٹیشن آنے والا ہے۔'' احمد صاحب نے اُس کی طرف سے آنے والے سوال سے بچنے کو اس کی توجہ آمدہ سٹیشن کی طرف مبذول کرنے کی کمزور سیکوشش کی۔

''جی ہاں !'' کہہ کر اس نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔ آپ تینو ں اکٹھے اونگھتے اور ایک ساتھ جاگتے ہیں۔ یہ کیا اسرار ہے؟''

احمد صاحب نے صرف اتنا کہنا کافی سمجھا۔ ''ہم مراقبہ کر رہے تھے۔''

''مراقبہ'' اُس کے نزدیک مراقبہ تو ایک نہایت دشوار اور پر تکلف عمل تھا۔ خود اُس نے کئی بار کوشش کی تھی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اُس نے ان کے سیدھے سادھے انداز کو حیرت اور استعجاب سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ مراقبہ میں کیا دیکھ رہے تھے ؟''

''ہم کچھ نہیں دیکھتے ، ہم تو بس آنکھیں بند کر کے تصورِ شیخ کا مراقبہ کرتے ہیں۔'' احمد صاحب نے کہا۔

''تصورِ شیخ کا مراقبہ ؟'' اُس نے دریافت کیا۔

''یہ کیا ہوتا ہے ؟ آپ مراقبے میں اپنے مرشد کو دیکھتے ہیں ؟''

وہ اپنے تجسس اور اشتیاق کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''اپنے مرشد کے خیال میں بے خیال ہونے کی کوشش کرتے ہیں ۔ آگے اللہ کی مرضی ، وہ چاہے تو کچھ دکھا دے نہ چاہے تو نہ دکھائے۔'' احمد صاحب نے وضاحت کی۔

وہ بات جو اُس کو مراقبہ کی بابت ڈھیروں انگریزی لٹریچر پڑھ کر بھی سمجھ نہیں آ سکی تھی ، احمد صاحب کے کہنے سے فوراً سمجھ آگئی۔ خیال میں بے خیال ہونا ، وہ اس جملے کا لطف لینے لگا۔

صبح دم جب نیند سے اس کی آنکھ کھلی تو اس نے ان تینو ں کو گزشتہ رات ہی کی طرح اپنی سیٹوں پر بیٹھے دیکھا۔ رات کو وہ اُس کے سامنے سونے لیٹے تھے۔ پھر یہ دوبارہ کس وقت بیدار ہو کر مراقبہ کرنے بیٹھے ہوں گے۔ وہ بھی اُٹھ کر ان کی نقل میں اُن ہی کی طرح بیٹھ گیا۔ آلتی پالتی مار کر اس نے آنکھیں بند کیں۔ میں کس کے خیال میں بے خیال

ہو جاؤں ، وہ سوچتا رہا۔ کبھی ایک خیال آتا اور کبھی دوسرا۔ کبھی سوچتا اس کو بھی احمد صاحب کے مرشد کی بابت مراقبہ کرنا چاہیے۔ لیکن وہ تو میرے مرشد نہیں ہیں۔

چلیں میں نے بھی سوچنا شروع کر دیا۔ اب جس کو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔۔اُس کی بابت کیسے سوچوں ، کیا سوچوں اور پھر یہ کہ کسی خیال میں بے خیال ہونا ۔۔۔ اُس کو الجھن سی ہوئی۔ اُس نے قدرے آنکھیں وا کر کے ، اپنے سامنے بیٹھے احمد صاحب کو دیکھا۔۔ وہ اُس کے اپنی نقل کرنے اور اُس کی الجھن سے بے خبر ، اپنے اندر کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے ۔ وہ بھلا کن خیالوں میں بے خیال ہوں گے ؟ وہ کیا سوچ رہے ہوں گے ؟ اپنے مرشد کے بارے میں کن تصورات میں کھوئے ہوں گے ؟

''آپ نے کسی خیال میں بے خیال ہونے کے بارے میں کیا بتایا تھا؟'' اُس نے مراقبہ ختم ہونے کے بعد احمد صاحب سے پوچھا۔

انہوں نے کہا۔''اگر آپ مراقبہ کی ابتدا کرنا چاہتے ہیں تو ابتدائی طور پر نیلی روشنی کا مراقبہ بہتر رہے گا۔ اس کے لئے آپ کو صرف اتنا کرنا ہوگا کہ آپ آنکھیں بند کر کے کمر کو سیدھا رکھتے ہوئے جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر نیلی روشنیوں کی بابت سوچنا شروع کر دیں۔ جوں جوں اس سوچ میں گہرائی آتی جائے گی آپ کو اپنے اندر ، اپنے ارد گرد کے ماحول اور گزرتے وقت کا احساس کم ہوتے ہوتے ختم ہونا شروع ہو جائے گا۔ یعنی اب آپ پر بے خیالی کی سی کیفیت طاری ہو گی۔ جب دھیان ماحول اور وقت سے ہٹ جاتا ہے تو بندے کو مراقبے کے فیوض و برکات حاصل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ جب آپ کسی خیال میں اتنے کھو جائیں گے کہ آپ کو یہ خیال بھی نہ رہے کہ آپ کیا سوچ رہے تھے ، تو اس کیفیت کو بے خیالی کی کیفیت کہتے ہیں۔ اِس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے اندر سکون اور طمانیت کا

احساس اور گہرا ہوتا محسوس ہوگا۔ جب سوچ کی لہر شعور کی سطح سے اتر کر، لاشعور کی سطح پر چلنا شروع کر دیتی ہے تو شعور فارغ ہو کر گہرے سکون کا مزہ لینا شروع کر دیتا ہے۔"

شعور اور طمانیت کے ذکر پر وہ بات جو اس کو غیر شعوری انداز میں محسوس ہو رہی تھی یک دم شعوری ادراک کی حدود میں واضح ہو کر ابھر آئی۔ احمد صاحب اور اُن کے ساتھیوں کی گفتگو سے لے کر ہنسی مذاق، مسافروں اور ٹکٹ چیکروں سے رویے، اٹھنے بیٹھنے، غرضیکہ اُن کے ہر کام میں نرم روی اور ٹھہراؤ کا اظہار ہوتا تھا۔ اُن کے تبصرے، تلخی اور تُندی سے مبرا ہی رہتے تھے۔ شعور و آگہی رکھنے کے باوجود اُن کی گفتگو میں شکووں اور شکایتوں کا رنگ مفقود ہی تھا۔ ایک دوسرے سے بے تکلفی کے باوجود رویوں میں عمومی طور پر احترام آمیزی نمایاں رہتی تھی۔ اُس کو اُن میں دھیما پن جو اچھا لگتا رہا تھا اُس کی وجہ سمجھ آ رہی تھی۔ وہ غیر حاضر لوگوں کی بابت بھی اس انداز میں گفتگو کرتے گویا وہ کہیں آس پاس ہی موجود ہوں۔ غیبت اور عیب جوئی سے خالی تذکرے۔۔۔ اُس کو اُن کی سچائی کے ثبوت ہاتھ لگنا شروع ہو گئے۔

اُس نے غور کیا اور یہ دیکھ کر اُس کو ایک عجیب سا احساس تفاخر ہوا کہ اخلاق اور حفظِ مراتب کا خیال رکھنے کی باتیں اُن کی عادتوں میں رچی ہوئی تھیں۔ اُس نے اس پر زیادہ توجہ نہ دی تھی۔ لیکن اب اُس کو اُن کی خاصیت کی وجہ کا علم ہوا تو اُس کو ایک خوشگوار احساس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جب بندے کے اندر سچ مچ کا اطمینان اور ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے تو وہ غصہ کرنے، تناؤ کا شکار ہونے، دوسروں پر تند و تیز تبصرے کرنے کو توانائی کا زیاں گردانتے ہوئے اُن باتوں سے احتراز کرنے پر کاربند ہو جاتا ہے۔ خوش مزاجی اور شگفتگی اُن کے اندر کی طمانیت کا آئینہ بن کر خوشی کے

احساس کی صورت اُن کے ارد گرد پھیلتی اور قریب آنے والوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اُس کو احمد صاحب جیسے لوگوں سے اپنے تعلق پہ فخر سا ہوا۔

وہ کراچی کے سٹیشن پر اترے تو چند خوش مزاج نوجوانوں نے خندہ پیشانی سے اُن کا استقبال کیا۔ انہوں نے اُن کو اُن کے سامان کی ہمراہی میں ایک ٹیکسی میں بٹھا کر ان کو اُن کی منزل کی جانب روانہ کر دیا۔

ٹیکسی کراچی کی مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی اپنی منزل کی طرف، راہنمائی کرنے والے، سڑکوں کے کنارے لگے بورڈوں کے قریب سے گزرتی، کراچی کی حدود سے باہر ایک نئی بستی میں داخل ہوئی۔ پہلے بلند و بالا عمارتوں کے مناظر ختم ہوئے پھر اس کھلے علاقے میں ایک منزلہ عمارتیں اور گھر شروع ہو گئے۔

شہری مناظر پہلے ایک قصباتی نظارے میں ڈھلے اور پھر محض ایک دیہاتی ماحول کی تصویر بن گئے۔ سیدھے چلتے چلتے بالآخر وہ ایک مقام پر مڑے۔ اُن کی ٹیکسی اُس دیہاتی سی بستی میں بھی نہ رُکی۔ وہ تو بس چلے جا رہی تھی۔ دو راتوں اور ایک پورے دن کے سفر کے اثرات اُن کے چہروں پر مرتسم ہو چکے تھے۔ لیکن احمد صاحب اور اُن کے ساتھیوں کے چہرے تھکن کی بجائے دبے دبے جوش سے تمتما رہے تھے۔

اُن کی ٹیکسی اس بستی سے گزرتی ایک ویرانے میں داخل ہو گئی اور دور تک پھیلی کیکر کی جھاڑیوں کے درمیان ایستادہ بڑے بڑے کھمبوں کے علاوہ اس منظر میں کسی انسانی تعمیر کا کوئی حصہ نہیں رہا تھا۔

سڑک نما راستے کے اختتام پر ایک بڑے سے بورڈ پر خوش خط بڑا بڑا لکھے ''مراقبہ ہال'' کے الفاظ اُس کو اختتامِ سفر کی نوید لگے۔

کوچۂ علم و عرفان

گاڑی اُس بورڈ کے عین سامنے اتنے قریب پہنچ گئی کہ بورڈ پر پھیلی تازہ وارنش کی چمک تقریب کی تیاریوں کا اعلان کرتی اور آنے والے مہمانوں کے استقبال میں مسکراہٹ کا تاثر دیتی محسوس ہوئی۔ وہاں سے گاڑینوے کا زاویہ بناتی بائیں مڑی تو پورا منظر ہی بدل گیا۔

یہاں سے سڑک دو رویہ ہو گئی تھی۔ بے ہنگم جھاڑ جھنکار کی جگہ ترتیب و توازن نظر کو حسن انتظام کا پتہ دے رہے تھے۔ وہی سڑک جو مڑنے سے پیشتر ایک عام سی ویران سڑک نظر آرہی تھی اب ایک حسین نظارے میں ڈھل گئی تھی۔ سڑک کے کنارے لگے درختوں اور پودوں کے ارد گرد سیمنٹ کے بلاکوں کے چونا کئے ہوئے حفاظتی پشتے اور فٹ پاتھ پر سرخ رنگ کے گملے، سبز جھاڑیوں کے پس منظر میں، مہمانوں کی تواضع کر رہے تھے۔ گملوں اور پودوں کی درمیانی جگہ پر پھولوں کی کیاریاں سڑک کے ساتھ ساتھ دور تک چلی گئی تھیں۔ گملوں میں سدا بہار اور کیاریوں میں موسم سرما کے پھول، نیلے آسمان کے پس منظر میں ایک احساس فرحت نشر کر رہے تھے۔ جنوری کی خنکصبح کی تازگی فضا میں لہرا رہی تھی۔ وہ لہراتی تازگی اور فرحت اُن کو اپنے اندر اترتی محسوس ہوئی۔

ٹیکسی ایک محراب دار آرائشی دروازے کے سامنے لگی زنجیر کے قریب جا رُکی۔ ایک نوجوان نے مستعدی سے اُن کو پارکنگ کی طرف جانے کو کہا۔ انداز میں دو ٹوک پن، لیکن لہجے میں نرمی اور شائستگی۔ ٹیکسی سیمنٹ کے بلاکوں کی دیوار کے ساتھ ساتھ بڑھتی گھوم کر ایک وسیع و عریض پارکنگ ایریا میں داخل ہوئی۔ پارکنگ ایریا میں داخلے پر زرد اور سیاہ رنگ میں رنگا ایک بانس رکاوٹ کی علامت کے طور پر نصب تھا۔ بالکل ویسا جیسا کنٹونمنٹ ایریا میں فوجی اہمیت کے داخلوں کی جگہ پر لگا ہوتا ہے۔

اُس رکاوٹ والے بانس سے بندھی رسی کے قریب کھڑے نوجوان نے آگے بڑھ کر ''اپنی شناخت کروایئے'' کی بجائے سلام کرتے ہوئے شائستگی سے اُن کو ایک مخصوص جگہ رُکنے اور سامان وغیرہ اتارنے کو کہا۔ ٹیکسی رکنے پر وہ سب اترے۔ اُس نے فضا میں صفائی اور حسنِ انتظام کی مہک رچی ہوئی محسوس کی۔ آلودگی سے پاک ہوا میں گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے وہ ٹیکسی سے سامان اتارنے کی طرف متوجہ ہوا۔ ٹیکسی ایک ایسی جگہ کھڑی تھی جہاں سے اُس کے تین اطراف گہرے سبز رنگ کے شامیانے اور قناتیں لگی ہوئی تھیں۔

ٹیکسی کو فارغ کر کے احمد صاحب اُن کو وہیں سامان کے پاس رکنے کا کہہ کر ایک صاحب کے ہمراہ استقبالیہ کی طرف چلے گئے۔ استقبالیہ کھڑکی پر کافی رش تھا۔ احمد صاحب کو کھڑکی سے کچھ فارم وغیرہ دیئے گئے۔ وہ فارم لے کر اُس کے پاس آئے۔ سب کان پتے لکھ کر فارم بھر کر رجسٹریشن فیس کے ہمراہ واپس اسی کھڑکی میں جمع کروانے کے بعد انہیں ایک پرچی دی گئی۔ اُس پرچی پر ان کے شامیانے نما کمرے اور بستر کا نمبر لکھا ہوا تھا۔ اپنی لئے مختص کردہ جگہ پر پہنچ کر انہوں نے اپنا اپنا بستر لگایا سامان رکھا اور بیٹھ گئے۔ احمد صاحب اُس کو بتا رہے تھے کہ بیرونِ شہر اور دیگر ممالک سے آنے والے مہمان اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت عرس کے پروگراموں کے انتظامات کی مد میں حصہ بٹانے کو فی کس کچھ رقم دیتے ہیں۔ عموماً ہر مہمان چار پانچ دن وہاں رُکتا ہے۔

اس نے اس بات کا لطف لیا کہ احمد صاحب زائرین کے لئے مہمان کا لفظ استعمال کر رہے تھے۔ استقبالیہ تک آنے جانے کے دوران کئی افراد اُن سے ملے۔ اجنبی ہونے کے باوجود اُس کو محسوس ہوا کہ اُن سب کے انداز میں گرم جوشی اور خوشی کا تاثر نمایاں تھا۔ اُن میں کچھ کے سینوں پر بیج آویزاں تھے جن پر اُن کا نام اور شہر کا نام لکھا ہوا تھا۔

کارکنوں اور مہمانوں کے کارڈوں کے رنگ میں فرق تھا۔ انتظامی امور کے حوالے سے اُن کے کارڈوں پر اُن کے نام کے علاوہ اُن کا شعبہ بھی لکھا ہوا تھا۔

شامیانوں اور قناتوں سے بیس بائیس کمرے سے بنا دیئے گئے تھے۔ ہر کمرہ کسی ایک شہر کے مہمانوں کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ اُس کو اس سارے انتظام کا یہ انداز متاثر کن لگا۔ شامیانوں میں زمین پر پرال بچھا کر اُس کے اوپر دریاں بچھائی ہوئی تھیں۔ اُن رہائشی کمروں کے درمیان صحن نما کھلی جگہ پر پھولوں کے گملے سلیقے سے دائرے میں لگا کر اُس جگہ کو خوبصورت اور جاذب نظر بنا دیا گیا تھا۔

وہاں آنے والے مہمانوں میں خواتین اور بچوں کی تعداد کسی طور مردوں کی تعداد سے کم نہ تھی۔ مراقبہ ہال کی مشرقی دیوار سے متصل کھلی جگہ میں جو شامیانے اور قناتیں لگائی گئی تھیں وہ خواتین کے لیے مختص تھیں۔ مراقبہ ہال کے سامنے کھلے میدان میں شامیانوں اور قناتوں سے ایک وسیع و عریض ہال میں اسٹیج لگایا جا رہا تھا۔ کرسیاں رکھی جا رہی تھیں۔ یہ آڈیٹوریم ہے۔ عرس مبارک کے پروگرام کے سلسلے کی تقریریں، مقالے، ورکشاپ اور مختلف میٹنگیں وغیرہ سب اسی جگہ ہوں گی۔' احمد صاحب نے اُس کو بتایا۔

ورکشاپ۔۔۔؟ کیسی ورکشاپ؟ ابھی یہ سوال اُس کے ذہن میں آیا ہی تھا کہ احمد صاحب بتانے لگے کہ روحانی موضوعات میں سے کسی ایک دو موضوعات پر، گروہ در گروہ اجتماعی غور و فکر کرنے کا انتظام کیا جاتا ہے اُس کو ورکشاپ کہتے ہیں۔ اس کاروائی کا بنیادی مقصد شرکائے ورکشاپ کو غور و فکر پر ابھارنا ہوتا ہے۔ موضوع کے حوالے سے، ہر شریک ہونے والے کے علم میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور وہ تہہ در تہہ ذہنوں میں راسخ بھی ہوتا چلا جاتا ہے

کیونکہ یہ ورکشاپ پورا دن چلتی ہے۔ اس سے کم از کم پورا دن توجہ اُسی ایک موضوع پر مرکوز و مرتکز رہتی ہے۔ اس سے لوگوں میں غور و فکر کا پیٹرن بنانے اور اُس کو ابھارنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ آپ بھی اُس میں ضرور حصہ لیجئے۔

آڈیٹوریم کے گیٹ کے سامنے راستے کی دوسری طرف شامیانوں میں چند اسٹال لگائے جا رہے تھے۔ وہ ٹہلتا ہوا اُن اسٹالوں کی طرف چلا گیا۔ ایک سٹال کتابوں کے لئے مختص تھا۔ ایک سٹال شعبہ تعلقات عامہ کے لئے تھا اور اسٹال میں مختلف شہروں کے مراقبہ ہالز کی کارکردگی کی تصویری جھلکیاں آویزاں کی جا رہی تھیں۔ ایک اسٹال میں چائے اور مشروبات کا سامان رکھا جا رہا تھا۔

مراقبہ ہال کے عین سامنے کھلے راستے کے اختتام پر کچھ افراد سیمنٹ کے بلاکوں سے کچھ تعمیر کر رہے تھے۔ آیئے میں آپ کو یہاں کی مسجد دکھاؤں۔ احمد صاحب نے اُس کو دعوت دی۔ وہ اُن کے ہمراہ ہو لیا۔ رہائشی شامیانوں کے پہلو میں ایستادہ قناتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ یہ یہاں کا ڈائننگ روم ہے۔ اتنا بڑا ڈائننگ روم؟ اس نے حیرت آمیز استعجاب سے کہا۔ ہزار بارہ سو افراد کو ایک ہی وقت کھانا کھلانے کے لئے کیا اس سے کم جگہ میں گزارہ ہو سکتا ہے؟ احمد صاحب نے جواب میں سوال داغ کر کہا۔ یہ کھانا لنگر سے مہیا کیا جاتا ہے۔ ناشتہ دوپہر کا کھانا، شام کی چائے اور رات کا کھانا، یہ تمام انتظامات مراقبہ ہال کے کارکنان، خدمتِ خلق کے جذبے سے، فری سروس کے طور پر کرتے ہیں۔

مسجد کے احاطے میں وضو خانے سے متصل دور رویہ بیس بائیس باتھ رومز دیکھ کر نہ جانے اُس کو اچنبھا سا کیوں ہوا۔ کھلی فضا، روشن ماحول میں نیلے رنگ کے دروازے اور صفائی کا اتنا اعلیٰ معیار دیکھ کر اُس کے ذہن میں

موجود عوامی قسم کے بیت الخلا اور حمام سے متعلق تصورات پہ اک چوٹ سی پڑی۔ وہ سادگی سے کئے جانے والے انتظامات میں حسن انتظام کی فراوانی کو دل ہی دل میں سراہتا آگے بڑھ گیا۔

مسجد کے پہلو اور مغربی سمت میں لان میں طرح طرح کے پھول مہمانوں کی پذیرو ئی کو لہراتے ہوئے لگ رہے تھے۔ لان زمین کی سطح سے دو تین فٹ بلند ہونے کے باعث زمین پر کھڑے لوگوں کو اک وسعت نظارہ عطا کر رہا تھا۔ پھولوں کو دیکھتے دیکھتے وہ درختوں کی روکار کے پیچھے شامیانوں اور قناتوں کا اک آباد ہوتا شہر دیکھنے لگا جو اُس فاصلے سے اُس کو اک پسِ منظر کی طرح لگ رہا تھا۔ ''نہ جانے کہاں کہاں سے اہلِ دل اور اہلِ نظر اس شہر نگاراں کو آباد کرنے آئیں گے ؟''اس نے سوچا

مسجد میں داخل ہو کر اُس کو پہلا احساس کشادگی اور سادگی کا ہوا۔ ترتیب اور سلیقے کی فراوانی نے سادگی کو حسن سے آراستہ کیا ہوا تھا۔ کشادہ محراب کے اندر بلند کھڑکیاں اور روشندان ، محراب کے دونوں طرف کی مغربی دیوار کے ساتھ ساتھ شمالی اور جنوبی دیواروں میں اونچی اور چوڑی کھڑکیاں ، مسجد کے ہال کو وسعت ، روشنی اور تازہ ہوا کی فراہمی کی ضمانت عطا کر رہی تھیں۔ ہال میں دور ویہ قطار میں ستونوں کا حجم پائیداری اور مضبوطی کے ساتھ ساتھ رعب اور دبدبے کا غماز تھا۔ مسجد میں صبح کے وقت کی تازگی ،اُس کے نئے پن کی خوشبو کے ساتھ مل کر ایک طراوت کو جنم دیتی لگی۔ اُس نے ہال کی مغربی جانب کی ایک کھڑکی سے نظر باہر دوڑائی۔ نظر پھولوں کی کیاریوں کے اوپر سے ہوتی درختوں کی روکار سے گزرتی ، شامیانوں اور قناتوں کو چھوتی سمتِ کعبہ دور کہیں افق تک جا پہنچی۔

مسجد کے بر آمدے میں بچھی پلاسٹک کی رنگین چٹائیوں پر چند لوگ نیم دائرہ بنائے، خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ شگفتگی اور مسکراہٹیں اُن کے لہجوں سے ہی نہیں بلکہ اپن کے چہروں اور وجود سے بھی مترشح تھی۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ بھی اُن کی محفل میں جا گھسے لیکن خود کو اجنبی گردانتے ہوئے اُس نے خود کو اس مداخلت بے جا سے روکا۔

بر آمدے کے جنوب مشرق میں، صحن مسجد میں قناتوں کی اوٹ میں سرگرمی اور چہل پہل نے اُسے ادھر متوجہ کیا۔ وہ ٹہلتے ہوئے اُدھر کو چل دیا۔ دیکھا کہ پانچ چھ افراد سینوں پر بیج آویزاں کئے، برتن دھونے کے لئے پانی گرم کرنے سے لے کر، برتن دھو کر اُن کو پونچھنے تک کے کاموں میں تقسیم کار کے اصول کے تحت مستعدی سے عمل پیرا تھے۔ ایک صاحب نے اُس کے ذوق تماشا کی داد دینے کو اُسے بتایا۔ یہ ہمارا ڈش واشنگ ایریا ہے۔

وہاں سے مراقبہ ہال کی طرف جاتے ہوئے مسجد سے متصل گراؤنڈ جس میں مہمانوں کی رہائش کا انتظام تھا، وہاں ایک پختہ کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ یہاں کا رابطہ آفس ہے۔ باہر جھولتے کاغذی طغرے نے اطلاع دی۔ کمرے میں چند میزیں پڑی تھیں۔ میزوں پر پڑی سفید چادروں اور اُن پر دھری سفید فائلوں، کمرے کے دفتری ماحول میں بھی ایک پاکیزگی سی رچی ہوئی تھی۔

وہاں موجود افراد انتظامی امور کی دیکھ بھال، مختلف شعبوں کے اراکین کے مابین رابطے اور ہم آہنگی کے لیے کام کرنے کے ساتھ ساتھ مہمانوں کی ضروریات کی دیکھ بھال اور اُن کے لیے مختلف امور کی انجام دہی، اُن کے لیے مختلف پیغامات کی ترسیل اور اعلانات میں مصروف تھے۔ اس کا رابطہ انٹرکام کے ذریعے استقبالیہ اور مرکزی دفتر سے جڑا ہوا تھا۔ وہاں بیٹھے ایک صاحب نے انہیں بتایا کہ وہ ساڑھے گیارہ بجے مرشد کریم سے مل لیں۔ احمد صاحب اور اُن کے ساتھیوں سمیت خود اُس کے چہرے پر اس اطلاع سے ایک تاثر لہرا کر رہ گیا۔ خوشی اور جوش کے ساتھ ساتھ توقع

اور اُمید کا تاثر۔ خود اس کو مزید ایک گھنٹہ انتظار کرنا برا نہ لگا۔ وہاں بیٹھ کر وہاں پر موجود لوگوں کو کام کرتے دیکھتا اور اُن کو باتیں کرتے سنتا رہا۔

احمد صاحب کسی دوسرے شہر سے آئے ہوئے مہمانوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے انہی کے ساتھ ان کے کمرے کی طرف چل دیئے۔ اور ادھر ادھر ٹہلنے لگا رابطہ آفس کے ساتھ ہی دیوار کے ساتھ لگی قناتوں اور شامیانوں کو مختلف اسٹالوں اور دکانوں کے لئے مختص کیا گیا تھا۔ ان میں کینٹین، دھوبی، جنرل مرچنٹلا کی دکان کے علاوہ ایک ڈسپنسری بھی بنائی گئی تھی۔ اس ڈسپنسری میں ہومیو پیتھک اور ایلو پیتھک کے ساتھ ساتھ طب یونانی کے حکیمانہ علاج کی سہولت بھی فراہم کی گئی تھیں۔ وہ ان چیزوں کو دیکھنے میں کھویا ہوا تھا کہ ایک بس وہاں آکر رکی۔ اس میں سے تیس افراد برآمد ہوئے۔ اُس قافلے میں عورتوں اور مردوں کے علاوہ مختلف عمروں کے بچے بھی کافی تعداد میں تھے۔ بس کی پیشانی پر لگے بورڈ کی تحریر سے معلوم ہو رہا تھا کہ یہ قافلہ پنجاب کے صدر مقام لاہور سے آیا ہے۔

بس سے اترنے والوں نے اپنا اپنا سامان اُتارا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس قافلے کے دو حصے ہو گئے۔ مرد حضرات اپنا اپنا سامان لے کر رہائش کے مردانہ حصے اور عورتیں اور چھوٹے بچے زنانے رہائشی حصے میں منتقل ہو گئے۔ وہ ایک بے خیالی کے عالم میں کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اُس کو اس بڑھتے ہوئے ہجوم میں بھیڑ بھاڑ کی بجائے اسے رونق اور چہل پہل زیادہ نمایاں لگی۔ اس چہل پہل میں بھی ایک گہرے نظم و ضبط، ترتیب اور سلیقے کا احساس ہو رہا تھا۔ تہذیب اور شائستگی کا تعلق حسنِ اخلاق سے بڑھ کر اُس حسن انتظام سے جڑا ہوا ہوتا ہے جس میں ذوق ترتیب اور سلیقہ شعاری نمایاں ہو۔

بعد میں اُس کو معلوم ہوا کہ نظم وضبط اور صفائی کو بر قرار رکھنے میں استقبالیہ ، انتظامیہ ، صفائی ستھرائی اور سیکورٹی کے عنوانات کی کئی ایک کمیٹیاں بنائی گئی تھیں اور پھر ہر کمیٹی ذیلی کمیٹیوں اور مختلف اوقات کے لئے مختلف افراد پر تقسیم کر کے ایک مستعد اور فعال تنظیم کی صورت میں ترتیب دیئے گئے تھے ۔ دیکھنے والوں کو حسن انتظام کا احساس تو تھا لیکن اس حسنِ انتظام کے پیچھے کس قدر محنت ، غور و فکر اور حسن تدبیر کا دخل تھا اس کا احساس کم ہی لوگوں کو ہوتا ہے۔

جب احمد صاحب نے اُس کو مراقبہ ہال کے اندر چلنے کو کہا تو اُس کو احساس ہوا کہ اُس کو وہاں کھڑے ایک گھنٹہ بیت چکا ہے۔ اُس کو وقت گزرنے کا احساس کیوں نہیں ہوا؟ اُس نے سوچتے ہوئے قدم بڑھائے۔ وہاں کے ماحول کی خوبی کہیئے ، صفائی اور حسن و جاذبیت کہیئے ، اُس کو اتنے طویل سفر کے بعد کی تھکن کے باوجود اپنے اندر کسی قسم کی بیزاری یا اکتاہٹ کا شائبہ تک نہیں ہو رہا تھا۔ اُس نے خود کو اُس پورے ماحول کا ایک حصہ محسوس کیا۔ وہاں اجنبی ہونے کے باوجود وہ خود اجنبی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ وہاں کام کرنے والوں یا مختلف شہروں سے آئے ہوئے افراد کے چہروں پر اجنبیت اور بے گانگی کی بجائے اپنائیت اور انسیت کی ایک غیر محسوس سی روشنی پھیلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

مراقبہ ہال کے بغلی گیٹ سے قدم اندر رکھتے ہی خوبصورتی اور شادابی کی ایک لہر موج بن کر اُس کی نگاہوں کے زینے اترتی اُس کے پورے وجود کو سیراب کرتی چلی گئی۔ گیٹ سے اندر کے منظر میں کچھ ایسی بات تھی جس نے اُس کو مبہوت کر کے رکھ دیا۔ نگاہوں کے سامنے جو بھی چیزیں تھیں۔۔۔ عمارتیں ، دیواریں پودے اور درخت اور وہاں چلتے پھرتے ، بیٹھے اور کھڑے افراد میں کوئی خاص بات نہ ہونے کے باوجود۔۔ وہ سب مل جل کر جو نظارہ پیش کر رہے تھے وہ ایک ماورائیت اور تقدیس میں ڈھلا ہوا لگ رہا تھا۔ اُس کے احترام میں جوتے اتارنے کے لئے اُس کو کسی

ترغیب کی ضرورت نہ تھی۔ نفاست سے لبریز اُس صاف ستھرے منظر میں جوتوں سمیت داخل ہونے کی اجازت خود اُس کا اپنا ذوقِ سلیم اجازت دینا گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ جوتے اتار کر گیٹ کے قریب بنے ہوئے خانوں میں رکھ کر وہ آگے بڑھے۔

داخلہ گیٹ کے دائیں جانب بنے ایک دو کمرے استقبالیہ دفتر کے طور پر استعمال ہو رہے تھے۔ گیٹ کے بائیں جانب ایک طویل برآمدے اور چند کمروں کی عمارت کے پیشِ نظر کے طور پر ایک قطعہ ارضی میں گل داودی کے مختلف رنگ توجہ میں اپنے رنگوں کی بہار داخل کر رہے تھے۔ گل داودی کی پوری کیاری جمالیاتی حسن انتظام کا ایک نہایت نفیس اظہار لگی۔ گیر معمولی طور پر بڑے اور جسیم پھُولوں کے وزن کو شاخِ نازک کے سرے پر قائم اور ایستادہ رکھنے کا ایسا انتظام کیا گیا تھا کہ پھول سیدھے بھی رہیں اور دیکھنے والوں کی نگاہ اُس انتظام پر بھی نہ پڑے۔

اس سے پیشتر اُس نے یہ پھول ہمیشہ گملوں میں ہی دیکھے تھے اور وہ بھی اکثر سرکنڈوں کی روکار کے سہارے۔ اُس کیاری کے پسِ منظر میں موجود عمارت کے آٹھ کمرے اور اُن کے آگے ایک طویل برآمدہ جس کا فرش زمین سے اونچا نگاہوں کی سطح کے مقابل گول گول سفید ستونوں کے حصار میں چمک رہا تھا اور اُس پر کوئی گرد بھی نہ تھی۔ برآمدے کے ساتھ ساتھ چلنے والا راستہ فرش برآمدہ سے تین ساڑھے تین فٹ نیچا تھا اس کے سامنے لان مزید ایک ڈیڑھ فٹ نشیب میں تھا۔ راستے اور لان کی حد بندی کرنے والے بوگن ولا کے چھتری نما درختوں کی قطار۔ ایک برآمدے کے سفید ستون، درمیان میں سیمنٹ رنگ فرشی راستہ اور دوسری طرف بوگن ولا کے پودے سرپہ سرخ، سفید اور زرد پھولوں کے تھال اٹھائے، سرِ راہ کھڑی اُن کنیزوں کی تمثیل لگ رہے تھے جو دور دیسیوں سے آنے والے مہمانوں کی پذیرائی کو چشم براہ ہوں۔

مین گیٹ سے پندرہ بیس فٹ آگے بائیں طرف راستے سے دس بارہ فٹ ہٹ کر لان کے کنارے پہ ایک کمرہ سا بنا ہوا تھا۔ اس کمرے تک ایک ذیلی راستہ تھا۔ چونا کئے ہوئے سیمنٹ کے بلاکوں سے بنی ہوئی روزن دار دیواروں کے اوپر سرخ مخروطی چھت کے سبب یہ کمرہ کٹیا کا جدید ایڈیشن لگ رہا تھا۔ سندھی تہذیب کی آئینہ دار ہالہ ٹائلوں سے سجے کمرے کے دروازے کے اوپر لکھے ایک لفظ ''آستانہ'' نے پھیل کر اُس کے شعور کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

اُس نے سوالیہ انداز میں احمد صاحب کو دیکھا۔ احمد صاحب اُس کو لے کر آستانے کی طرف بڑھے۔ قدم لیتے ہی اُس کو اپنے پیروں تلے پتھر چبھنے کا احساس ہوا۔ اُس نے نیچے نگاہ کی۔ آستانے کے دروازے تک راستہ تین حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلے حصے میں پتھریلی بجری کی ایک کیاری۔ پھر سیمنٹ کا فرش جس کے پہلے حصے میں ایک دائرے کے اندر مثلث بنی ہوئی تھی اور دوسرے حصے میں مختلف رنگوں سے تین دائرے پینٹ کئے گئے تھے۔ فرش پر بنی ان اشکال کی معنویت کو اس کا شعور اپنی گرفت میں نہیں لے سکا۔ وہ محض خوبصورتی کے لئے تو وہاں نہیں بنائے گئے ہوں گے ؟ اُس کو اُن میں حسن و جمالیات سے زیادہ کسی مفہوم اور حکمت کی رمز پنہاں لگی۔ بجری کے پتھر وہاں آنے والوں سے شاید یہ بات کہہ رہے تھے کہ سلوک کی راہوں میں قدم قدم انہی پتھروں پہ سفر کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر یہ بات مان لی جائے تو اس کا مطلب تو یہ بنتا ہے کہ سلوک کی راہوں پر تو بالکل نہیں چلنا چاہیے۔

اُس کے ذہن میں ایک خیال آواز بن کر سنائی دیا۔۔''آستانے کا راستہ زندگی کے سفر کی تمثیل ہے۔ اللہ سے دوری نوکیلے پتھروں کی چبھن سے کم نہیں ہوتی۔ جانوروں کی سطح پر زندگی بسر کرنے والوں کو ان کی چبھن کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اس سے اگلی سطح پہ انسان لاشعور سے متعارف ہوتا ہے اور اُس کو لاشعور اپنے ارد گرد ایک دائرے کی

طرح محیط نظر آتا ہے اور اس سے اگلی منزل پہ لاشعور لہر در لہر، دائرہ بعد دائرہ اُس کی زندگی کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔"

دائرہ میں گھری مثلث کے پاس پہنچنے سے پہلے بجری کی چبھن کا تجربہ اور اس کے بعد تین دائروں کے مرکز میں کھڑے ہو کر اُس نے کمرے میں داخل ہونے کے لئے دروازے کے اپنی طرف کے پٹ پر ہاتھ رکھا۔ لکڑی کا ایک نازک سا جالی دار آدھا دروازہ۔ دروازہ سطح زمین سے ایک آدھ فٹ بلند شروع ہو کر اپنی مکمل قامت کی بجائے عین درمیان ہی میں مکمل ہو گیا تھا۔ یہ نیم در اپنی ساخت کی طرح اپنے مفہوم میں نامکمل نہ تھا۔ ادھورے پٹ سپرنگ کی وجہ سے دونوں طرف کھل کر واپس اپنی جگہ آ سکتے تھے۔ دروازے کے اوپری حصے کے نہ ہونے کے سبب نہ تو اندر کا منظر دیکھنے میں کوئی رکاوٹ تھی اور نہ ہی وہ کسی کو داخل ہونے سے روکنے کا کوئی کنایہ۔ نچلا موجود حصہ بھی جالی دار ہونے کے سبب دروازے کا ایک تاثر ہی دے رہا تھا۔ دعوتِ نظارہ اور اذنِ داخلہ دونوں کا داعی۔

اُس نے باہر کھڑے کھڑے نیم دروازے کے اوپر سے اندر جھانکا۔ سامنے دیوار پر آویزاں ایک تصویر نے اُس کے شعور کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ آستانے کے اندر داخل ہو کر وہ اسی تصویر کو دیکھتا رہا۔ صاحب عکس ایک گہرے سنجیدہ تاثر کے ساتھ سرو قامت ایستادہ ۔۔۔ کہیں دور خلاؤں میں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، سر اور ڈاڑھی کے خشخشی بال، گردن کا سیدھا پن، بازو پر بندھا ایک تعویذ ۔۔۔ بظاہر اُس عکس میں جاہ و جلال کے تاثر کا کوئی قرینہ نہ تھا مگر پھر بھی اُس کو وقار اور دبدبے کے احساس نے اپنے رعب میں لے لیا تھا۔

تصویر کے نیچے لکڑی کی پالش شدہ تختی پر اُبھرے ہوئے پیتل کے سنہرے حروف سے لکھے "ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے الفاظ نے اپنی معنویت کی چمک سے اُس کے شعور کو خیرہ کر دیا۔ فوری طور پر اُس کو نہ تو کچھ

محسوس ہوا اور نہ ہی معلوم۔۔۔ پھر واقفیت اور آگاہی کی ایک لہر اس کے اندر رفتہ رفتہ بلند ہوتی چلی گئی۔ تو یہ ہیں حضور قلندر بابا اولیاؒ۔۔۔اُس کے ساتھ ہی اُس کے اندر کا سکوت اور جمود دونوں ہی ٹوٹ کر بکھرتے چلے گئے۔۔ رعب کا ایک انوکھا احساس اُس کے رگ و پے کو اپنی گرفت میں لیتا چلا گیا۔

وہ وہاں فرش پہ بیٹھ گیا۔ اُس کے ذہن میں بننے والے سوچوں کے دائرے بننا بند ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں اُس کی پلکیں خمار آلود ہو کر بند ہونے لگیں۔ وہ کمر سیدھی کئے ، آنکھیں بند کئے وہاں مودب ہو کر بیٹھا رہا۔ وہ کچھ بھی تو نہیں سوچ رہا تھا۔ اُس کو سکون اور طمانیت کا ایک گہرا احساس اپنے اندر اترتا اور اپنے رگ و پے میں سرایت کرتا محسوس ہو رہا تھا اور وہ اُس جانفزا احساس میں ڈوبے رہنا چاہتا تھا۔

صاحبِ نکتہ فشاں

آستانے کی دیواروں میں طاق نما روزن باہر کے مناظر کو کمرے کے اندرونی ماحول کا ایک حصہ بنائے ہوئے تھے، کمرے میں پھیلی اگربتی اور پھولوں کی خوشبو شامہ کی تواضع کے علاوہ حواس میں لطافت گھول رہی تھی۔ سامنے کی دیوار پر تصویر نیچے جلی حروف میں ''ابدال حق حسن اخریٰ محمد عظیم برخیاء المعروفحضور قلندر بابا اولیاءؒ لکھا ہوا تھا۔ باقی دیواروں پر بھی چند فریم آویزاں تھے۔ ایک فریم میں حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا شجرہ نسب، دوسرے میں اُن کی نسبتِ فیضان کی تفصیل اور دیگر تمام فریموں میں اُن ہی کی ایک ایک رُباعی سیاہ روشنائی سے خوشخط لکھی ہوئی تھی۔ چھت پر زرق برق چمکتی لڑیاں ہوا کے دوش پر لہراتی سجاوٹ کے علاوہ خوشی کے تاثر کو دوچند کر رہی تھیں۔ اس خوشی میں ایک عجب سا دبا دبا احترام و تقدس اُس کو اُس کے وجود سے باہر چھلکنے سے روکے ہوئے تھا۔ اس سے وہ مسرت اپنے بے تکے اظہار کی بجائے اس کے رگ و پے میں دور کرتی اس کو گدا گدا رہی تھی۔

یہ سب کچھ اُس کے ذہن میں موجود آستانے کے روایتی تصور سے بہت ہی مختلف تھا۔ مختلف کہاں برعکس تھا۔ رباعیات کی معنویت، اندازِ بیان کی سلاست اور مفہوم کے اچھوتے پن کے ساتھ ساتھ ذہن میں اُس فکر انگیز گہرائی کو جنم دے رہی تھی جو تلاشِ عرفان میں ایک زادِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ رباعی کے مفہوم سے لطف لیتے لیتے کہیں دور نکل گیا۔ اس کی نگاہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی تصویر سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کو اچانک یوں محسوس ہوا کہ تصویر میں موجود چہرے پر مسکراہٹ سی پھیل گئی ہو۔

آستانے کے اندر بچھے دبیز قالین پر بیٹھے وہ اُس تصویر کو دیکھے جا رہا تھا۔ اُس عطر بیز ماحول میں کچھ ایسی بات تھی کہ اس کو خواب آور خمار آنے لگا۔ آنکھیں مندنے اور پلکیں بوجھل ہونے لگیں اور وہ گرد و پیش سے بے خبر ہوتا

چلا گیا۔ نہ جانے وہ کتنی دیر اس حال میں گرد و پیش سے ہی نہیں خود اپنے آپ سے بھی بے خبر وہاں بیٹھا رہا اور نہ جانے کب تک بیٹھا ہی رہتا کہ کہیں دور ایک مدھر سی گھنٹی بجی۔ گھنٹی کی سریلی آواز سن کر وہ لاشعوری حواس سے نکل کر شعور میں واپس پلٹ آیا۔ قریب بیٹھے احمد صاحب سے آنکھیں چار ہوئیں۔ اُنہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس سے پوچھا ۔'' چلیں ؟'' اُس نے ایک معمول کی طرح اثبات میں سر ہلا دیا۔

آستانے سے باہر نکل کر بائیں طرف احمد صاحب کے مرشد کریم کا کمرہ تھا۔ اپنی بناوٹ میں وہ ایک سادہ سا کمرہ تھا۔ اس کے دروازے پر چق پڑی ہوئی تھی۔ کمرے کی کھڑکیوں پر بھی چقیں گری ہوئی تھیں۔ وہ چق اٹھا کر کمرے کے اندر داخل ہوئے۔ وہاں تین چار افراد ، سلیقے سے بچھے قالین پر ادب سے اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ اُن کے بیٹھنے سے ایک نیم دائرہ سا بنا ہوا تھا۔ اُس دائرے کے مرکز میں بیٹھے وہ صاحب اُس کو بالکل بھی اجنبی نہیں لگے۔ اُس نے اُن کی تصویر دیکھی ہوئی تھی لیکن اُس کو یہ شناسائی اس سے بہت بڑھی ہوئی لگی۔ ان کے اندر داخل ہونے پر مرکزِ حلقہ سے مسکراہٹ کی ایک لہر اٹھی اور پورے کمرے کو بھرتی چلی گئی۔ چہرے پر مسکراہٹ سے زیادہ معصومیت اور بچپنے کی تازگی لئے وہ بزرگ صورت صاحب فرش پر ہاتھ رکھ ٹیک کر اٹھے اور اپنی جگہ کھڑے ہو کر اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ سفید صدری کے اوپر ململ کے کُرتے اور لٹھے کی شلوار میں ملبوس میانہ قامت ، سفید خشخشی داڑھی ، نیم وا آنکھوں ، کشادہ اور روشن ماتھے والے وہ صاحب اُس کو دلپذیر لگے۔

جب احمد صاحب اُن سے گلے ملنے آگے بڑھے تو اُس کو کچھ یوں لگا گویا احمد صاحب کچھ سکڑ سے گئے ہیں۔ ڈیل ڈول میں قدرے جسیم ہونے کے باوجود اُس وقت وہ اُس کو اپنے باپ کے سینے سے لگے ایک چھوٹے سے بچے کی

مانند لگے۔ اُن کے اندازِ معانقہ میں عقیدت، بے تکلفی، احتیاط، پیار، والہانہ پن اور بے ساختگی کچھ اس طرح سے گھلے ملے ہوئے تھے کہ وہ تمیز ہی نہیں کر پا رہا تھا کہ کس جذبے کا رنگ نمایاں ہے۔

احمد صاحب اپنے مرشد سے گلے مل کر ہٹے تو اُسی شفقت اور دھیمے پن سے انہوں نے اُس کو بھی اپنے سینے سے لگا لیا۔ جب وہ اُن سے گلے ملنے کو آگے بڑھ رہا تھا تو اُس کے لیے یہ محض ایک رسمی سی بات تھی لیکن ان سے گلے ملتے ہی اُس کو گرم جوشی، محبت اور پیار کی فراوانی کا ایک ایسا احساس عطا ہوا جس سے اس سے پیشتر اُس کا سابقہ کبھی نہیں پڑا تھا۔ اس کو یوں محسوس ہوا کہ سکون اور ٹھہراؤ، بے سکون اور قرار نا آشنا لوگوں کو کسی برقی روہی کی مانند جھٹکا بھی دیتے ہیں۔

وہ اُن سے مل کر ہٹا تو اُس کو اپنے اندر کسی اعزاز سے نوازے جانے پر فخر کی سی کیفیت اُبھرتی محسوس ہوئی۔ غیر محسوس طور پر اس کی گردن تن سی گئی۔ احمد صاحب نے فرش پر بیٹھ چکنے کے بعد اُس کا تعارف کرواتے ہوئے اُن کو بتایا۔ ''انہوں نے آپ کی تمام کتابیں پڑھی ہیں اور آپ سے ملاقات کا اشتیاق رکھتے تھے۔'' سر جھکائے ہوئے انہوں نے یہ بات سُنی اور سُن کر سر اُٹھایا۔ ان کے پتلے پتلے ہونٹوں پر مسکراہٹ مزید نمایاں ہو گئی اور کہا۔

''اجی کرتا تو سب اللہ ہی ہے۔ نام اپنے بندے کا کر دیتا ہے۔''

اس سے ملتے جلتے فقرے اس نے زندگی میں کئی بار سُنے تھے لیکن جس انداز میں یہ بات آج کہی گئی تھی وہ انداز اُس کے لیے نیا تھا۔ اس انداز میں کہی جانے والی بات میں آگہی، یقین اور خلوص شامل تھا۔ اُس نے سوچا کہ اگر میں اس فقرے کی بابت اپنی ذات کے حوالے سے سوچوں تو بھی یہ بات درست ہی ہو گی کیونکہ میرا یہاں موجود ہونا اللہ ہی کا کرنا ہے لیکن نام میرا ہی ہو گیا کہ میں ان سے ملنا چاہ رہا ہوں۔ جملے کی گہرائی اور ہمہ جہتی پن نے اس میں جو

بلاغت پیدا کر دی تھی وہ اپنی سلاست اور فطری پن کے سبب اُس کو اور بھی بھلی لگی۔ اُس نے سوچا کہ واقعی کرتا تو اللہ ہی ہے اور نام بندوں کا کر دیتا ہے۔ اس فقرے کو اس نے جتنی بار بھی ذہن میں دُہرایا ہر بار اس کو ایک نیا ہی لطف آیا۔

خاموشی کے اُس وقفہ کو وہاں بیٹھے ایک صاحب نے ایک سوال پوچھ کر اختتام بخشا۔۔ وہ بہت دور کی کوڑی لائے تھے۔ انہوں نے سوال پوچھا۔

"صاحب جب سب کچھ اللہ ہی کرتا ہے اور انسان اُ کے سامنے مجبورِ محض ہے تو پھر جہنم اور سزا کیسی؟

سوال کے اختتام اور علمِ لدُنی سے آراستہ بندے کی طرف سے جواب آنے کے دو چار سیکنڈ کے مختصر سے وقفے میں فلسفہ جبر و قدر پر پڑھی گئی، سُنی ہوئی ہر بات اُس کے ذہن میں تازہ ہوتی چلی گئی۔ اس کی نگاہیں، اپنے سامنے بیٹھے ہوئے، سر کو جھکائے، بات کو پوری توجہ سے سننے والے بندے کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ ان کے چہرے پر پھیلی معصومیت اور مُسکان سے اس کو کچھ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ اس پیچیدہ مسئلہ کی بابت کیا کہیں گے۔ اُس کا پورا وجود اس سوال کا جواب سننے کے لئے ایک کا سۂ سماعت بن گیا تھا۔ اُس کی پوری توجہ اُن کے ہونٹوں کے ادا ہونے والے الفاظ کا احاطہ کرنے کے لئے سمٹ کر ایک نکتے پر مجتمع ہو گئی تھی۔ وہ منتظر تھا کہ دیکھیں آپ اس گھمیر گتھی کو کیونکر سلجھاتے ہیں؟ یہ وہ سوال تھا جس کا کوئی ایسا تسلی بخش جواب وہ آج تک نہ پا سکا تھا جو اس کو شانت کر دیتا۔

اس ضمن میں عموماً تین نظریات پائے جاتے ہیں۔ ایک کے مطابق انسان مجبورِ محض ہے جبکہ دوسرے کے مطابق اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے آزاد خود مختار۔۔۔ اور تیسرے مکتبہ فکر کے مطابق وہ کچھ باتوں میں مجبور و پابند اور کچھ باتوں میں آزاد و خود مختار۔ اُس نے ان تینو ں نظریات کا کافی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ لیکن اس لحاظ کسی حتمی

نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ وہ کون سی باتیں ہیں جن کی بابت انسان مجبور ہے اور وہ کون سے امور ہیں جن کو انسان خود مختاری سے نپٹانے کا اختیار رکھتا ہے۔

اُس لمحے وہ پوری طرح سے تجسس اور توقع کی گرفت میں جکڑا ہوا تھا وہ ہمہ تن گوش، آگہی کو حاضر رکھے، اپنی سماعت کو مستعد کئے پوری طرح چوکنا بیٹھا تھا کہ نرم اور کومل سی آواز، میٹھے اور مدھر سے لہجے میں ادا ہونے والے الفاظ اس کے شعور میں ایک سوال بن کر داخل ہوئے۔

''جب کوئی بچہ چوری کرتا ہے تو کیا آپ اُس پر کوئی حد جاری کرتے ہیں؟''

کمرے میں موجود سب افراد کے سر نفی میں ہلے یا نہیں لیکن خود اس کا سر نفی میں ضرور ہلا۔ چند لحظہ توقف کے بعد انہوں نے فرمایا۔

''آپ اللہ کے سامنے معصوم بچے بن کر زندگی بسر کریں گے تو آپ جہنم اور سزا دونوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔''

سب ہی مسکرا دیئے لیکن اس کو ہنسی آگئی۔ اتنی صاف اتنی آسان، اتنی واضح، اتنی دو ٹوک اور مختصر بات۔ لطفِ آگہی نے اپنے اظہار کو احترامِ بزرگی پسِ پشت ڈالتے ہوئے ہنسی کا انتخاب کیا تھا۔ اس کی آواز خنداں پر سب نے پلٹ کر اُس کو دیکھا۔۔ لیکن کسی کی نگاہوں میں اس کے لئے سرزنش یا تادیب نہ تھی۔ وہ سب بھی مسکرا رہے تھے۔ اُس نے اپنا سر جھکا لیا۔

اللہ کے آگے بچے، اس نے چشم تصور سے خود کو ایک چھوٹا سا بچہ دیکھا جو اپنے باپ کی شفقتوں کی چھاؤں میں شوخی پر اُترا ہوا تھا۔ وہ ہزار طرح سے مجبور ہونے کے باوجود اپنے بچپنے کی عادت کے سبب معصوم تھا۔ لیکن بچپنے کی معصومیت کے پیچھے لاعلمی اور انجانے پن کا کسی قدر ہاتھ ہوتا ہے۔ اس نے چند لحظہ اس بات پر غور کیا اور سوال مرتب کرنے کے لیے الفاظ کو ترتیب دینے لگا۔ ابھی وہ سوال تراش ہی رہا تھا کہ انہوں نے اپنی بات بڑھائی۔

''اصل میں بچپن میں انسان کا تعلق شعور کی نسبت لاشعور سے زیادہ مستحکم ہوتا ہے۔ اس لیے وہ شعور کی محدودیت سے محفوظ رہتا ہے اور خوش بھی رہتا ہے۔ شعور کی جکڑ بندیوں کو انسان نے علم و آگہی کا نام تو دے دیا لیکن اصل حقیقت کیا ہے؟ یہ بات اس کے علم میں نہیں۔ آپ کسی بھی چیز کی بابت بات کر کے دیکھ لیں اس کے بارے میں آپ کو ایک سے زیادہ آراء ملیں گی۔ یہ بات خود اس امر کا ثبوت ہے کہ حقیقت اور اصلیت کا کسی کو علم نہیں۔ کیونکہ کسی ایک حقیقت کی بابت ایک سے زیادہ آراء کیسے ہو سکتی ہیں۔ اور جب حقیقت اور اصلیت کا کسی کو علم ہی نہیں تو اُس کی بابت رائے کیسے رکھی جا سکتی ہے، علم کے بغیر رائے رکھنے کی ہمیں بہت عادت ہے۔ اگر حقیقت اور اصلیت کا سراغ لگانا مقصود ہے تو شعور کو لاشعور کی رہنمائی میں چلنا سیکھنا ہوگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک بچہ اپنے بڑوں کی نگرانی اور سرپرستی میں رہتا ہے۔''

اندازِ بیان کی ندرت، بات کا نیا پن اور زاویۂ نظر کی جدت دیکھ کر اس کو بات کہنے والے پر پیار سا آگیا۔ اس نے پیار کی چلمن سے ڈھکی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی انہیں بابا جی کہہ کر مخاطب کرے۔ اُن سے وہ کوئی ایسی بات دریافت کرے کہ وہ بولتے رہیں اور وہ سنتا رہے۔ کافی دیر تک اس گومگو میں رہنے کے بعد

جب وہ اپنی اس خواہش کو مزید دبائے رکھنے سے عاجز آ گیا تو اس نے اپنے ذہن میں دبی ایک بہت پرانی پہیلی کا جواب جاننے کو اُن سے دریافت کیا۔

''بابا جی! یہ شجرِ ممنوعہ کیا ہے؟''

جواب میں محض ایک سہ لفظی جملہ کہا گیا۔

''نافرمانی کا درخت!''

یہ جواب اس کے پلے نہیں پڑا۔

''نافرمانی کا درخت''، بھلا یہ کیا بات ہوئی؟ اس کو اس موضوع پر ایک طویل تقریر کی توقع تھی۔ وہ تو کچھ فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقی دلائل کا منتظر تھا۔ دانۂ گندم اور سیب کی تمثیلوں کی پردہ کشائی کا مُتمنی تھا۔ شیطان نے حضرت آدم کو ابدی اور لافانی زندگی کا لالچ دے کر بہکایا تھا۔ آخر وہ کیسا درخت تھا۔ اس پر اور کچھ نہیں تو کم از کم ایسے پھل تو ضرور ہونے چاہیے تھے جو آبِ حیات کی صفات رکھتے۔ اُس نے اِس مخمصے کو حل کروانے کے لیے ایک سوال اور پوچھا۔

''جناب بعض لوگ اس درخت کا رشتہ شجرہ کے لفظ کی رعایت سے شجرۂ نسب سے بھی تو جوڑتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کیا ارشاد فرمائیں گے؟''

اسی ہموار لیکن مضبوط لہجے میں کہا گیا۔

''میں نے کہا نا کہ یہ ایک نافرمانی کا درخت تھا۔''

کہنے کے انداز میں کچھ ایسی بات تھی کہ اس کے ذہن کے اندر ایک جھماکا سا ہوا۔ وہ درخت کیا تھا؟ کیسا تھا؟ اس کے بجائے اُس کو یہ سمجھنا چاہیے کہ قرآن کی وہ آیت جس میں شجرۂ ممنوعہ لاتذکرہ ہے۔۔ متشابہات میں سے ایک بتائی جاتی ہے، اس لیے وہ کوئی مادی درخت تو ہوگا نہیں۔ تمثیلی انداز میں بیان کی گئی بات کا مفہوم یہی ہوگا۔ نافرمانی کی شاخ در شاخ بڑھنے کی صفت اور صلاحیت کے پیشِ نظر ہی اُس کو درخت سے تشبیہ دی گئی ہے۔

اب ظاہر ہے کہ نافرمانی کے درخت کے درخت کا پھل بھی نافرمانی کے بیجوں ہی کے حامل ہوں گے۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''وہا، بہت خوب!''۔۔ اور ساتھ میں اُس کا سر داد دینے کے انداز میں مسلسل اوپر نیچے ہلنے لگا۔ اس نے بہت بڑے بڑے الفاظ میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو بیان ہوتے تو اکثر سُنا تھا۔ طویل کلام میں مفہوم کے موتی تلاش کرتے کرتے اُس کی سماعت چھلی اور ادراک دریدہ ہونا اک معمول تھا مگر ہاتھ پھر بھی کچھ نہ لگتا۔ جوشِ گفتار اور عالمِ تقریر میں مُدعا عنقا ہی رہتا۔ لیکن موجودہ صورتِ حال اُس کے لئے نئی اور حیرت آمیز تھی۔ اتنے مختصر کلام میں اتنی وضاحت، ایک چھوٹے سے جملے میں اتنا بڑا مفہوم۔ اعجازِ بلاغت اسی کو کہتے ہیں۔ قادر الکلامی اور بھلا کیا ہوگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ یہ سب باتیں اُن سے کہہ بھی دے لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا اور خاموش بیٹھا رہا۔

اس کو وہاں بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔ لطف و انبساط کی ایک ناقابلِ بیان کیفیت نے اس کو اپنی گرفت لیا ہوا تھا۔ ایک عجیب مدھم سا دھیما دھیما کیفیت و سرور اس کے اندر اُترتا چلا جارہا تھا۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کی عقیدت میں ادب و احترام ہی نہیں بلکہ سرور آمیز بے تکلفی بھی گھلی ہوئی تھی۔ اُن کو اُن کا احترام کرنے کے لئے خود پر بھی کوئی جبر نہیں کرنا پڑ رہا تھا۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس محترم اور عالی مقام بزرگ کا احترام کریں اور جب کسی کام کو بندے کا اپنا جی چاہ رہا ہو تو وہ کام بوجھ نہیں لگتا۔ اُس کو لطف آرہا تھا۔ اس نے سوچا اتنے طویل سفر کے بعد بھی وہ تر و تازہ اور پر

لطف کیوں محسوس کر رہا ہے۔ اس کا موڈ بھی خوشگوار ہے۔ یہ شاید یہاں کے موسم کا اثر ہے یا پھر اس جگہ کی کوئی خصوصی تاثیر ہے۔

مرکزی مراقبہ ہال کی مغربی دیوار کے قریب اُس نے سبز کلس کا ایک گنبد سا دیکھا۔ وہ اس جانب بڑھا۔ وہ ٹین سے بنا چھتری نما چھت والا ایک کنواں تھا۔ چرخی کے علاوہ موٹر کے ذریعے بھی پانی اُٹھانے کا اہتمام تھا۔ کنویں کا چبوترا ایک فٹ بلند سیمنٹ کا بنا ہوا تھا۔ منڈیر پر سرخ پینٹ نے اُس کو جاذبیت سے مزین کر رکھا تھا۔ لوہے کے چار ستونوں کے اوپر سبز چھت، پس منظر میں تین اطراف میں سبز لان اور ان میں کھلے پھول ہی پھول۔ اس نے یوں تو کئی کنویں دیکھے تھے، گاؤں، دیہاتا ور شہروں کے کنویں۔۔ لیکن اس کنویں کی تعمیر میں نفاست، حسن تعمیر اور سادگی اُس کو جذب کر کے کشاں کشاں اس کی منڈیر تک لے گئی۔

پانی بیس پچیس فٹ نیچے تھا۔ کراچی میں اس گہرائی پر پانی یقیناً کھارا ہی ہوگا۔ اس نے ابھی پانی کے کھارے پن کو دور کرنے کی باب پوچھنے کی بات سوچی ہی تھی کہ احمد صاحب اس کو بتانے لگے کہ اس کنویں کے پانی میں امراضِ معدہ کے لیے خصوصی شفا دیکھی گئی ہے۔ یہاں نیچے شاید کوئی چشمہ تھا۔ جب کھدائی کی گئی اور جو پانی نکلا اس کا لیبارٹری ٹیسٹ کروایا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو منرل واٹر (معدنیاتی پانی) ہے۔ اس معدنیاتی پانی کا نام آبِ شفا رکھا گیا۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے ربڑ کا ڈول کنویں میں ڈال دیا۔ چھپاکے کی آواز کی گونج کنویں کی تہہ سے اُبھری اور اس آواز کی لہروں سے بہت دور کہیں ماضی کا ایک منظر اس کے ذہن کی اسکرین پر اُبھرتا چلا گیا۔

صحرا میں آبادی سے دور ایک نخلستان میں ایک قافلہ آکر ٹھہرا ہے۔ نخلستان میں ایک کنواں بھی ہے۔ مٹی کی منڈیر والے اس کنویں سے پانی لینے کے لیے مسافر ڈول ڈالتے ہیں۔ چھپاکے کی گونج کے ساتھ ساتھ ایک اور آواز بھی آتی ہے۔ مجھے بچاؤ! ڈول ڈالنے والا مسافر ساتھیوں کو پکارتا ہے کہ کنویں میں کوئی ہے۔ قافلے کے لوگ کنویں کی منڈیر کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ جھانک کر دیکھتے ہیں تو ایک لڑکا کنویں کے اتھلے پانی میں ڈول کی رسی پکڑے کھڑا

اوپر دیکھ رہا ہے۔ اس کو اوپر کھینچا جاتا ہے ۔ دیکھنے والے اس کی معصومیت اور حُسن پر فدا ہوئے جا رہے ہیں دریافت کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ برادرانِ یوسف نے اس کو اپنے حسد کے ہاتھوں تہہ نشین کر دیا تھا۔ اب مشیت الٰہی اس کو اوپر اٹھانے کا انتظام کر رہی تھی۔

اس زمانے کے دستور کے مطابق کسی کی جان بچانے والا اس کا مالک قرار پاتا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ اگر اُس کو آزاد کر دیا اور یہ اپنے بھائیوں کے ہاتھ چڑھ گیا تو اس بار شاید وہ اُس کو جان سے ہی مار ڈالیں گے اور اگر وہ اُس کو اپنے ہمراہ رکھیں تو ایک عرصہ تک اُس کے خورد و نوش اور کپڑے لیتے کی ذمہ داری کون اُٹھائے گا؟ لہذا شہر پہنچ کر اس کو فروخت کر کے اپنے فائدے اور اس معصوم فرشتہ صورت لڑکے کی آئندہ بہتری کی ایک صورت پیدا کر دی گئی۔

''آپ کہاں کھو گئے ۔ یہ لیں پانی ، یہ پانی پی کر دیکھیں!'' احمد صاحب نے کہا۔ اس نے بے خیالی میں ان سے پانی کا گلاس لے کر پی لیا۔ وہ اپنی کیفیت پہ حیران سا تھا اس کو قدم قدم پر کہاں کہاں کی باتیں سوجھ رہی تھیں۔

ہر آبادی کی بنیاد پانی ہے۔ جہاں آبادی ہو گی وہاں پانی ضرور ہو گا اور جہاں پانی نہیں اسے صحرا اور ویرانہ کہتے ہیں۔ صحراؤں میں سراب بہکاتے اور ویرانوں میں آسیب ڈراتے ہیں۔ جہاں پانی ہوتا ہے وہاں زندگی دھڑکتی ہے اور رونقیں کروٹیں لیتی ہے۔ سرابوں اور آسیبوں کو تحلیل کرنے میں پانی جو کردار ادا کرتا ہے۔ اس کو بھلا کون نظر انداز کر سکتا ہے۔ ہاجرہ کی سعی کے پیچھے انہیں سرابوں اور آسیبوں کا خوف اور دہشت رہی ہو گی جو وادی بطحہ کے ریگزاروں اور بے آب و گیاہ ٹیلوں پہ جانے کب سے قیام پذیر تھے اور جونہی اس صحرائی بیابان میں ننھے اسماعیل کی معصوم حرکت نے زندگی کا بہاؤ اپنے ننھے ننھے پیروں تلے بہانا شروع کیا تو ماں بے اختیار ہو کر پکار اُٹھی زم، زم یعنی

تھم جا تھم جا۔ ننھے اسماعیل کی ماں نے جس بہاؤ کو آج سے صدیوں قبل روکا تھا وہ آج بھی وہیں تھما ہوا بہہ رہا ہے۔ لاکھوں کروڑوں انسان آج بھی اس سے سیراب ہونے کشاں کشاں وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اس نے سوچا جہاں کنواں ہو وہاں سرابوں اور آسیبوں کی پیش نہیں چلتی۔۔۔ چل ہی نہیں سکتی۔

اس پانی کو پی کر سیراب ہونے کے جاں فزاء احساس کے تحت اُس نے احمد صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ وہ احمد صاحب سے اس بارے میں بات کرنے کو الفاظ تول ہی رہا تھا کہ انہوں نے اُس کو ایک جھاڑی دار پودے کی طرف متوجہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''آپ نے پہلے کبھی یہ پودا دیکھا ہے؟''

اُس نے اس پودے کو دیکھا۔ اس کے پتوں کی بناوٹ میں بیضوی پن نمایاں اور ان کی اوپری سطح نچلی سے زیادہ گہری سبز اور چمک لئے ہوئے تھی۔ پتے قدرے رُوئیں دار اور شاخیں لچکیلی۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ تو احمد صاحب نے اُس کو بتایا کہ وہ زیتون کا پودا ہے۔

''زیتون؟ اچھا تو یہ ہے زیتون''۔۔اُس نے استعجاب کا اظہار کیا۔ اس کی بابت تو اللہ نے قرآن حکیم میں قسم کھائی ہے اور اس کو بہترین اوصاف کا حامل قرار دیا ہے۔ نزولِ قرآن سے پیشتر بھی لوگ اس کی اعلیٰ صفات اور فوائد کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی لچکیلی شاخوں سے بنا تاج عزت و سرفرازی کے طور پر میدان مارنے والوں کو پہنایا جاتا تھا۔ اس کا تیل کھانے، پکانے، لگانے اور جلانے کے لئے عالم میں انتخاب مانا جاتا ہے۔ اس کی شفا بخشی کے بارے میں حکماء کی غلو آمیز رائے یہ ہے کہ یہ مردے کو زندہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جب یہ پودا درخت بن جائے گا اس پر

پھول لگیں گے وہ پھول زیتون کا پھل بنائیں گے۔ اس پھل سے تیل حاصل ہو گا۔ وہی تیل جس کا تذکرہ آیت نور میں کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اُس کی روشنی کو اپنے نور کی مثال قرار دیا ہے۔

ایک روایت کے مطابق زیتون مردانہ اور انجیر زنانہ اوصاف کا حامل پودا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زیتون سے پہلے جس پھلدار پودے کی قسم کھائی ہے وہ انجیر ہے۔ اس کی نظریں کے انجیر کے پودے کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم گئیں۔ اس قطعہ سبزہ میں ناریل، بادام اور فالسے کے پودے سے ہوتی ہوئی بالآخر انجیر کے درخت پر آن کر ٹک گئیں۔ اُس کو اک گونہ خوشی سی ہوئی۔ اگر وہ انجیر کا پودا وہاں نہ پاتا تو شاید اُس کو دُکھ ہوتا۔ اُس نے انجیر کو دیکھتے ہوئے سوچا اللہ تعالیٰ نے ''والتسین والزیتون'' کہہ کر صنف اناث کو جو تقدیم عطا فرمائی ہے، آج مہذب اقوام میں بھی اس کا لحاظ رکھتے ہوئے۔۔ ''خواتین و حضرات''۔۔۔ کہہ کر لوگ شاید اسی ریت کی پیروی کرتے ہیں۔

''یہاں اس مرکزی مراقبہ ہال میں کم و بیش بتیس تینتیس قسم کے پھلدار پودے لگے ہیں۔ جن میں لیچی اور شفتالو سے لے کر امرود اور شہتوت تک سب ہی قسم کے پھلوں کے درخت لگے ہیں۔'' احمد صاحب نے بتایا۔

بظاہر ایسا لگتا تو نہیں، اس نے سوچا۔۔۔ اور اس کی وجہ یہ سمجھی کہ ہر پھل کے ایک ایک دو دو پودے ہی ہوں گے ورنہ بادام کے پودے سے پلٹ کر اس نے جنوبی سمت بنی عمارت کی طرف دیکھا۔ نظر عمارت کے پہنچنے سے پیشتر بیس پچیس فٹ بلند کرسمس ٹری کی چوٹی پر لگے بلب پر پڑی۔ نگاہ اتنی بلندی پر لگے بلب پر مرتکز ہوئی تو اس نے دیکھا کہ پورا پودا درخت چھوٹے چھوٹے قمقموں کی لڑیوں سے سجا ہوا تھا نہ صرف یہ بلکہ تقریباً ہر درخت اور ہر پودا ہی لڑیوں سے آراستہ تھا۔

''یہ دیکھیں!''

احمد صاحب نے اس کو زمین میں قدم آدم گہرائی کے ایک مربع تالاب نما گڑھے کی طرف متوجہ کیا۔ اُس تالاب نما جگہ میں اُترنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ تہہ سے تقریباً ایک فٹ اوپر لوہے کا ایک اہرامی شکل کا ڈھانچہ اس طرح سے نصب کیا گیا تھا کہ اس کی نوک تالاب کے مرکزی نقطے کے عین اوپر تھی۔ کنارے پر ایک چھوٹی سی نیلی تختی پر ''حرا'' لکھا ہوا تھا۔ اس تالاب نما جگہ میں اہرام کی شکل والے اس ڈھانچے کو حرا سے کیا نسبت ہو سکتی ہے؟ شعور میں یہ سوال لہرایا۔ حرا تو اس غار کا نام تھا جہاں نبی کریم ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی تھی۔ اس نے کچھ دیر غور کیا اور جب وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تو اس نے پوچھ ہی لیا۔

''یہ غارِ حرا کا کیا مطلب ہوا؟''

احمد صاحب نے کہا۔ ''حرا کے اصل معنی غور و فکر، سوچ و بچار اور ریسرچ کے ہیں۔ حضور ﷺ غارِ حرا میں غور و فکر کرنے ہی تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اب یہ امر تحقیق طلب ہے کہ اگر اس غار کا نام حضور ﷺ کے وہاں جانے سے پیشتر ہی غارِ حرا تھا تو اس کی وجہ اور تاریخ کیا تھی اور اگر یہ نام حضور ﷺ کے دور میں رکھا گیا تو اس کی معنویت پر کتنے لوگ متوجہ ہوئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اہرام کی شکل کا ڈھانچہ اس کے اندر بیٹھنے والے کے سر کے اوپر بالکل وہی زاویہ معلق کرتا ہے جو غارِ حرا کی پتھریلی چٹانوں کے اندر وہاں بیٹھنے والے کے سر پر قدرتی طور پر بنتا ہے اور دوسرے یہ کہ اہرام کی ہندسی شکل کے سبب یہ اہرام مصر کے اندر بننے والے زاویئے سے مناسبت کے سبب اس توانائی کو جو اہرام مصر کے اندر چیزوں کو گلنے سڑنے سے محفوظ رکھتی ہے، ہمارے جسم میں سے گزرتی ہے اور اُس کو سیراب کرتی ہے یعنی معنوی طور پر یہ جگہ مراقبہ کے لئے ایک مثالی جگہ ہے۔ اپنے نام کی مناسبت سے یہ ہمیں غور و فکر کرنے کی اس طرز کی طرف متوجہ کرتی ہے جو حضور نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کا خاصہ ہے اور فوائد کے اعتبار سے

اس طرزِ فکر کو اپنانے والے کو اسی پائیداری، استحکام اور فنا پزیری سے آزادی کی نوید دیتی جو اہرام جسے اسٹریکچر سے منسوب سمجھی جاتی ہے۔"

وہ مبہوت ہو کر احمد صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔ اس اثنا میں وہاں چند ایک افراد اور بھی آ گئے تھے۔ وہ بھی اُن کی باتوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے لطف لیتے ہوئے سوال کیا۔۔۔"اور یہ گہرائی میں کیوں بنایا گیا ہے؟"

احمد صاحب نے بر جستگی سے جواب دیا "قبر کی یاد دلانے"۔۔۔ سب نے ایک قہقہ لگایا۔ اُس نے سوچا کہ بات تو ٹھیک ہی ہے۔ اس فانی زندگی سے آگے کی لافانی زندگی کی طرف متوجہ کرنے اور یہ محسوس کرنے کے لئے کہ ابدی نیند سونے کے دوران انہمیں جس وسعت اور کشادگی کی ابدی نعمت حاصل ہو گی وہ یہاں زمین کی سطح نیچے اُترنے کے بعد مراقبہ کرنے کی صورت میں وقتی اور لمحاتی طور پر مبنی تجربے میں آتی ہے۔

ایک حدیث کا مفہوم اس کے شعور میں اجاگر ہو گیا "مر جاؤ مرنے سے پہلے" کا ایک پہلو یہ بھی تو ہے کہ اس زندگی میں ہی آنے والی زندگی سے روشناس ہو لیا جائے اور اس کے لئے یہ اہتمام بہت ہی گہرے تفکر کا غماز ہے۔

ایک اور صاحب جو انگریزوں کے سے لہجے میں ارسو بول رہے تھے، کہنے لگے "حرا کو اہرام مصر سے کیا نسبت ہے جو یہاں ان دونوں کو مجتمع کر دیا ہے۔"

پہلی نسبت تو یہ ہے کہ دونوں ہی نبیوں سے متعلق ہیں۔ اہرام مصر حضرت یوسف علیہ السلام اور حرا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے متعلق ہیں۔ ایک دبلے پتلے کوتاہ قامت نوجوان نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔" دوسرے یہ کہ ان دونوں کی جیومیٹریکل ساخت میں ایک مناسبت ہے۔ اہرام اپنی متناسب ساخت کی وجہ سے مادی

اشیاء کی شکست وریخت کو روکتا ہے۔ اس کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ وہ زمین کے اندر بہنے والی مقناطیسی لہروں کو ایک نقطے پر مرتکز کر دیتا ہے۔ مقناطیسی لہروں کے ارتکاز کے سبب مادی اشیاء سے توانائی کا اخراج رُک جاتا ہے اور وہ عرصہ دراز تک خراب ہونے سے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ غارِ حرا کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جو نسبت ہے اس کے تحت افکار و خیالات میں استحکام اور بقا کا عمل بڑھ جاتا ہے۔ یعنی اگر ایک مادی اجسام کو دوام دینے کے لئے استعمال ہوا تھا تو دوسرا فکر و خیال کی بقاء کی علامت ہے۔ اس کے علاوہ اس میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ انبیاء کی طرزِ فکر کی پیروی کرنے اور اس کو اپنانے والوں کو ایسا ہی دوام میسر آسکتا ہے جیسا تاریخ انسانی میں اہرام کی عمارت کو حاصل ہوا ہے۔"

ماشاء اللہ بہت خوب، یہ بات ان سب کی دل کو لگی۔ اُس نے سوچا یہاں تو ہر آدمی اُس سے زیادہ جانتا ہے۔ جس کی بھی سنو۔ اُس کو ایک نئی بات ہی کہتے سن کر اُس کو اچھا لگا۔ وہ شاید یہی کچھ چاہتا تھا۔

اندر کی رُت بدل گئی

کراچی سے واپس لوٹے اُسے آج دس دن ہو چکے تھے۔ وہ تقریباً اتنے ہی دن کراچی میں گزار کر آیا تھا۔ وہ تمام وقت جو اُس نے کراچی میں گزارا تھا وہ وہاں ایک ہی جگہ رہا تھا۔ مرکزی مراقبہ ہال میں اتنے دن کیسے اور کیوں کر گزرے ؟ وہ کچھ عجیب سا بھی محسوس کر رہا تھا۔ وہ وہاں ساحل سمندر تک بھی نہیں گیا تھا۔ کسی بازار یا کسی مارکیٹ جا کر بیوی بچوں کے لئے کوئی سوغات یا تحفے خریدنے تک کی اس کو فرصت نہ ملی تھی۔ فرصت نہ ملی تھی یا اُس کو اِس کا خیال نہیں رہا تھا یا اُس کو وہاں سے کہیں باہر جانا ہی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس تمام وقت کو جو وہ وہاں گزار کر آیا تھا اُس کا ذہن چند لمحوں کے برابر کیوں سمجھ رہا تھا۔ اُس کو نہ جانے کیوں ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کراچی رہا نہیں۔ وہ وہاں تک محض گیا اور آیا ہے۔ اُسے یوں محسوس ہوتا کہ جسمانی طور پر واپس آنے کے باوجود وہیں کہیں رہ گیا تھا۔

کبھی اس کو کچھ یوں محسوس ہوتا کہ اُس کے وجود کے دو حصے ہو گئے ہیں۔ ایک حصہ وہیں کراچی رہ گیا ہے۔ وہ خود کو ادھورا سا محسوس کر رہا تھا۔ کبھی اُسے محسوس ہوتا کہ مراقبہ ہال کا پورا ماحول اُس کے ساتھ چپکا ہوا اُس کے ہمراہ آ گیا ہے۔ اُس کو اپنے ارد گرد کا ماحول کچھ بدلا بدلا سا لگتا۔ وہ اس تبدیلی کو محسوس تو کر رہا تھا لیکن اس تبدیلی کی نوعیت اُس کے شعور کی گرفت میں نہیں آ رہی تھی۔ اُس کے بیوی بچے ہی نہیں اُس کے ماں باپ نے بھی جب دو چار بار اُس سے یہ کہا کہ وہ کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا ہے تو اس نے سمجھا کہ یہ تبدیلی خود اُس کے اپنے اندر واقع ہوئی ہے۔

شروع شروع میں اُس نے اس کیفیت کو تھکن سے تعبیر کیا کہ وہ اتنے روز گھر سے دور رہا، اتنا طویل سفر کیا۔ یہ سب محض سفر کی تھکان اور گھر اور اپنے ماحول سے دوری کے بعد اثرات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ مگر تین چار روز گھر میں گزارنے اور زیادہ تر آرام کرنے کے باوجود جب اُس کی اس کیفیت میں کوئی زیادہ افاقہ نہیں ہوا تو اُس

نے اپنی سابقہ ڈ گر پر چلنے اور اپنے پرانے روٹین پر قائم ہونے کی کوشش کی۔ اپنی سابقہ مصروفیات ، دلچسپیوں ااور معمولات کی طرف راغب ہونے کی کوشش کی تو وہ سب کچھ اُس کو پرایا پرایا سا لگا۔ دوستوں میں بیٹھتا تو اُس کو انُ کی گفتگو میں ، اُن کی باتوں میں اُس کو اب وہ رنگ محسوس نہ ہوتا جہ پہلے اس کو اپنے زندر جذب کر لیا کرتے تھے۔ وہ کسی قسم کی اکتاہٹ بھی محسوس نہ کرتا۔ صرف اُس کو اُن کی باتوں میں مزہ آنا بند ہو گیا تھا۔ وہ دلچسپی لینے کی کوشش کرتا لیکن اُس کو لطف نہ آتا اور وہ وہاں سے اُٹھ جاتا۔ وہ اُن سے جس قسم کی باتیں کرنا اور سننا چاہتا تھا، وہ اُس طرف آتے ہی نہ تھے۔

ایک دو بار اُس کو یہ بھی محسوس ہوا گویا اُس کے ذہن کا حجم کچھ بڑھ سا گیا ہے۔ کبھی اُس کو یوں لگتا کہ اس کی ذہنی سطح پہلے سے کچھ بلند ہو گئی ہے۔ پہلے جن باتوں کو سُن کر وہ لوٹ پوٹ ہو جایا کرتا تھا اب وہی باتیں اُسے بچپنا سا محسوس ہوتا۔ اُکو بالکل ویسا ہی احساس ہوتا جیسے کوئی بچہ چارپائی پہ کھڑا ہو کر خود کو قد آور محسوس کرتا ہے۔ اپنی سوچوں اور فکر میں وسعت اور فراخی کا احساس اُس کے لئے ایک نیا سا تجربہ تھا۔

وہ دوستوں اور ملنے جلنے والوں کی باتوں میں گہرائی اور اپنایت کی کمی محسوس کرتا۔ اُن کے رویے پر تکلف اور رسمی سے محسوس ہوتے۔ کبھی وہ اُن کی باتوں میں ہمہ گیریت کا فقدان دیکھتا۔ اُس کے اندر کا یہ پھیلاؤ اور بالیدگی کا یہ احساس اُس کے کہے ہوئے الفاظ میں چھلک چھلک جاتا۔ اُس کی سوچوں کا دھارا اُس کو بہا کر اُس کی ذات اور اُس کے متعلقات کے محدود حصار سے باہر کہیں دور اوپر اٹھا لے جاتا۔ وہ مراقبہ ہال میں ایسے اپنے قیام کے دوران بابا جی کی کہی ہوئی باتوں کو اپنے اندر ابھرتا اور تازہ ہوتے دیکھتا۔ وہ خود کو اکثر و بیشتر ایسے خیالات کے دھارے پہ بہتا دیکھتا جن

کا تعلق اُس کے گرد و پیش کی بجائے آسمانی مخلوقات، کائناتی رازوں اور آفاقی سچائیوں سے جڑا ہوتا۔ غیر ارادی طور پر اُس کے ذہن میں بابا جی سے سُنا ہوا کوئی جملہ گونجتا اور اُس کا ذہن اُس بات کی معنوی گہرائی میں کھو سا جاتا۔

گھر میں بیوی بچوں سے بات کرتے ہوئے دفتر میں اپنے کاروباری معاملات پر گفتگو کرتے ہوئے، اپنے دوستوں سے گپ شپ کے دوران وہ بے اختیار اپنے کراچی میں قیام کے دوران سنی ہوئی باتوں کو اپنی بات کے طور پر کہہ دیتا۔ بعض اوقات وہ عرس کی تقریبات کے حوالے سے، اپنی شمولیت، اپنے مشاہدات کا تذکرہ کرنے بیٹھ جاتا۔ کیسے وہاں مراقبہ ہال میں لوگ بابا جی سے ملتے اور طرح طرح کے سوال پوچھتے۔ جب وہ دیکھتا کہ محفل جمی ہوئی ہے وہ بھی گھس بیٹھتا۔

ایک دفعہ وہاں ایک نوجوان نے بابا جی سے دریافت کیا کہ وہ چاہتا ہے کہ وہ ایک اچھا کرکٹر بن جائے، اس مقصد کے لئے اُس کو کیا کرنا چاہیے۔ اُس نے جب یہ سوال سُنا تھا تو اُس کے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ بابا جی کہیں گے کہ انہوں نے کبھی کرکٹ نہیں کھیلی اس لئے وہ اس کی بابت کیا کہہ سکتے ہیں؟ یا یہ کہ وہ کہیں گے کہ کرکٹ کھیلنا بُری بات ہے۔ وقت ضائع کرنا ہے تم اپنی پڑھائی پر توجہ دیا کرو۔ لیکن اس کی حیرتکی انتہا نہں رہی جب انہوں نے اُس نوجوان کی بات کے جواب میں یہ کہا کہ اچھا کرکٹر بننے کے لئے اُس کو چاہیے کہ وہ خیالوں میں کرکٹ کھیلا کرے۔ اُس پہ اُس نوجوان نے تو کچھ نہ کہا تھا لیکن اُس نے اُن سے اس بات کی تشریح کرنے کی فرمائش کر دی تھی۔

جس پر انہوں نے بتایا تھا کہ کسی بھی کام میں مہارت کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے جسم کے اوپر موجود روشنیوں کا جسم، جس کو نسمہ کہتے ہیں، انسان کی جسمانی حرکات میں تعاون کرے۔ جسم کی حرکات و سکنات کہنے کو دماغ سے کنٹرول ہوتی ہیں لیکن اصل میں یہ کام نسمہ کرتا ہے۔ جب تک آپ کوئی کام جسمانی مشق کے زور پر ہی کرتے

ہیں اُس وقت تک اُس میں مہارت کی اضطراری سطح حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن جن جسمانی مشق کے ساتھ ساتھ اُس کام کی ذہنی سطح پر بھی مشق کی جاتی ہے تو غیر ارادی اور اضطراری سطح کی مہارت پیدا ہوتی ہے۔

اُس کو اُن کی یہ بات سن کر کتنے ہی ان کہے الجھاؤ سلجھتے ہوئے محسوس ہوئے تھے اُس کے ذہن میں اپنی بہت سی ناکامیوں اور کوتاہیوں کی اصل وجہ کا ادراک در آیا تھا۔

صبح اُس کی آنکھ کھلتی تو اُس کو محسوس ہوتا کہ رات بھر وہ کسی اور ہی دنیا میں رہا ہے اور اب اُسے اس جہانِ رنگ و بو میں محض کچھ دیر کے لئے واپس بھیج دیا گیا ہے۔ اُس کو اپنی کیفیت پر اچھنبا بھی ہوتا لیکن جب وہ غور کرتا تو اُس کو اپنا یہ احساس کچھ اتنا غلط بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اب بہت سی باتیں اُس کو نئی اور انوکھی سی محسوس ہوتیں۔ پہلے جن باتوں میں اُس کو کوئی ندرت یا نکتہ آفرینی نظر نہ آتی تھی اب اُن ہی باتوں میں اُس کو معنویت اور مقصدیت کا احساس ہوتا۔

معنویت اور مقصدیت سے بڑھ کر اُس کو ہر بات میں مثبت پہلو نظر آنے لگا تھا۔ اگر اُس کو کوئی مثبت پہلو نظر نہ آتا تو وہ اُس کو تلاش کرنے لگ جاتا اور اکثر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہتا۔ انداز نظر میں اس تبدیلی کا نہ صرف یہ کہ اُس کو شعور تھا بلکہ وہ اس بات کے لیے ذہنی طور پر بابا جی کا ممنونِ احسان تھا۔ جو بات وہ کتابوں میں پڑھتا رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اُس کو اپنائے لیکن کوئی رول ماڈل سامنے نہ ہونے کی وجہ سے وہ اُس کو اپنانے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ اب چند دن اُن کے قریب رہ کر اُس نے بہت توجہ اور دھیان سے اس بات کا تجزیہ کیا تھا کہ اُن کی شخصیت میں آخر وہ ایسی کون کون سی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے احمد صاحب جیسے لوگ اُن کے دیوانے ہونے پہ فخر کرتے

تھے۔ اس بات کی جہاں اور بھی بہت سی وجوہات تھیں وہاں اُس نے اس بات کو سرِ فہرست پایا تھا کہ وہ ہر بات کو محبت انداز میں لیتے تھے۔

اگر کوئی اُن کے سامنے کسی بات کی شکایت کرتا اور شکوہ سنج ہوتا تو وہ اپنے مخصوص انداز میں اس بات کا کوئی مثبت پہلو سامنے لے آتے۔ ایک صاحب نے منہ بنا کر کہا کہ لوگ اتنا اناج ضائع کرتے ہیں۔ اُن کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تو انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ''بھئی اناج ضائع کہاں ہوتا ہے۔۔ اللہ کی اور کسی مخلوق کے کام آجاتا ہے۔ آپ اُن کو یوں نہیں کھلاتے تو اللہ اس طرح اُن کے رزق کی فراہمی کا سامان کر دیتا ہے۔ اسی طرح کسی نے کہا کہ مہنگائی بہت ہو گئی ہے تو انہوں نے تبصرہ کیا۔ معیار زندگی بھی تو بلند ہو رہا ہے۔ پہلے آپ عید بقر عید پر ایک ہی جوڑا کپڑے سلواتے تھے ورنہ وہی کوئی پرانا کپڑا دھو کر استری کر کے پہن لیتے تھے۔ اب تو کسی پرانا کپڑا پہنے دیکھے مدت ہو جاتی ہے۔ پہلے گھروں میں مرغی کبھی کبھار ہی پکتی تھی اب تو مشاء اللہ ہر گھر میں مرغی پکتی ہے، اب تو دال امیروں کی غذا بن چکی ہے کہ اس میں کولیسٹرول نہیں ہوتا۔''

مراقبہ ہال کے اندر کے پورے ماحول پہ اُن کی چھاپ اس قدر گہری واضح تھی کہ باہر سے آنے والے بھی اُس کی لپیٹ میں آجاتے تھے۔

عرس کی شام مراقبہ ہال میں افطار اور تراویح کے بعد چہل پہل کا سماں تھا۔ کراچی کے علاوہ ملک بھر سے آئے ہوئے لوگ اِدھر اُدھر ٹولیوں میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ بیرونی ممالک سے بھی کافی لوگ عرس کی تقریبات میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ سب ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ باباجی سے ملنے کے تجربات ایک دوسرے کو سنا رہے تھے۔

رات ڈھلنے کے ساتھ موسم میں خنکی بڑھ گئی اور بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا۔ کراچی میں ایسا موسم شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ وہاں جمع ہونے والے لوگوں کی توجہ آسمان کی طرف کم ہی تھی۔ اچانک بوندا باندی شروع ہو گئی۔ جلد ہی بوندا باندی نے رم جھم برستی بارش کا روپ دھار لیا۔ اُس کی توقع کے عین برعکس وہاں کوئی افراتفری نہیں پھیلی نہ ہی وہاں کوئی بھگدڑ مچی۔ اُس نے وہاں کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ یہ کیا ہو گیا۔ سب نے شامیانوں کی نیچے پناہ لی۔ اُس نے دیکھا کہ کئی افراد اپنی باتوں میں اُسی طرح مگن تھے۔ کسی نے اُس وقت بارش کے خلاف کوئی شکوہ بھرا تبصرہ نہیں کیا۔

جب بارش کے پانی نے تنے ہوئے شامیانوں کو بھگو کر اُن میں راہ بنالی اور نیچے فرش پر بچھی دریاں اور بستر بھیگنے لگے تو اُس کو سنبھالنے کا کام خود بخود شروع ہو گیا۔ اُس نے اُس وقت بھی کسی کو پریشانی کا اظہار کرتے نہیں سنا تو خود اُس کو بھی حوصلہ ہونے لگا۔

پھر اطلاع آئی کہ سب لوگ اپنا اپنا سامان اٹھا کر مسجد میں آجائیں۔ برستی بارش میں جب سب اپنا اپنا سامان اٹھا کر مسجد کی سمت چلے تب بھی اُس نے کسی چہرے پر کوئی کوفت یا پریشانی محسوس نہیں کی اور نہ ہی وہاں کوئی بھگدڑ مچی۔ اس پر اُس کو حیرت سے زیادہ ایک خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ ورنہ اپنے یہاں کا دستور تو کچھ اس قسم کا تھا کہ مسجد میں جگہ محدود ہونے کے پیشِ نظر سب وہاں پہلے پہنچنے کے چکر میں پڑ جاتے اور اگر یہ سب کچھ ہوتا تو اُس کو کوئی اچنبھا نہ ہوتا۔ وہ اپنے ارد گرد ایسی ہی افراتفری اور بھگدڑ دیکھنے کا اتنا عادی تھا کہ جب یہ سب کچھ نہیں ہوا تو اُس کو اس بات پہ حیرت اور مسرت ہوئی۔

رویوں میں ایک بناوٹی پن کا جو لحاظ ، مروت ، اخلاق اور ٹھہراؤ ہوتا ہے اُس کو ہر کوئی باآسانی محسوس کر لیتا ہے۔ لیکن یہاں پر اُس کو ان سب کے اس اصلی اور خالص رویّے نے اس قدر متاثر کیا کہ جب وہ خود اپنا سامان اٹھا کر مسجد کی طرف جانے لگا تو پناہ لینے کے لیے ، بھاگنے اور بہتر جگہ پانے کی خواہش پہ عمل کرنا اُسے معیوب سا لگا۔

اپنا بستر لپیٹ کر سر پہ اٹھائے اور ہاتھ میں سفری بیگ لیے جب وہ مسجد کی طرف جا رہا تھا تو پیروں تلے پانی کی چھپ چھپ سے برستی بارش کی شدت اور مقدار کا اندازہ ہو رہا تھا۔ سینکڑوں لوگ اس ناگہانی کو ایک ہونی اور شدنی جان کر صبر سے اس کا سامنا کر رہے تھے۔ کچھ تو اس صورتِ حال کا باقاعدہ لطف لے رہے تھے۔ منتظمین میں سے ایک صاحب ٹارچ کی روشنی دکھا کر راستے میں گڑی شامیانوں اور قناتوں کی طنابوں اور کھونٹیوں کی طرف متوجہ کر رہے تھے کہ لوگ اُن سے ٹھوکر نہ کھائیں۔

ایک صاحب نے کسی کو مخاطب کر کے خواتین اور بچوں کے لیے کئے گئے انتظام کی بابت کچھ کہا تو اُس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اُس نے بچوں کے رونے کی آواز سننے کی کوشش کی لیکن وہاں کوئی بچہ نہیں رو رہا تھا۔ وہ سر پہ اٹھائے بستر کی چھتری تلے بارش میں بھیگنے سے بچتا، لوگوں اور سامان کو ایک دوسرے پہ سوار سامان دیکھنے کی توقع لئے مسجد کے برآمدے تک پہنچ گیا۔ وہاں ایسا کوئی منظر اُس کی پذیرائی کو موجود نہ تھا۔ سامان وہیں دوسروں کے سامان کے ساتھ رکھ کر شب بیداری کے پروگرام میں شامل ہونے مسجد کے ہال میں داخل ہو گیا۔ یہ شب بیداری کا پروگرام رمضان المبارک کی مناسبت سے پہلے سے طے شدہ تھا۔ بارش نے فقط یہ کیا تھا کہ شامیانوں اور قناتوں والے رہائشی حصے میں پڑا سامان بھی وہاں اُن کے ہمراہ آ گیا تھا۔

اُس نے اس پیشتر بھی اپنی زندگی میں کئی رت جگے کئے تھے۔ کبھی کسی شادی کی تقریب کے سلسلے میں اور کبھی حالتِ سفر میں، دوستوں کی محفلوں میں کئی بار رات کو سحر کرنا اور بیماری اور تیمارداری کے چکر میں شام کو صبح کرنا بھی اُس کے تجربے میں تھا۔ فکر و پریشانی کے ہاتھوں نیندیں اڑنے پر جو جو راتیں بیداری میں گزرتی ہیں اُن کی اذیت اور کوفت اُس کے لئے ناآشنا نہ تھی۔ کسی کام کے سلسلے میں رات رات بھر جاگنا بھی اُس کو گوارا ہوتا تھا۔ لیکن اُس رات اس سرد، گیلے موسم میں رمضان اور عرس کی اس شبِ بیداری کی کیفیات اُس کی زندگی کا ایک حسین تجربہ اور یادوں میں ایک لطیف اضافہ بن گئیں۔

سینکڑوں افراد کے اُس خاموش بیٹھے ہجوم میں شامل ہو کر وہ بھی بیٹھ گیا۔ اُس بیٹھنے میں کوئی انتظار نہ تھا۔ کوئی توقع نہ تھی کہ اب یہ ہوگا یا وہ ہوگا۔ لوگ سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ یک لخت اندھیرا چھا گیا۔ فضا میں ایک عجیب سا سکوت چھا گیا۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ بجلی چلی گئی ہے۔ یہ کیا ہوا؟ اف۔۔ اوہ۔۔۔ اب کیا ہوگا؟ وغیرہ قسم کے تاثرات کی بجائے ایک سوکت اور سناٹے نے ہال کو بھر دیا۔ کپڑوں کی سرسراہٹ اور سانسوں کی آواز نہ ہوتی تو شاید اس کو موت کا سکوت یاد آجاتا۔ وہ ایک زندہ اور متحرک سکوت تھا۔

پھر اُس خاموشی میں ایک گنگناہٹ کے ساتھ ایک مدھر اور مترنم سی آواز میں کسی نے درودِ خضری کا ورد شروع کر دیا۔ وہاں اندھیرے میں بیٹھے سینکڑوں افراد، بلا کسی ترغیب و حکم کے اس آواز سے ہم آہنگ آواز میں، ایک کورس کی صورت درود شریف کا ورد کرنے لگے۔ رم جھم برستی بارش کی تال میں درود شریف کا آہنگ۔۔ گنگناہٹ کے ایک فوارے کی مانند اُن پر برستا اور بھگوتا رہا تھا۔

صلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ محمد وسلم کی اجتماعی لے ، رمضان کا تقدس ، عرس کی تقریب کا دھیان ، بر ستی پھوار کا لطف ، مسجد کا وقار ، تاریکی کا محیط ہونا ، ان سب کے تال میل سے اُس کے اعصاب تن کر ڈھیلے پڑ گئے ۔ اُس کو یوں لگا گویا ایک قافلہ حدی خواں ایک بلند مرتبہ عالی مقام اور مقدس ہستی کی طرف بڑھ رہا ہے ۔ اور وہ عالی مرتبت ہستی ایک شفیق سی مسکراہٹ کے پھیلاؤ کی اوٹ سے اُنکے اپنی طرف بڑھنے کی اس کاوش کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہی ہے ۔ اُس نے بے محابا اپنی آواز کو بھی اس ابھرتی پھیلتی گنگناہٹ کے دھارے میں شامل ہوتے اور خود کو اپنی آواز کی لہروں کی صورت فضا میں بکھرتے پھیلتے محسوس کیا ۔ لطف و سرشاری کی اُس کیفیت میں اُس کے اندر ایک ہی تمنا کی تکرار ہو رہی تھی کہ کاش یہ لمحہ یہیں تھم جائے ۔ کاش یہ کیفیت ابدی ہو جائے ۔

ہال کے اندر برقی قمقموں کے اچانک روشن ہو جانے سے وہ اُس کیف آگیں سرور کی کیفیت سے باہر آنے پر مجبور ہو گئے ۔ بجلی آنے کے بعد بھی اگرچہ درود شریف کا ورد اُس طرح جاری رہا ۔ لیکن اب وہ گداز اور جذب ہو جانے والی کیفیت مدھم سی ہو گئی تھی ۔ اندھیرا حواس پر کس کس طرح اثر انداز ہوتا ہے ، اُس وقت اُس کو اچانک ہی اس بات کا شعور ہوا کہ کیفیات کو مستحکم کرنے میں اندھیرا کا بھی ایک کردار ہوتا ہے ۔ اندھیرا چھٹتے ہی وہ حواس پہ چھائے اجالے سے باہر آگئے تھے ۔ باہر کی روشنی نے اُن کے حواس پر ایک طرح کی تاریکی سی مسلط کر دی تھی تبھی تو اُس کو اپنی باطنی کیفیات میں کچھ کمی سی محسوس ہوئی تھی ۔

وہ اپنے دوستوں اور احباب کو اپنے اس قسم کے تجربات کی باتیں بتانا چاہتا لیکن اُن کی دلچسپیوں کا رخ کسی اور طرف دیکھ کر وہ خاموش رہ جاتا ۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ انہیں بتائے کہ وہ ایک ایسے بندے کو ملا تھا جو صرف پیار محبت کا درس ہی نہیں دیتا تھا بلکہ عملاً پیار کرتا اور محبت بانٹتا تھا ۔ وہ بندہ جو ایک ایسا عالم با عمل تھا جس سے مل کر اُس کے ذہن

میں تنے جالے صاف ہوتے چلے گئے تھے اور اُس کی سوچوں میں ایک نکھار پیدا ہو گیا تھا۔ اس تبدیلی کے اثرات اُس کی سوچوں پر کچھ اس طرح سے منقسم ہو گئے تھے کہ اب اُس کے ذہن میں اللہ میاں سے متعلق سوچوں میں خوف و دہشت کی بجائے پیار، شفقت، رحم اور سلامتی حاوی ہو گئی تھی۔ اُس کے اندر کچھ ایسی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بے پایاں پیار کی کشش کو اپنے اوپر محیط دیکھنے لگا تھا۔ اس سے پیشتر اس کو کبھی اس امر کا شائبہ تک نہیں ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور پیار اُس کی مخلوق کے لئے کس قدر بسیط اور محیط تھا۔

اب بھی بظاہر دیکھنے میں سب کچھ ویسا اور وہی تھا۔ وہی گھر والے، وہی افراد خانہ، وہی دوست احباب، وہی کاروباری اور دفتری مصروفیات، وہی لوگوں سے ملنا جلنا، وہی روزانہ کے معمولات۔ لیکن اب اُس کا اندازِ نظر کچھ بدل سا گیا تھا۔ پہلے وہ ان سب باتوں کو اپنے زور بازو اور خوبیوں اور کمالات کے نتیجے میں حاصل ہونے والی کمائی اور ما حاصل سمجھتا تھا لیکن اب اس کو محسوس ہوتا کہ یہ سب اُس کی کمائی یا استحقاق نہیں ہے بلکہ یہ سب تو اُس کو ایک انعام کی طرح حاصل ہے۔ ایک ایسا انعام جو اُس کے کسی کمال یا خوبی کے سبب نہیں بلکہ دینے والے کی عطا اور مرہونِ منت ہے۔

اُس کے اندر یہ آگہی پیدا ہو رہی تھی کہ یہ زندگی، اس زندگی کے قیام کے وسائل، اُس کے سانسوں کی آمد و شد، یہ صحت اور تندرستی، اُس کی حرکات و سکنات سب کے سب ایک برتر اور اعلیٰ ذات کی مہربانی اور نوازش کے علاوہ اور کچھ بھی تو نہیں۔ اللہ کے اُس محبوب بندے نے یہ بات کچھ اس غیر محسوس اور Unsuspectedانداز میں تعلیم کی تھی کہ اس کو من و عن الفاظ تو یاد نہیں رہے تھے کہ انہوں نے اس بارے میں کیا کیا کہا تھا مگر اُس کے اندر یہ تبدیلی بہر حال جڑ پکڑتی جا رہی تھی۔

وہ کوئی بات سنتا یا پڑھتا تو کئی بار کی سُنی ہوئی یا پڑھی بات میں بھی اُس کو کوئی نیاز اور یہ کوئی نیا نکتہ اور کبھی کبھار تو پوری بات کا ایک نیا ہی مفہوم سامنے آجاتا۔ ایک ایسا مطلب سمجھ آتا کہ وہ جھوم کر رہ جاتا۔ آج صبح قرآن حکیم کی تلاوت کے دوران جب اُس نے یہ آیت پڑھی۔ ''ان اولیا اللہ لاخوف علیہم ولا ھم یحزنون '' تو اُس کو ایک مانوس سا احساس ہوا۔ اُس نے یہ آیت بابا جی کی زبانی بھی سنی تھی اور انہوں نے اس کی بابت یہ ارشاد فرمایا تھا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنی دوستی کی شرائط بیان کرتا ہے یعنی اگر کوئی اللہ تعالیٰ سے دوستی کرنا چاہتا ہے تو اُس کو خوف اور غم سے نجات حاصل کرنا ہوگی۔ اگر کسی کے اندر خوف اور غم موجود ہو تو ہر گز بھی اللہ کا دوست نہیں بن سکتا۔

اُس نے اس بات کے حوالے سے اس آیت کو دوبارہ پڑھا۔ شعور نے مزاحمت کی۔ اُس نے سوچا کہ ڈر اور خوف تو ہر آدمی کے اندر ایک فطری شے کی مانند موجود رہتا ہے۔ مستقبل کا خوف، اندھیرے کا ڈر، شیر اور سانپ جیسے موذی جانوروں کا خوف، بھوت پریت کا خوف، غربت کا خوف، انجانی جگہوں اور اجنبی لوگوں کا خوف، غربت اور افلاس کا خوف، موت کا خوف، جزا اور سزا کا خوف، تھانے کچہری کا خوف ذلت و رسوائی کا خوف، عزت و بے عزتی کا ڈر، اِن ہونی کا ڈر، فون کی گھنٹی ذرا بے وقت بجتی ہے تو دل لرز اُٹھتا ہے۔ شعور نے خوف کی ان تمام تصویروں کو اُس کے سامنے لا کر سوال داغا۔ آدمی بھلا کس کس خوف سے بچ سکتا ہے؟ پیدائش سے لے کر موت تک اور موت سے لے کر حشر نشر تک، خوف کی کتنی ہی منزلیں اور پڑاؤ ہیں۔ بُرے دنوں کا خوف نہ ہوتا تو کوئی ترقی ہی نہ کرتا۔

اس آیت میں خوف کا مفہوم یقیناً کچھ اور ہی رہا ہوگا۔ اُس نے لاچاری سے سپر ڈالتے ہوئے سوچا اور اُس کا ذہن حزن و غم کی کیفیات کا جائزہ لینے لگا۔ گھر ڈھے جائے تو غم۔ بچہ فوت ہو جائے تو حزن، بیوی یا شوہر کا مرنا حزن،

ماں باپ کا مرنا صدمہ، فیکٹری میں آگ لگ جائے تو غم و افسوس، فصل کو پالا مار جائے تو نقصان کا غم، کوئی دوست، عزیز اور پیارا چھوٹ جائے تو بندہ تصویر الم بن کر رہ جاتا ہے۔ انسان زندگی کے کس کس مرحلے پر غم و الم، حزن و یاس اور رنج و ملال سے نجات پا سکتا ہے؟ شعور نے اُس کو کمزور پڑتے دیکھ کر اس پر چڑھائی کر دی۔

سوچوں کے دائرے بن بن کر بگڑتے رہے اور جب وہ کوئی راہ نہ پا سکا تو اس کو گھبراہٹ اور گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ اُس نے شعور کی دی ہوئی پھانس پہ پھایا رکھنے کو سوچا۔ یہ تو میری سوچ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کہہ رہا ہے کہ میرے دوستوں کو کوئی خوف اور غم نہیں ہوتا تو غلط تو نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اُس ذات سے دوستی کے سبب بندے کے اندر کوئی ایسی طاقت حلول کر جاتی ہو کہ وہ خوف اور غم کو محسوس ہی نہ کرتا ہو۔ خوف اور غم کو محسوس ہی نہ کرنا تو بے حسی جیسی کیفیت ہوئی۔ اس نے سوچا۔ لیکن بابا جی کے قول کے مطابق تو بندے کو اللہ کے دوستی کرنے کے لئے خوف اور غم سے خود نجات پانا ہوتا ہے۔ اس پر اُس کے شعور نے اُس کو پھر سے حیرت سے چھیڑتے ہوئے کہا۔ واہ یہ عجب رہی۔

اُس نے خود کو تسلی دینے کو سوچا کہ اتنا مغز کھپانے کی کیا ضرورت ہے وہ اس مسئلے کو انہی سے کیوں نہ حل کرنے کی درخواست کرے جن کی بات سن کر وہ اس بات کو ایک نئے زاویئے سے سوچنے کا ارادہ کر بیٹھا تھا۔ فکر کے اُس نئے زاویئے سے اُس کو جو الجھن درپیش ہوئی وہ اس کو حل کروانے کو انہی سے کیوں نہ رجوع کرے تاکہ اُس کو اُن کی بات سمجھنے میں جو اشتباہ ہو رہا ہے وہ اس سے بچ سکے۔ وہ ضرور اس گتھی کو سلجھا دیں گے۔ یہ سوچتے ہوئے اُس نے ان سے فون پر رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

اُسی شام وہ اُن سے بات کر رہا تھا۔ اُس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے جب اُن سے یہ کہا کہ وہ قلندر بابا اولیاؒ کے عرس کے موقع پر اُن سے ملا تھا اور کئی روز تک اُن کی میزبانی سے سرفراز ہوا تھا تو انہوں نے فوراً کہا جی ہاں آپ احمد صاحب کے ہمراہ پشاور سے آئے تھے۔ اُس کو اُن کی یادداشت اور حافظے کی توانائی پہ حیرت ہوئی۔ انہوں نے اُس سے احمد صاحب کی خیریت دریافت کی۔ اُس نے اُن کو اپنی الجھن سے آگاہ کیا کہ خوف اور حزن تو ایک لازمہ حیات ہیں ان سے نجات بھلا کیسے اور کیوں کر ممکن ہو سکتی ہے اور اگر اللہ سے تعلق اور ربط استوار ہونے کے سبب ان سے پناہ مل بھی سکتی ہو۔ اور اللہ سے تعلق کے بعد تو ہو سکتا ہے کہ ایسا ممکن ہو جائے۔۔۔ جبکہ آپ نے فرمایا تھا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنی دوستی کی شرائط بیان کرتا ہے۔ یعنی آپ کے مطابق پہلے انسان خوف اور حزن سے نجات پالے تو پھر اُس کو اللہ کی دوستی نصیب ہو سکتی ہے۔ اس بات کو سمجھنے میں وہ اُن سے راہنمائی کا خواستگار ہے۔

انہوں نے اُس کی بات تحمل اور دلجمعی سے سننے اور اس کا لطف لیتے ہوئے۔" مجھے میرے مرشد کریم حضور قلندر بابا اولیاؒ نے ایک شعر سنایا تھا۔ یہ ذرا طویل بحر میں ہے۔

ہر خوشی اک وقفۂ تیاری سامانِ غم

ہر سکون مہلت برائے اضطراب و امتحان

شعر سنا کر فرمایا۔ جب تک انسان کسی چیز کی کنہ ۔۔۔ بات کی تہہ تک نہ پہنچ جائے۔۔ وہ حقیقت سے واقف نہیں ہو سکتا۔ غور و فکر کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خوف کی کنہ یا اصل یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک سوال ابھرتا ہے ۔۔۔ کیا ہو گا ؟ اب یہ کیا ہو گا ۔۔۔ کی تکرار ۔۔۔ خوف اور ڈر کی کیفیت کی صورت یا مظہر بنتی ہے۔ اس طرح کیوں ہوا ؟ کا سوال حزن اور غم ہے۔ یعنی جب انسان کسی بارے میں یہ چاہتا ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے مگر ویسا

ہو جائے تو یہ سوال یعنی یہ کیوں ہوا؟ ۔۔اُس کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔اُس کا ذہن اس بات کی تکرار میں پڑ جاتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا، ایسا تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔۔۔ یہ سوال ابھرنا اور اُس کا ذہن میں جڑ پکڑنا غم ہوا۔۔حزن ہوا یعنی اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اُس کی دوستی ہو جائے تو اُس کو ان دونوں سوالوں ۔۔۔یعنی کیا ہو گا اور کیوں ہوا؟۔۔۔سے جان چھڑانا ہو گی۔

بھئی جب آپ نے اللہ تعالیٰ کو اپنا دوست مان لیا اور چونکہ وہ فاعلِ حقیقی اور مختارِ کل ہے، اب آپ کو دوستی میں یہ بات کہاں زیب دیتی ہے کہ آپ اپنے دوست سے یہ پوچھیں کہ وہ کیا کرے گا یا یہ کہ اُس نے ایسا کیوں کیا؟ اور پھر اللہ اپنے دوست کے لئے جو بھی کرے گا بہتر ہی تو کرے گا اور جہاں تک دنیاوی معاملات کے حوالے سے خوف اور حزن کا تعلق ہے تو یاد رکھیں کہ کسی چیز کے چھن جانے کا اندیشہ خوف ہوتا ہے اور جب وہ چیز واقعی چھن جاتی ہے تو غم اور حزن لاحق ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر آدمی اس دنیا کو ایک مسافر خانہ، ایک ہوٹل یا بحری جہاز یا ٹرین سمجھ لے اور اس دنیا کی زندگی کو عارضی تسلیم کر لے تو اُس کو یہ یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ جو کچھ اُس کو اس دنیا میں استعمال کے لیے دیا گیا وہ وقتی، لمحاتی اور عارضی ہے تو اُس کے چھن جانے کا ڈر بھی نہیں رہے گا اور وہ غم اور حزن سے بھی محفوظ ہو جائے گا۔ وہ دنیا میں حاصل سہولتوں کو مسافر خانے، ہوٹل، بحری جہاز یا ٹرین میں میسر سہولتوں کی طرح استعمال کرے لیکن اُن میں دل نہیں لگائے گا۔"

کب بات ختم ہوئی۔ اُسنے شکریہ ادا کیا یا نہیں، اُس کو صرف اتنا احساس تھا کہ انہوں نے اُس کو دعا دیتے ہوئے یہ کہا تھا۔"اللہ آپ کو خوش رکھے!" اور اُن کے اس کہنے کے ساتھ ہی خوشی کی ایک لہر نے اُس کے پورے وجود کو اپنی آغوش میں اُٹھا لیا تھا۔ اُس نے اپنے شعور کو دم بخود اور سرشار دیکھا۔

استوار تعلق

دفتر میں ڈاک دیکھتے ہوئے ایک لفافے نے اُس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ لفافہ عام کاروباری خطوط کے انداز سے ہٹ کر تھا۔ پتہ لکھنے میں جس طرح سے اُسکا نام لکھا گیا تھا، وہ اُس کو اچھا لگا۔ اُس نے خط کھولا۔ خط میں ایک کتاب کی تقریب رونمائی کی بابت یک ورقی پمفلٹ کے ہمراہ اُس کے ایک جاننے والے نے لکھا تھا کہ اگر ممکن ہو تو اُس تقریب میں ضرور شریک ہو۔ اُس نے خط پڑھ کر پمفلٹ پر ڈالی اور اسے بمع خط جیب میں ڈال کر اپنے روز مرہ کاموں میں مصروف ہو گیا۔

اُس روز وہ رات گئے تک دفتری کاموں میں مصروف رہا۔ رات کو گھر پہنچ کر کھانا کھا کر وہ سونے چلا گیا۔ اگلے روز صبح جب وہ دفتر جانے کو تیار ہوا اور گزشتہ رات میں اتارے گئے کپڑوں میں سے پرس نکالنے لگا تو وہ خط بھی اُس کے ہاتھ آ گیا۔ اُس نے اُسے دوبارہ پڑھا۔ ''محمد رسول اللہ ﷺ'' نامی کتاب کی تقریب رونمائی لاہور کے ایک ہوٹل میں ہونا طے پایا تھا۔ کتاب کے مؤلف خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب اور کتاب دونوں کا تعارف اُس پمفلٹ میں مذکور تھا۔ مؤلف کے نام نے اُس کے ذہن میں ایک یاد سی جگا دی۔ وہ اُس کے دوست احمد صاحب کے مرشد تھے اور وہ انہی کے حوالے سے اُن سے ملنے کراچی گیا تھا۔ اُس کو اپنا کراچی جانا، اُن سے ملنا ایک خواب کی سی صورت یاد تھا۔

اُس وقت وہ اُسی ملاقات کی یاد کے حوالے سے اُس کی نگاہوں میں اُن کی صورت پھرنے لگی تھی۔ انہوں نے اُس وقت اللہ رب العالمین کے محبوب رحمتہ للعالمین ﷺ کی روحانی زندگی اور اُن ﷺ کے معجزات کی سائنسی توجیہ اور تشریح کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''یہ بہت ضروری ہے۔'' اور اب یہ دعوت نامہ۔۔۔ تو گویا

انہوں نے اپنا کہا خود ہی پورا کر دکھایا ہے۔ اُس خط میں مذکورہ تاریخ پڑھ کر اُس نے اندازہ لگایا کہ وہ اُس پروگرام میں بآسانی شریک ہو سکتا ہے۔ اُس نے اپنی بیوی کو بتایا کہ وہ ایک دو روز کے لئے لاہور جائے گا۔ اُس کا بیگ تیار کر دے۔

دفتر پہنچنے تک اُس کے دھیان میں احمد صاحب اور بابا جی کی باتیں گزرتی رہیں۔ وہاں کراچی جا کر اُن سے ملنا ،اُن کی پرتپاک میزبانی، شفقت بھرے انداز میں دل موہ لینے والی باتوں کا رنگ اُس کے حافظے سے یوں تو کبھی بھی محو نہیں ہوا تھا لیکن آجو وہ سب کچھ ایک بار پھر سے تازہ ہو کر ابھر آیا تھا۔ وہ کتاب سے زیادہ مؤلفکتاب سے ملاقات میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اُن سے ملنے کے اشتیاق نے اُس کو لاہور جانے پر آمادہ کیا تھا۔ نہ جانے وہاں اُن سے ملاقات ہو بھی سکے گی یا نہیں؟ وہاں اُن کی مصروفیات کی نہ جانے کیانوعیت ہو اُس کے ذہنمیں ایک وسوسہ لہرایا تو اُس نے خود کو تسلی دیتے ہوئے سوچا۔ ''اگر بالمشافہ ملاقات نہ بھی ہو سکی تو اُس تقریب میں وہ جو کچھ کہیں گے وہ بھی اُس کے لیے بہت کچھ ہو گا۔''

اگلے ایک دو روز مصروفیات کے دوران بھی رہ رہ کر اُس کو لاہور جانے اور بابا جی سے ملنے کا خیال آتا رہا۔ کراچی سے واپس آنے کے بعد اُس وقت تک وہ اُن کی لکھی تقریباً تمام کتابیں پڑھ چکا تھا۔

لاہور پہنچ کر وہ سیدھا اُس فائیو سٹار ہوٹل میں پہنچا جہاں کتاب کی تقریب رونمائی ہونا تھی۔ وہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ اپنے جلدی پہنچ جانے پر تھوڑا خجل خجل سا ہوٹل میں داخل ہوا کہ وہ وقت ، وہ وہاں لاؤنج میں بیٹھ کر گزارے گا۔ اندر داخل ہونے پر وہاں لوگوں کی چہل پہل دیکھ کر اُس کو اپنی خجالت کم ہوتی محسوس ہوئی۔ وہاں بہت سے لوگ اُس سے بھی پہلے ہی موجود تھے۔ اُس کو اُن میں کوئی بھی شناسا صورت نظر نہیں آ رہی تھی لیکن اُس کو

اجنبیت کا احساس بھی نہیں ہو رہا تھا۔ ہوٹل کے ہال میں پہنچ کر اُس نے سجے سٹیج اور ڈائس کو دیکھ کر طمانیت سی محسوس کی۔

اُس وقت ہال میں چار سو کے قریب افراد موجود تھے۔ ڈائس کے بائیں طرف ایک دروازہ نما بورڈ پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ سامنے ایک میز پر رونمائی کی منتظر کتاب کو سجا کر رکھا ہوا تھا۔ ڈائس کے پیچھے اور دیواروں پر کپڑے کے بینروں پر مؤلفکتاب کے اقوال، آفاقی سچائیوں کی طرف توجہ مبذول کروا رہے تھے وہ ہال میں آویزاں فانوسوں اور روشن جھاڑوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ کسی کتاب کی تقریب رونمائی میں اتنے لوگوں کی موجودگی، لوگوں میں کتب بینی کے ذوق کی علامت کہی جا سکتی ہے یا نہیں؟

وقت دھیرے دھیرے سرکتا جا رہا تھا۔ ہال میں مزید کرسیاں آ رہی تھیں۔ کرسیوں پر لوگ براجمان ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اتنے میں اُس کو اپنا وہ دوست نظر آیا جس نے اُس کو اُس تقریب میں مدعو کیا تھا۔ وہ اُس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا، دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ دونوں آپس میں سرگوشی کے سے انداز میں باتیں کر رہے ہیں۔ یہ اُس تقریب کا احترام تھا یا لوگوں کی سماعتوں سے بچنے کی کوشش۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اتنی دیر میں وہاں احمد صاحب بھی آ گئے۔ انہیں دیکھ کر وہ اُن سے ملنے بڑھا۔ اُس کو وہاں دیکھ کر انہوں نے حیرت اور مسرت کا ملا جلا اظہار کیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت گزارنے کی بجائے وہ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہاں موجود تمام لوگ اپنے اندر ایک دھیما دھیما سا نظم و ضبط سموئے ہوئے ہیں۔

اچانک ہال میں روشنی بڑھ گئی۔ اُس نے اپنی پشت کی طرف موجود داخلے کے دروازے کی طرف رخ پھیرا۔ کیمروں کی فلیش لائٹس کے بلب جل اُٹھے تھے۔ سب غیر ارادی طور پر اپنی اپنی جگہوں پر ایستادہ کھڑے ہوتے چلے

گئے۔ ہوا کے لطیف جھونکے کی مانند، مسکراتے ہوئے، وہ اُس کے قریب سے گزرتے چلے گئے۔ وہی پر سکون چہرہ، وہی میٹھی سی مسکان، وہی دلفریب اندازِ خرام، جو اُس کے دل و دماغ میں اُن کی یادوں کی صورت بسا ہوا تھا۔ سب انہی کو دیکھ رہے تھے کوئی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کی مہلت اور فرصت ہی نہیں رکھتا تھا۔ اُس کے اپنے دل میں نہ جانے کہاں سے اتنا احترام امڈتا چلا آرہا تھا۔ اُس کی نگاہیں عقیدت و احترام سے اُن کے رخ روشن کا طواف کئے جا رہی تھیں۔

وہاں موجود لوگوں کی عقیدت بے طرح ہونے کے باوجود نہایت منظم طور پر تمیز اور سلیقے کی حدوں میں قائم تھی۔ کوئی اپنی نشست چھوڑ کر اُن سے ہاتھ ملانے کے لئے نہیں لپکا۔ وہاں اتنے بہت سے عقیدت مندوں کے موجود ہونے کے باوجود کوئی ہڑ بونگ نہیں مچی۔ اس سے اُن کے عالی وقار ہونے کا پتہ چلتا تھا۔ سب اپنی اپنی جگہ کھڑے انہیں اپنی آنکھوں میں سمیٹ رہے تھے، اپنے دلوں میں اتار رہے تھے۔ وہ اپنے لئے مخصوص کی گئی نشست تک گئے اور بیٹھ گئے۔ اُس بیٹھنے میں تمکنت یا تفاخر نہیں بلکہ انکسار اور خوشدلی نمایاں تھی۔

سب بیٹھ گئے۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہال کی تمام کرسیاں بھری ہوئی تھیں۔ کئی افراد دیواروں کے قریب کھڑے تھے۔ ہال گنجائش سے زیادہ افراد کو سمیٹے ہوئے تھا۔ کمپیئر نے صدر مجلس، مؤلفکتاب اور مقررین کو سٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ سب اپنی اپنی نشستیں سنبھال چکے تو تقریب کا آغاز تلاوتِ کلامِ پاک سے کرنے کے بعد صدر مجلس نے مؤلفِ کتاب کو اپنے ساتھ کھڑا کر کے کتاب کی رونمائی کی۔ اُس وقت دروازے سے پردہ سرکا اور اُس کے نیچے سے کتاب کا ٹائٹل بر آمد ہوا۔ دروازے کی جسامت کا ٹائٹل۔۔ اُس کو یوں محسوس ہوا کہ وہ زبان حال کہہ رہا ہے کہ اس راہ پر آنے والوں کو محمد رسول اللہ ﷺ کی عنایتیں نصیب ہوں گی۔ رنگ و نور کی ایک قوسِ قزح

بکھرتی چلی گئی۔ کمپیئر نے اعلان کیا کہ یہ محفل کتاب کی رونمائی کے حوالے سے ایک مذاکرہ بھی ہے۔ اس میں مقررین حضور ﷺ کی سیرت پر لکھی گئی اس کتاب کے چیدہ چیدہ پہلوؤں کا جائزہ لیں گے۔

اسٹیج پر کل سات کرسیاں رکھی گئی تھیں جن میں سے ایک پر بزرگ سی خاتون بھی تشریف رکھے ہوئے تھیں۔ اُن کا اعزاز یہ تھا کہ وہ تحریکِ پاکستان میں شامل تھیں اور پنجاب سیکرٹریٹ پر انہوں نے اپنا آنچل بطورِ پرچمِ پاکستان لہرایا تھا۔ صدرِ مجلس محمود قریشی صاحب کے ایک طرف مؤلف اور اشفاق احمد بیٹھے ہوئے تھے۔ اشفاق احمد کا شہرہ ایک ڈرامہ نگار کا ہے۔ اُن کی موجودگی پر اُسے ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ سب مقررین نے اپنا اپنا خیال واضح کیا۔ کمپیئر ہر قرار کا مقرر بڑے جاندار انداز میں کرانے کے بعد انہیں ڈائس پر مدعو کرتا رہا۔ سب لوگ مقررین کو بڑے دھیان سے سُن رہے تھے۔ وہ بھی سُن تو رہا تھا لیکن اس کی نگاہیں مؤلف کتاب پر مرکوز تھیں۔ وہ اُن کی ہر حرکت، ایک ایک جنبش کو دیکھے چلا جا رہا تھا۔ جب اشفاق احمد کی باری آئی تو ڈائس پر اپنے مخصوص اسٹائل میں ڈائس کا سہارا لے کر کھڑے ہو کر انہوں نے کہا۔

"جب مجھے اس تقریب رونمائی میں شرکت کی دعوت ملی اور کچھ کہنے کی شرط بھی لگائی گئی تو میں نے بہت سوچا کہ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ایک طرف حضور نبی کریم ﷺ جیسی ہستی اور دوسری طرف اُن ﷺ پر لکھنے والے الشیخ خواجہ شمس الدین عظیمی جیسا بندہ۔ میں تو اس کتاب کو ایک اونچی میز پر رکھ کر ایک سفید کبوتر کی طرح اس کے گرد رقص ہی کر سکتا ہوں۔" یہ سن کر اُس کو یوں لگا کہ انہوں نے اس کے دلی جذبات کی عکاسی کر دی ہو۔ سبھی نے بھرپور داد دی تو اُس نے جانا کہ انہوں نے وہاں بیٹھے سب ہی کی نمائندگی کر دی ہے۔

اُس کے بعد انہوں نے انسانی زندگی کے مادی، ذہنی اور روحانی پہلوؤں کا ایک تمثیلی انداز میں بیان کرنے کے بعد ایک مشہور اداکار کے حوالے سے ایک واقعہ سُنایا۔ وہ اداکار اپنے گھر میں نجی طور پر ایسی محفل سجاتا تھا جہاں گنے چنے افراد آیا کرتے تھے۔ کبھی کبھار میں بھی اُن میں شامل ہو جایا کرتا تھا۔ ایک بار اس کے یہاں ایک بزرگ آئے ہوئے تھے صورت اور حلیے سے فقیر ہی دکھائی دیتے تھے۔ اُس اداکار کی ایک خوبی جس کا عام لوگوں میں کچھ زیادہ شہرہ نہ تھا، یہ تھی کہ وہ تلاوتِ کلام پاک حسنِ لحن سے آراستہ کرنا جانتا تھا، اُس روز اُس نے سورہ مزمل کی تلاوت کی۔ سب نے بہت لطف لیا۔ اُس کے بعد اُن بابا جی سے کچھ سنانے کی فرمائش کی گئی۔ کچھ ردوکد کے بعد انہوں نے بھی سورہ مزمل ہی کی تلاوت کی۔ ہمیں نظر تو نہیں آیا لیکن یوں محسوس ہوا کہ وہ کمرہ نور سے بھر گیا ہو۔ اُن کی تلاوت میں کچھ ایسا ہی اثر تھا۔ جب وہ تلاوت کر چکے تو میزبان نے کہا کہ یہ بابا جی قرآن والے کو جانتے ہیں۔ اس لئے ان کی تلاوت اتنی موثر ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے ایک عجیب سے لہجے میں یہ کہہ کر اپنی بات مکمل کر دی۔ اس کتاب کے حوالے سے، اس کو پڑھنے کے بعد، میں اتنا ضرور کہوں گا کہ مؤلفکتاب عظیمی صاحب۔۔۔ صاحب کتاب کو ضرور جانتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ ڈائس سے ہٹ گئے۔

سب نے اپنی پسندیدگی کے اظہار کو بہت تپاک سے تالیاں بجائیں۔ کمپیئر نے صدر مجلس کو دعوت کلام و اظہار خیال دی۔ صدرِ مجلس کے خطاب کے دوران اُس نے بھرپور کوشش کی کہ اُن کی تقریر پر توجہ مرکوز رکھے لیکن اُس کی نگاہوں کے سامنے سفید کبوتر اُڑتے رہے۔ کبھی وہ اُس ہال میں نور بھرا دیکھتا اور کبھی اُس کے سامنے بیٹھے مؤلفکے سوا ہر چیز عدم میں غائب ملتی۔ کبھی اُس کتاب کے ٹائٹل کے رنگ پھیلتے اور اُس کی نگاہیں اُن رنگوں سے لبریز ہو جاتیں

اور کبھی وہ خود کو اُس قوسِ قزح کی سیڑھی پہ سے ہوتا ہوا، اس کے دوسرے سرے پر بیٹھے مؤلفکی گود میں گرتے دیکھتا ۔ شاید نیند اور تھکن کے باعث اُس کے حواس بے قابو ہو رہے تھے۔

جب کمپیئر نے مؤلف کتاب کو ڈائس پر آنے کی دعوت دی تو مؤلفکے ساتھ ساتھ ہال میں موجود تمام مرد و زن اُٹھ کھڑے ہوئے ۔ اُس نے تالیوں کی گونج میں مؤلفکو ڈائس تک جاتے دیکھا۔ انہوں نے کوئی بات کہنے کی بجائے تلاوت کلام پاک کا آغاز کیا۔ سورہ حشر کی آخری آیات کی تلاوت انہوں نے کچھ اس انداز اور ایسے لحن میں کی وہاں بیٹھے ہوئے سب ہی افراد بے خود ہو گئے۔ وہ تلاوت محض تلاوت نہ تھی سوز و گداز کا بہتا رنگ ، مفہوم کا بہاؤ ، اتنا جاندار کہ اُس کو لگا کہ اُس کا دل پھٹ کر دو لخت ہو جائے گا۔ اُس کو عربی کہاں آتی تھی لیکن آج اُس کو یہ بات سمجھ آ رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کے لرزاں و حیراں ہو کر خشیت الٰہیہ سے ریزہ ریزہ ہونے کی بات کہہ کر انسان کو کیا سمجھایا ہے۔ وہ دم بخود اُس آہنگ کو سُن رہا تھا۔

صوتِ سرمدی اس کے سوا اور کیا ہو گا؟ آج تک اُس نے جتنے بھی لوگوں سے کلامِ پاک کی تلاوت سماعت کی تھی اُن سب میں آواز کے اُتار چڑھاؤ، صوت اور آہنگ لے اور تال کا بھرپور تاثر ہوتا تھا۔ لیکن آج اُن کی تلاوت میں ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ مفہوم و معنی کی لہریں اُس کے شعور میں داخل ہوتی، اُس کے اندر وجدان کے پٹ وا کر رہی تھیں۔ اُس نے محسوس کیا کہ یہ لہریں اُس کی سماعت کے راستے ہی نہیں بلکہ ہر ہر مسام کے راستے اُس کے اندر داخل ہو رہی ہیں۔ اُس کو سیراب کر رہی ہیں۔

اُس نے آنکھوں میں اُمڈتے پانی کی اوٹ سے سٹیج کی طرف دیکھنے کی سعی نا تمام کی۔ سب کچھ گڈمڈ ہو چکا تھا۔ منظر روشنیوں کی مختلف لہروں میں بٹ کر رنگوں میں دھل گیا تھا۔ اُس نے آنکھوں سے بہتے پانی کو حیرت کے تاثر سے

رومال میں جذب کرتے کن انکھیوں سے اپنے ارد گرد دیکھا کہ کسی نے اُس کو آنسو پونچھتے دیکھا تو نہیں لیکن سب ہی پتھرائے ہوئے سامنے ڈائس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُس وقت پورے ہال میں اُس نے سوائے تلاوت کے لئے ہلتے لب و دہن کے کوئی جنبش تک نہیں دیکھی۔

کب وہ تلاوت ختم ہوئی کب انہوں نے صدق اللہ کہہ کر اپنی بات کا آغاز کیا۔ کسی کو خیال ہی نہیں آیا کہ جزاک اللہ ہی کہہ دے۔ شاید وہاں ان رسمی باتوں کی گنجائش ہی نہ تھی۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے اندر ایک اجالا سا پھیل گیا ہے، شاید اندر کا اندھیرا چھٹ رہا تھا۔ کچھ پو پھوٹنے کا سا منظر تھا۔ کثافتیں دُھل جائیں تو تزکیہ کہلاتا ہے۔ اُس نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے سوچا۔

مؤلفکتاب نے اپنی تالیف کی بابت حضور نبی کریم ﷺ کی نسبت کے حاصل ہونے اور اُن کے معجزات کی روحانی سائنس کے حوالے سے تشریح کرنے کی خواہش، اُس کی ضرورت اور توفیق عطا ہونے کی بات سُنا کر روحانی علوم کے عام کرنے کی ضرورت پر اصرار کے بعد بہت ہی شگفتہ انداز میں فطرت انسانی کو واضح کرنے کو ایک لطیفہ سُنا کر محفل کو کشتِ زعفران بناتے ہوئے۔۔۔ وہاں موجود لوگوں کو اُن کے سعید ہونے کی اطلاع دی کہ وہ سب وہاں اُن کی کاوش کو سراہنے آئے اور یہ خود اُن کی بھی سعادت ہے۔

اُن کی اس تقریرِ دلپذیر کے بعد چائے کی دعوت نشر ہوئی۔ سات آٹھ سو افراد کے چائے پینے کے دوران کسی پلیٹ کے گرنے کا کوئی چھناکا نہیں ہوا۔ اُس نے کسی چمچ کے گرنے تک کی آواز نہیں سُنی۔ اُس فائیو سٹار ہوٹل میں ایک عجیب مدھم اور مدھر سا نظم و ضبط دیکھنے میں آرہا تھا۔ چائے کے دوران اکثر لوگ منتظمین کو مبارک باد دے رہے تھے اور وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے خوش مزاجی سے مہمانوں کی آمد اور اُن کے تعاون پر اُن کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔

اُس کو یہ سب کچھ بہت ہی بھلا لگ رہا تھا۔ اُس نے چائے پی اور ہوٹل سے باہر آکر وقت دیکھا شام کے آٹھ بج رہے تھے۔۔ وہ چھ گھنٹے اُس ہوٹل میں ایک ہی جگہ بیٹھا رہا تھا۔ یہ بات اچنبھا بن کر اُس کے حواس میں داخل ہوئی اور حیرت نے اُس کو جتایا کہ وہ بالکل بھی تھکا ہوا نہیں ہے بلکہ اُس کو اپنے اندر بالیدگی اور انشراح کا ایک احساس ہلکورے لیتا محسوس ہو رہا تھا۔

کار پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ اشفاق صاحب بھی اُدھر ہی آرہے ہیں۔ اُس کے جی میں آیا کہ وہ اُن سے بات کرے۔ اُن سے دریافت کرے کہ انہیں اُس بابے کے تلاوت کا لطف زیادہ آیا تھا یا آج بابا جی کی تلاوت کا۔ لیکن کسی خیال نے اُس کے بڑھتے قدم تھام لئے۔ کیا وہ خود اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ اب اگر اُن کا جواب نفی میں بھی ہوتا تو کم از کم وہ اُس کی دلجوئی کو ہی سہی اس کا اظہار تو نہ کرتے اور پھر جو خود اُس کا اپنا وجدان کہہ رہا تھا اُس کی تصدیق کی اُس کو ضرورت ہی کیا تھی۔ اُس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اپنے دوست سے پوچھا کہ عظیمی صاحب سے ملاقات کی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟ ''ہاں۔۔ کیوں نہیں۔۔ کوشش کر دیکھتے ہیں۔'' سُن کر اُس کو اک گونہ اطمینان سا ہو گیا۔

وہ رات اُس نے اپنے دوست کے یہاں بسر کی۔ اگلے روز وہ دونوں صبح سویرے لاہور کے مضافات میں واقع مراقبہ ہال جا پہنچے۔ وہاں اُس کو احمد صاحب ملے۔ اُس نے اُن سے اپنے دوست کا تعارف کروانے کے بعد بابا جی سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ انہوں نے بتایا کہ آج ایک میٹنگ ہے، بابا جی اُس سلسلے میں مصروف ہوں گے اگر وہ کچھ دیر انتظار کر سکیں تو شاید کوئی موقع بن جائے۔ گومگو کی کیفیت میں اُس نے اپنے دوست کی طرف دیکھا۔ اُس نے تائید میں سر ہلا دیا۔ وہ دونوں انتظار کرنے پہ آمادہ و تیار تھے۔

وہاں مراقبہ ہال کے وسیع لان میں کئی افراد ٹولیوں میں بکھرے آپس میں مختلف موضوعات پر دھیمے دھیمے تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ سب کی گفتگو کا مرکز و محور روحانی علوم اور اپنے مرشد کی ذات اور اُن کی باتیں تھیں۔ ایک ٹولی میں ایک صاحب جو گزشتہ شام کی تقریب کے منتظمین میں سے تھے، ساتھیوں سے بات کرتے ہوئے بتا رہے تھے۔ ہم نے ساڑھے سات سو کارڈ چھپوائے تھے۔ ہوٹل والوں سے اتنی ہی کرسیاں رکھنے کو کہا گیا تو انہوں کہا۔ آج تک اُس ہوٹل میں کسی کتاب کی رونمائی کی جتنی بھی تقریبات ہوئی ہیں اُن میں کبھی بھی ڈیڑھ سو سے زائد افراد نہیں آئے۔ ہم چار سو کرسیاں لگوادیں گے اور جب تقریب کا آغاز ہوگا تو باقی کرسیاں اٹھوادیں گے ورنہ خالی کرسیاں بُری لگیں گی۔ وہ ہنستے ہوئے بتا رہے تھے ہم نے انہیں کہا کہ آپ کو چار سو کرسیاں مزید رکھنی پڑیں گی اور اللہ کا شکر ہے کہ ایسا ہی ہوا۔

ایک دوسرے صاحب نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے تعاون بھی بہت کیا۔ جب سب لوگ کھا پی کر جا چکے تو انہوں نے دیکھا کہ ڈشز میں کھانے کی اشیا وافر مقدار میں موجود تھیں۔ اُس نے دل ہی دل میں تائید کی اور سوچا کہ کھانا بچنے کی ایک وجہ ہوٹل والوں کے تعاون کے ساتھ ساتھ شرکا کا مہذبانہ روّیہ تھا۔ ورنہ ایسے موقعوں پر تو آج تک ایک ہڑنگ بونگ ہی دیکھی تھی۔ لوگ ضد اور مقابلے میں کھانا کھانے کے بجائے اُس کو ڈکارتے چلے جاتے ہیں۔ مہمانوں کے روّیے میں اظہار تہذیب و شائستگی کی وجہ اُن کی تربیت اور وہاں موجود کسی محترم بندے کا ادب و احترام ہی ہو سکتا تھا۔

وہ ایسی ہی باتیں سُن اور سوچ رہا تھا۔ اُس کے ذہن میں اچانک ہی ایک ٹھہراؤ سا در آیا تھا۔ اُس کے اندر خیالوں کی اچھل کود قرار کے قریب پہنچ کر رُک گئی تھی۔ اُس کو عظیمی صاحب سے ملنے کی بے تابی نہ رہی تھی۔ اُس کو

اُن سے کیا کہنا تھا، اُس کو اُن سے کیا کہنا چاہیے تھا، اُس کو یہ سوچیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ اُس نے یوں بھی اُن سے کہنے کو کوئی جملہ یا کوئی تقریر تیار نہیں کی تھی۔ وہ تو محض کچھ لمحے ، کچھ ساعتیں اللہ کے اُس بندے کے قرب میں گزارنا چاہتا تھا جو نہ صرف رحمۃ للعالمین بلکہ رب العالمین سے بھی ایک استوار تعلق رکھتا تھا، تاکہ وہ بعد میں اس بات پہ فخر کر سکے کہ وہ اُن سے ملا تھا، وہ اُن کو جانتا تھا، اُس نے اُن سے باتیں کی تھیں، اُن کی باتیں اُس نے اُن کے قریب بیٹھ کر سُنی تھیں۔

اتنے میں لاہور مراقبہ ہال کے انچارج میاں مشتاق احمد کمرے سے باہر آئے اور کسی کو کچھ بتانے لگے۔ احمد صاحب نے موقع غنیمت جانا اور اُن سے بات کرنے آگے بڑھ گئے۔ میاں صاحب نے سر جھکا کر اُن کی بات سُنی اور کہا۔۔ ہاں ہاں ۔۔۔ کیوں نہیں۔ یہ ایک طرح سے اُن کی باریابی کا اشارہ تھا۔ وہ اُن کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئے۔

کمرے میں دیوار کے ساتھ لگے تخت پوش پر دونوں ہاتھ کناروں پہ ٹکائے ، سر کو آگے جھکائے ہوئے بیٹھے ، اللہ کے دوست نے نظر اُٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ سب فرش پر نیچے ہی بیٹھ گئے ۔ تعارفی جملوں کے بعد اُس نے گزشتہ شام تقریب میں اُن کی کتاب کی کامیاب اور پر وقار رونمائی پر تہنیت پیش کی تو انہوں نے کہا۔ ''اجی سب کچھ کرتا اللہ ہے ۔۔۔ نام بندے کا کر دیتا ہے۔''

''جی بلاشبہ !''۔۔ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اُس کے پاس کہنے کو تھا ہی کیا۔ لیکن اُس لمحے تو خود کو بالکل ہی تہی دامن محسوس کر رہا تھا۔

اچانک وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا اور کھسک کر کچھ آگے ہوا اور اُن سے مخاطب ہو کر۔۔۔ جذ بات سے عاری لہجے میں کہا۔۔ ''حضور آپ مجھے اپنی سرپرستی میں لے لیں۔''

جواب میں ایک گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا گیا۔ ''ابھی تو ہمیں خود سرپرستی کی ضرورت ہے۔'' عجز و انکساری کی بہت سی صورتیں ہوں گی لیکن اتنی لطیف اور کامل صورت انکساری اُس نے اپنی زندگی میں اس سے پیشتر کبھی نہیں دیکھی تھی نہ سنی تھی۔ بات بگڑ چلی تھی۔ اُس کی درخواست رد ہونے کو تھی۔ وہ تڑ کر بول اُٹھا۔

''میں اپنے والدین کے لئے بچہ ہی ہوں۔ حالانکہ اب میرے اپنے بچے ہیں۔ آپ خود سے بڑوں کی سرپرستی کی طلب رکھتے ہوں گے۔۔۔ میرے لیے تو آپ ہی بڑے ہیں۔ میں تو آپ کو ہی بڑا جانتا ہوں۔۔ میں تو آپ ہی سے درخواست کروں گا۔ میں تو کسی اور کو جانتا ہی نہیں۔''۔۔۔ یہ کہتے کہتے اُس پر اپنی بے بسی اور بے کسی کا اتنا زیادہ غلبہ ہو گیا، اُس کو لگا کہ وہ گر جائے گا۔ اُس نے سہارے کی تلاش میں اپنے سامنے زمین پر رکھے اُن کے پیروں پہ ہاتھ رکھ دیئے۔

انہوں نے دھیرے سے پاؤں پیچھے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ نے فارم بھرا ہے؟''

منہ سے اُس نے ''جی نہیں'' کہا اور حیرت میں ڈوب کر سوچا۔۔ فارم؟ کون سا فارم؟

انہوں نے میاں صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میاں صاحب ان سے فارم بھروایئے۔''

میاں صاحب نے اُٹھ کر الماری سے سلسلے کا داخلہ فارم نکال کر اُسے دیا۔ فارم پُر کر کے اُس نے اُس پر دستخط کر کے میاں صاحب کے حوالے کیا۔ میاں صاحب نے وہ فارم اُس سے لے کر اُن کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے فارم پر اجازت کا لفظ لکھا۔ اپنے دستخط ثبت کر کے فارم میاں صاحب کو واپس تھما دیا۔

میاں صاحب ، احمد صاحب اور کمرے میں موجود دیگر افراد نے اُس کو مبارک باد دی کہ اب وہ بھی بابا جی کے شاگردوں میں شامل ہو گیا ہے۔ اُس کو لگا وہ تپتے صحرا میں سفر کرتے کرتے یک دم ایک ہی ہلے میں ، اچانک ایک سایہ دار وادی میں داخل ہو گیا ہے اور ایک چھتنار سائے نے اُس کو اپنی آغوش میں بھر لیا ہو۔ اُس وقت تک کی ساری زندگی اُس کو ایک بے سمت و کنار سفر لگنے لگی۔ اچانک ہی جیسے اُس کو ایک واضح منزل سامنے نظر آنے لگی ہو۔ خوشی سے اتنا بھر گیا کہ اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

اپنے گالوں پہ بہتے آنسوؤں کی اُسے اس وقت خبر ہوئی جب اُس کی سماعت میں ایک مدھر سی آواز داخل ہوئی ۔''اللہ آپ کو خوش رکھے۔'' اُس نے اپنے آنسو پونچھے اور اُس دُعا کو اپنے اندر اتر کر ایک انار کی طرح پھوٹتے دیکھا۔ ایک تیرہ و تاریک مقام پر چراغاں ہونے لگا۔ وہ انہی چراغوں کو دیکھتا پیچھے ہٹ کر اُٹھا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

دائرہ

راستے میں اس کے دوست نے اُس کے اس اچانک فیصلے کی بابت جاننے کو پوچھا تو الٹا اُس نے اپنے دوست سے پوچھا۔ بھلا تمہارے نزدیک میرے اس اچانک فیصلے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اِس پر اُس کے دوست نے ہنستے ہوئے کہا۔

؎ ''گر گویم زباں سوزد۔۔۔۔۔۔و گرنہ گویم، نہاں سوزد

میری بات تو ایک اندازہ ہی ہو گی، تم سناؤ میں تو تمہاری بات تم ہی سے سننا چاہوں گا۔''

اُس نے اپنے فیصلے کا خود ہی تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔ میں مرعوب ہو گیا تھا۔ میں آج تک اپنی ذات کے حصار میں۔۔۔اپنی انا کی گرفت میں۔۔۔اپنی ''میں'' کے دائرے میں ہی دیکھتا رہا ہوں۔ لیکن آج جب انہوں نے میرے مبارک باد دینے پر یہ کہا۔ سب کچھ اللہ ہی کرتا ہے اور نام بندے کا ہو جاتا ہے۔۔تو میرے اندر اپنی بڑائی کے جھوٹ کی قلعی اتر گئی۔ میں نے سوچا جو بندہ اتنا بڑا ہو جائے کہ وہ اللہ کا دوست بن جائے وہ تو اپنی بڑائی کا تذکرہ تک نہیں کرنے دیتا اور میں جو کچھ بھی نہیں، خود کو کہیں بھی نہیں پاتا، ہر وقت اپنی بڑائی اپنی ''میں'' کا ہی تذکرہ کرتا رہتا ہوں۔ ہر وقت اسی دُھن میں لگا رہتا ہوں کہ لوگ مجھے اکنالج کر لیں اور ایک وہ ہیں کہ دن رات اسی دُھن میں لگے ہوئے ہیں کہ لوگ اللہ کو اکنالج کریں۔ اس فرق نے مجھے ان کے سامنے اتنا چھوٹا کر دیا کہ اگر میں یہ نہ کہتا تو شاید میں ہمیشہ کے لیے معدوم ہو کر رہ جاتا۔ ضرب ابراہیمی کی کاٹ نے میری انانیت کے بت کو پاش پاش کر دیا تھا۔ اس وقت مجھے یوں لگا تھا کہ اگر میں نے ان کا دامن نہ تھاما۔۔۔تو شاید اللہ میاں مجھے کبھی نہیں مل سکیں گے۔ اُس وقت

میرے اندر سے صرف یہی ایک صدا اُبھری تھی کہ ان کو پکڑ لو ورنہ یہ موقع پھر کبھی نہیں ملے گا اور میں نے اپنے اندر ابھرتی اُس صدا کو مانتے ہوئے ایسا ہی کیا۔

اُس کے دوست نے اس کی بات سُن کر کہا۔ ''تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ دراصل جب تک آدمی خود کو ہی بڑا مانتا ہے وہ کسی کو اپنا ہادی، اپنا رہبر یا مرشد نہیں مان سکتا۔ جب بندہ کسی کو اپنے سے بڑا دیکھتا ہے، اس کو بڑا مان لیتا ہے تب ہی تو اس کے سامنے اپنا چھوٹا پن واضح ہوتا ہے اور خود کو چھوٹا مان لینے سے ہی تو بڑوں کی شفقتیں حاصل ہوتی ہیں۔'' اس نے یہ بات سُنی تو سوچا۔ شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور کبریائی تسلیم کر لینے والوں کو ہی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور قربت نصیب ہوتی ہے۔

اگلے روز وہ صبح سویرے اپنے روحانی استاد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آج اُس کو وہاں ایک اور ہی طرح کی اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کو کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے باپ سے ملنے آیا ہو۔ اس نے ان کی آنکھوں میں وہی محبت کی چمک دیکھی جو ایک باپ کی نگاہوں میں اپنی اولاد کو دیکھ کر ابھرتی ہے لیکن انداز میں اک وقار اور شان برقرار رہتی ہے۔

ماں کی ممتا میں جو بے خودی اور بے قابو ہونے کا تاثر ہوتا ہے۔ باپ کا پیار لئے دیئے پن کے سبب اس میں جو گہرائی اور تاثیر پیدا کرتا ہے وہ کسی بھی اور رشتے میں نظر نہیں آئی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی ان سے ایک کا انتخاب کرتے ہوئے پوچھے۔ ''یہ شعور اور لاشعور کیا ہیں؟''

اس کا سوال سن کر وہ ایک لحظہ خاموش رہے۔ پھر دھیمی آواز میں اس بات کا آغاز کیا۔ جن حواس سے ہم کشش ثقل میں مقید رہ کر چیزوں کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں ان کا نام شعور ہے اور جن حواس میں ہم کشش ثقل سے آزاد ہو جاتے ہیں ان کا نام لاشعور رکھ لیتے ہیں۔

شعور اور لاشعور دونوں لہروں پر قائم ہیں۔ شعوری حواس میں کام کرنے والی لہریں اپنی ساخت میں مثلث ہوتی ہیں اور لاشعوری حواس میں کام کرنے والی لہریں دائرہ یعنی CIRCULAR ہوتی ہیں۔ شعوری حواس ٹائم اور اسپیس سے آزاد ہیں۔ ہمارا ذہن ایک ورق کی طرح ہے۔ ورق کے دونوں صفحوں پر ایک ہی تحریر لکھی ہوئی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ورق کے ایک طرف کی عبارت واضح اور روشن نظر آتی ہے جبکہ دوسری طرف کی تحریر دھندلی اور غیر واضح محسوس ہوتی ہے۔

ہماری زمین بھی شعوری اور لاشعوری دونوں حواسوں پر قائم ہے۔ انسان کی طرح زمین کے بھی دو رخ ہیں۔ ایک رُخ کا نام طولانی حرکت ہے اور دوسرے رُخ کا نام محوری حرکت ہے۔ یعنی زمین جب اپنے مدار پر حرکت کرتی ہے تو وہ طولانی گردش میں ترچھی ہو کر چلتی ہے۔ یہ طولانی گردش مثلث ہے اور محوری گردش دائرہ ہے۔

زمین پر تین مخلوقات زیادہ ممتاز ہیں۔ انسان کی تخلیق میں بحیثیت گوشت پوست مثلث غالب ہے۔ اس کے برعکس جنات میں دائرہ غالب ہے اور فرشتوں کی تخلیق میں جنات کے مقابلے دائرہ اور بھی زیادہ غالب ہے۔ چونکہ انسان کے دو رخ ہیں یعنی غالب رُخ مثلث اور مغلوب رُخ دائرہ ہے اس لئے جب کسی بندے پر مثلث کا غلبہ کم ہو جاتا ہے اور دائرہ غالب آجاتا ہے تو وہ جنات، فرشتوں اور دوسرے سیاروں میں آباد مخلوق سے متعارف ہو جاتا ہے، اُن سے گفتگو کرتا ہے۔

اسی بات کو ایک اور طرح سے یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہماری ساری زندگی بیداری اور خواب میں گزرتی ہے۔ خواب ہماری زندگی کا نصف حصہ ہیں۔ خواب کی زندگی کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کے اندر ایسے حواس بھی کام کرتے ہیں جن کے ذریعے انسان کے اوپر غیب کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ خواب کے حواس میں ہم ٹائم اور اسپیس کے ہاتھوں میں کھلونا نہیں رہتے بلکہ ٹائم اور اسپیس ہمارے لئے کھلونا بن جاتے ہیں۔ خواب میں چونکہ زمان و مکان کی جکڑ بندیاں نہیں ہوتیں اس لئے ہم خواب کے حواس میں داخل ہو کر ان حالات کا مشاہدہ کر لیتے ہیں جو زماں و مکاں سے ماورا ہیں اور اس میں کسی خاص آدمی کی تخصیص نہیں ہے کہ کوئی مخصوص انسان ہی خواب کے حواس سے بہرہ مند ہو سکتا ہے۔ ہر آدمی خواب اور بیداری کے حواسوں سے مرکب ہے۔ خواب، بیداری، زماں و مکاں سے متعلق علوم کی سب سے زیادہ مستند دستاویز قرآن حکیم ہے۔ قرآن علمِ الکتاب ہے اور قرآن پہ غور فکر کر کے ہم علمِ الکتاب حاصل کر کے ٹائم اور اسپیس سے آزادی کا فارمولا معلوم کر سکتے ہیں۔ جو بندہ یہ فارمولے جان لیتا ہے وہ کسی چیز کو وسائل کے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی قدرت حاصل کر لیتا ہے۔

جب وہ بات سُن رہا تھا اس کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ علم و عرفان ایک دھارے کی صورت میں اس کی روح کو سیراب کر رہے ہیں۔ اس کے حواس سمٹ کر ایک نکتے پر مرتکز ہو گئے تھے اور اس نکتے سے ابھرتی پھیلتی شعاعوں نے اس کے اندر کے اندھیروں کو نگلنا شروع کر دیا تھا۔ اُس کو اپنے اندر ایک عجیب مسرور کن سا اُجالا پھیلتا محسوس ہو رہا تھا۔ اُس نے اس روشن سی فضا میں مینارہ نور کو اپنے اندر سمیٹ لینے کی امنگ ابھرتے دیکھ کر اس کی عملی صورت دریافت کرنے کو پوچھا۔ ''مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

انہوں نے اُس کو نظر بھر کر دیکھا۔ ان کے اُس دیکھنے میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ سرتا پا لرز کر رہ گیا۔
''آپ یا حی یا قیوم کا ورد کیا کریں، ہر وقت ۔۔۔۔ اور مراقبہ کیا کریں!''

''بس ، صرف اتنی سی بات ۔۔۔۔'' وہ تو کسی بہت ہی سخت مجاہدے اور ریاضتوں کی طرف ہنکانے والی ہدایات کا منتظر تھا۔ اُس نے محسوس کیا گویا انہوں نے اس کو ٹال دیا ہو۔ اُس نے سر جھکا لیا۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد اُس نے دریافت کیا۔ ''یا حی یا قیوم'' کی تشریح کیا ہے؟ حالانکہ کہنا تو وہ یہ چاہ رہا تھا کہ یا حی یا قیوم پڑھنے سے کیا ہوگا ؟ لیکن وہ اتنی گستاخی کر نہیں سکا۔

انہوں نے اسی دھیمے سے انداز میں بات کرتے ہوئے کہا۔ ''یا حی'' ۔۔۔ اے زندہ ۔۔۔۔ اور ''یا قیوم'' ۔۔ اے قائم۔ پھر فرمایا کہ اس وقت دو سو کے لگ بھگ روحانی سلاسل ہیں اور ہر روحانی سلسلے میں اس اسم کا ورد کسی نہ کسی صورت میں رائج ہے اور پھر یہ کہہ کر انہوں نے یہ بات ختم کر دی کہ اس کا ورد کرنے والے پر دائرہ غالب آجاتا ہے۔

محفل برخاست ہونے پر وہ اجازت لے کر واپس گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچ کر وہ اپنے اندر ایک خاموشی سی پھیلتی محسوس کرتا رہا۔ اب اُس کو خاموش رہنے میں لطف سا آتا۔ یہ تبدیلی اس کی بیوی نے نوٹ کی تو کہا ۔''کیا بات ہے جب سے آپ لاہور سے ہو کر آئے ہیں کچھ چپ چپ سے رہنے لگے ہیں۔ سب ٹھیک تو ہے نا۔ وہ ہنسا نہیں ۔۔ بس دھیرے سے مسکرا کر ۔۔''کچھ نہیں!'' کہہ کر چپ ہو گیا۔ اب وہ اُس کو کیا بتاتا کہ وہ تو اپنے اندر بھی خاموش ہی ہو گیا ہے۔ اُس کو اک چپ سی لگ گئی ہے یہ اُس کے اندر پھیلتے سناٹے اور خاموشی کا بڑھتا ہوا اثر ہے۔

اُس کی بیوی نے اس سے بہت سے سوال پوچھے۔ یہ سلسلہ کیا ہوتا ؟ یہ بیعت ہونا کیا ہوتا ؟ کیا یہ سب ضروری ہے ؟ کیا میں بھی بیعت ہوں گی ؟ مجھے بھی بابا جی سے ملوائیں گے ؟ بابا جی کیسے آدمی ہیں ؟ بابا جی ہمارے گھر آئیں گے ؟ وہ میرے لئے دعا کریں گے ؟ کیا اُن کی کرامت سے اب ہمارے دن پھر جائیں گے ؟ کیا اب تم ڈاڑھی رکھ لو گے ؟ شیو کرنا چھوڑ دو گے ؟ کیا تم مجھے گھر میں قید کر دو گے ؟ کیا ہمارے بچے اب انگریزی اسکولوں کی بجائے کسی قدامت پسند مدرسے میں داخل ہوں گے ؟ کیا تم پینٹ ، شرٹ ، ٹائی کوٹ پہننا چھوڑ دو گے ؟ کیا تم اب مجھے میک اپ کرنے سے منع کرو گے ؟ کیا مجھے پردہ کرنا پڑے گا ؟

اتنے بہت سے سوالوں پر اسے عجیب سی حیرتہوئی۔ بہت سے سوالوں کے جواب تو اُسے خود بھی معلوم نہیں تھے۔ وہ ہر ایسے سوال کے جواب میں جب یہ کہتا۔۔۔ پتہ نہیں۔۔۔ تو وہ اور تیز ہو جاتی کہ یہ کیسی بات ہے کہ اس کے خاوند کو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی معلوم نہیں۔ اس نے جان چھڑانے کو اتنا ہی کہہ دیا کہ وہ بھی ہر وقت یا حی یا قیوم کا ورد کیا کرے اور اسے بھی کرنے دے۔

پندرہ بیس روز اسی طرح گزر گئے۔ سب کچھ ویسا ہی رہا جیسے پہلے تھا۔ وہی صبح اٹھنا ، تیار ہو کر دفتر جانا ، وہاں معمولات کے کام کرنا ، شام کو واپس گھر آنا ۔ کبھی ٹی وی دیکھ لینا ، کبھی کوئی کتاب لے کر بیٹھ جانا ۔ کبھی بچوں کے ہوم ورک میں اُن کی مدد کرنا اور پھر کھانا کھا کر کچھ دیر اِدھر اُدھر کی گپ شپ کرنا پھر سو جانا ، فرق صرف اتنا تھا کہ اب وہ صبح نماز کے بعد مراقبہ کرتا اور دن بھر جب بھی اسے موقع ملتا اور یاد آجاتا تو وہ یا حی یا قیوم کا ورد کرتا ۔ اسے اکثر بابا جی کا دھیان آتا ۔ وہ بابا جی کی تعلیمات پر غور و فکر کرتا ۔ کبھی اُس کے ذہن میں بیوی کے سوالات دور کر جاتے تو

وہ زیادہ گہرائی سے بابا جی کی تعلیمات پر ذہن لگا دیتا لیکن بالآخر اسی نتیجے پر پہنچتا کہ بابا جی کے عمل، کردار اور گفتار سے ہر غیر فطری اصول اور عمل کی تردید ہوتی ہے۔

کبھی کبھی وہ خیالوں میں اُن سے گفتگو کرتا۔ کبھی منصوبے بناتا کہ اب میں اُن سے ملوں گا تو یہ کہوں گا، وہ بتاؤں گا، یہ پوچھوں گا۔ ان کی کتابیں پڑھتا تو ایسا محسوس کرتا جیسے وہ اپنے مخصوص دھیمے انداز میں اُس کو اُس کے پوچھے گئے سوالوں کے جواب دے رہے ہوں۔ اُس کو اس پر اور بھی لطف آتا۔ وہ اور بھی ڈوب کر مطالعہ کرتا۔ دوستوں سے باتیں کرتا تو ان کے ساتھ گفتگو میں اپنی پڑھی ہوئی باتیں دہراتا۔ وہ کبھی تو اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے اور کبھی اُس کو اپنی گفتگو کے بہاؤ میں گھسیٹ لیتے۔

ایک روز یا حی یا قیوم کا ورد کرتے کرتے اُس کا خیال اس بات پر مرکوز ہو گیا کہ اے زندہ، اے قائم کی تکرار سے دائرہ کیونکر غالب ہو سکتا ہے؟ ان دو الفاظ میں آخر ایسا کیا جادو ہے کہ انسان شعور سے آزاد ہو کر لاشعور میں داخل ہو جاتا ہے اور مثلث دائرہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مثلث تو دائرہ میں تب ہی تبدیل ہو سکتی ہے جب اس کے زاویے ختم ہو جائیں۔

زاویے ختم ہو جانے کا خیال اس کے ذہن میں جڑ پکڑ گیا۔ زاویے سے مراد زاویہ نظر بھی ہو سکتی ہے اور بنی ہوئی صورت بھی۔ عقائد کی بنی ہوئی صورت بھی ایک مخصوص شکل و صورت رکھتی ہے۔ اگر اس میں سے زاویے مٹا دیئے جائیں اور ان کی جگہ گولائی اور دائرہ داخل کر دیا جائے تو مثلث دائرہ میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ جیومیٹری کی اندو صورتوں کو ایک دوسرے میں مدغم ہوتے دیکھنے کی ایک صورت یہ بنتی تھی کہ وہ اپنے زاویہ نظر میں تبدیلی لے آئے اور دوسرے یہ کہ بنی ہوئی شکل میں دائرے کو داخل کر دیا جائے۔ بات کچھ سمجھ آئی اور کچھ مزید الجھ گئی۔

ایک بات بہر حال طے تھی کہ اس اسم کا ورد کرنے والے پر دائرہ غالب آجاتا ہے کے الفاظ اس بات کی دلیل تھے کہ ایسا ہوگا ضرور۔ اب یہ کیسے ہوگا؟ کب ہوگا؟ اس ہونے کا میکانزم کیا ہوگا؟ یہ بات اس کے شعور میں نہیں آرہی تھی۔ بہر حال وہ ورد کرتا رہتا اور اس بات پہ غور کرنے کی کوشش بھی کرتا رہتا کہ ''اے زندہ'' کا اصل مفہوم کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کو زندگی کے حوالے سے پکارنے میں کیا مصلحت اور فوائد ہیں؟ اس کے ذہن میں جب یہ بات گونجتی کہ یہ اسمائے الٰہیہ ہر روحانی سلسلے میں رائج ہیں اور ہر روحانی سلسلے کے ماننے والے ان اسمائے مبارکہ کا ورد کسی نہ کسی صورت میں کسی نہ کسی سطح پر ضرور کرتے ہیں تو بات کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی۔ وہ اور بھی شد و مد سے اس گتھی کو سلجھانے کے درپے ہو جاتا۔ زندگی کی مختلف طرزوں پر غور کرتا۔ زندگی کی مختلف حالتوں کو ذہن میں لاتا۔ کبھی زندگی کو لہروں کی صورت میں وہ نباتات میں موجزن دیکھتا اور کبھی حشرات الارض میں متحرک دیکھتا۔ کبھی وہ زندگی کو پرندوں میں محو پرواز دیکھتا اور کہیں درندوں اور چرندوں کی لاشمار انواع و اقسام اس کو زندگی کے تنوع کی طرف متوجہ کرتیں۔

ایک روز ٹی وی پر بحری حیات کی بابت ایک فلم دیکھتے ہوئے اس نے سمندری مخلوقات کی اتنی اقسام دیکھیں کہ حیرت سے اس کو اپنا دم رکتا محسوس ہوا۔ پانی میں ہر طرف زندگی بکھری ہے۔ کہیں کائی اور اسفنج، کہیں مونگے اور مرجان، کیکڑوں سے بچھوؤں تک اور سانپوں سے مچھلیوں تک ہر ہر نوع کی اتنی اقسام جو انسانی شماریات میں بھی نہ آسکتی ہوں۔ یہ سب زندگی کی دھڑکتی صورتوں کے علاوہ اور کیا ہے؟ اس نوع در نوع مخلوق میں جو بات اُن کی موجودگی کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے۔۔۔ وہ خود زندگی ہے جس کی تعریف پر آج بھی سائنسدان متفق نہیں ہو سکے۔ تبھی تو وہ جمادات میں زندگی کی موجودگی کا انکار کر بیٹھتے ہیں۔

زندگی کا قیام بھی تو لہروں پر ہے ۔۔۔ وہ سوچتا۔ ایک روز اُس کو خیال آیا اور یہ بات اُس نے بابا جی کی تحریروں میں پڑھی تھی کہ کائنات صفاتِ الٰہیہ کا مظہر ہے۔ یعنی زندگی دراصل ایک الٰہی صفت ہے اور جب کوئی بندہ کسی صفت کے اسم کا ورد اور تکرار کرتا ہے تو وہ صفت اس بندے کے اندر ابھرنا، پھیلنا اور متحرک ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ۔۔۔ اے زندہ اور اے قائم ذات ۔۔۔ کی تکرار سے اس اسم کا ورد کرنے والے کے اندر زندگی کی لہریں متحرک ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

اب اس کی توجہ زندگی سے گزر کر اس گتھی کو سلجھانے میں لگ گئی کہ یہ دائرہ کسی مثلث کو کیسے منقلب کرتا یا اُس پر غالب آتا ہے۔ ہر پیدا ہونے والی شئے فنا ہو جاتی ہے، ختم ہو جاتی ہے۔ زندگی کا آغاز ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ اپنے اختتام کی طرف گامزن ہو جاتی ہے۔ تو پھر یہ قیام و ثبات کی بات ایک عجیب تضاد ابھرتا چلا گیا۔ اب زندگی کو پکارنا اور اس کا قیام طلب کرنا کہیں متصادم اور متضاد بات تو نہیں۔ اس کی سمجھ میں جو کچھ آرہا تھا وہ بھی بند ہو گیا اور پھر یہ دائرے کا کیا معمہ ہے؟

ابھی تو اُس سے زندگی کے قیام کی ڈور ہی نہیں سلجھی تھی کہ بیچ میں دائرہ آگیا۔ وہ لاچار سا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے تہیہ کیا کہ وہ اس بارے میں اپنے مرشد کریم ۔۔۔ اپنے ابا حضور سے بات کرے گا۔ اس نے سوچا اب ملاقات نی جانے کب ہو اُن کو خط لکھوں گا اور اس بیچ کو سلجھانے کی درخواست کروں گا۔

وہ خط کا مضمون سوچنے لگ گیا۔ مراقبہ کرنے بیٹھا تو ذہن میں خط لکھنے کا ارادہ خیالات کے دھارے کی صورت پھیلنا شروع ہو گیا۔ وہ اپنے ذہن میں موجود مسئلے کی وضاحت کو الفاظ اور جملوں کا انتخاب کرتے کرتے اپنے خط کا ممکنہ جواب سوچنے لگا۔ وہ یہ کہیں گے، وہ لکھیں گے ۔ وہ اُن کو لکھے گا۔ وہاں سے جواب ائے گا ۔ یہ سلسلہ چل نکلے

گا۔۔۔ارے یہ تو دائرہ مکمل ہو گیا ! اُس کے ذہن نے ایک کلکاری بھری۔ایک طرف سے سوال جانا دوسری طرف سے جواب آنا دائرہ ہی تو ہوا۔ زندگی بھی کہیں سے آرہی ہے اور کہیں جارہی ہے۔ اگر یہ آنا اور جانا ایک دوسرے سے جڑا ہوا نہ ہو تو ایک سیدھی حرکت وجود میں آتی ہے۔ ایک نقطہ آغاز سے نقطہ اختتام تک ایک سیدھی حرکت۔۔لیکن اگر آغاز اور انجام باہم دگر ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں تو یہ دائرہ کی حرکت بن جاتی ہے۔ زندگی کا چکر LIFE CYCLEانڈہ۔۔۔لاروا۔۔۔پیوپا۔۔۔بالغ اور پھر دوبارہ انڈے تک کا چکر۔۔۔یہ ایک دائرہ ہی تو ہے اور یہ ایک دائرے کے سوا اور کچھ بھی تو نہیں اور جب زندگی دائروں میں گردش کرنے لگتی ہے تو اس کو قیام نصیب ہو جاتا ہے۔ اگر زندگی دائرے کی بجائے کسی خطِ مستقیم پر چل رہی ہوتی تو کسی نہ کسی نقطے پر آکر وہ ضرور رُک جاتی۔ آج لاکھوں کروڑوں سال بعد بھی ہر نوع اسی لئے موجود اور قائم ہے کیونکہ اُس کی زندگی دائرے میں چل رہی ہے۔

خوشی کی ایک لہر ابھری اور بڑھتے پھیلتے اس کے پورے وجود کو شرابور کرتی اُس کی آنکھوں سے جا ٹکرائی۔ اُس آنکھیں کھول دیں اور بہت اطمینان اور سکون سے زیرِ لب دہرانے لگا۔ یا حی یا قیوم اے زندہ، اے قائم۔۔۔اس کو اب کچھ کچھ سمجھ آرہی تھی کہ یہ دونوں اسمائے الٰہیہ اسمِ اعظم کیوں کہلاتے ہیں؟

گیان دھیان

ایک بار ایک بہت بڑے دھیانی گیانی سادھو کا ایک بستی سے گزر ہوا۔ اس بستی میں ایک نوجوان بھی رہتا تھا۔ نوجوان کو وہ سادھو بہت اچھا لگا۔ نوجوان نے اُس سادھو کو اپنا گرو مان کر اُس سے درخواست کی کہ وہ اُس کو اپنا چیلا بنا لیں اور اُس کو اپنی خدمت میں رہنے کی اجازت دے دیں۔ سادھو مان گیا اور اُس نوجوان کو اپنی تربیت میں لے لیا۔ کچھ عرصے بعد ایک روز گرو نے اپنے چیلے کو تخلیقی فارمولوں سے روشناس کروانے کے لیے اس کے سامنے کچھ اجزاء انہیں پیسا اور پھر انہیں کٹھالی میں ڈال کر آگ میں تپایا۔ جب وہ تمام چیزیں خوب اچھی طرح تپ گئیں تو اس نے جیب سے ایک پڑیا نکالی اور اس میں سے چٹکی بھر راکھ لے کر ان پر چھڑک دی۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں ہو گیا۔ اس دوران سادھو کسی منتر کا جاپ بھی کرتا رہا۔ جب دھواں چھٹا تو چیلے نے دیکھا کہ کٹھالی میں سونا بھرا ہوا ہے۔ وہ گرو کے سامنے فرطِ عقیدت سے جھک گیا۔

اب اُس چیلے کو یہ دُھن سما گئی کہ وہ کسی نہ کسی طور اپنے گرو سے اس کیمیا اثر عمل کو سیکھ کر سونا بنانے پر قادر ہو جائے۔ گرو سے اپنے چیلے کی یہ خواہش پوشیدہ تو نہیں تھی لیکن اُس نے اس پر کچھ زیادہ توجہ نہیں دی۔ چیلا جب اپنی خواہش کے ہاتھوں مجبور ہو گیا اور اُس سے نہ رہا گیا تو ایک روز اس نے اپنی خواہش کا اظہار اپنے گرو سے کر دیا۔ گرو نے یہ کہہ کر ٹال دیا جب وقت آئے گا تب دیکھیں گے۔ لیکن چیلے سے صبر کہاں ہوتا تھا، وہ اصرار پر اُتر آی۔ وہ موقع بے موقع گرو سے اپنی خواہش کا اظہار کرنے لگا۔

جب گرو نے دیکھا کہ اب اُس کے چیلے کی قوتِ برداشت جواب دینے کو ہے تو ایک روز اُس نے چیلے کو سونا بنانے کی ترکیب تعلیم کرتے ہوئے کہا کہ فلاں فلاں اجزاء لے کر انہیں جلا کر راکھ بنا لو۔ پھر فلاں فلاں اشیاء کا آمیزہ

لے کر انہیں آگ میں تپاؤ جب خوب اچھی طرح تپ جائے تو یہ راکھ اس میں اتنی مقدار میں ڈال دینا۔ اس تمام عمل کے دوران یہ یہ منتر جاپ کرتے رہنا اور ہاں دیکھو اِس میں سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ اس پورے عمل کے دوران تمہارے ذہن میں بندر کا خیال بالکل بھی نہیں آنا چاہیے ورنہ سب کچھ جل کر راکھ ہو جائے گا اور سونا نہیں بنے گا۔

چیلے کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں رہا۔ وہ پوری تن دہی سے بتائے گئے اجزاء کی بازیافت میں مصروف ہو گیا۔ کئی روز کی محنت شاقہ کے بعد اس نے اپنی تیاری مکمل کر لی تو گرو کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عمل کرنے بیٹھ گیا لیکن جب اس نے وہ راکھ تپتے ہوئے اجزا پہ چھڑکی تو ایک شعلہ سا لپکا اور سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔ اس نے ہمت نہ ہاری اور دوبارہ کوشش کی دوسری بار بھی نتیجہ وہی رہا۔ کئی بار کوشش کی لیکن ہر بار ناکامی نے منہ چڑایا۔ آخر ایک روز وہ اپنے گرو کی خدمت میں حاضر ہوا اور ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے کہا۔ آپ نے مجھے سونا بنانے کا گُر تعلیم کیا لیکن بندر کا تذکرہ کر کے مجھ پر ظلم کیا۔ اگر آپ بندر کا تذکرہ نہ کرتے تو مجھے کبھی بندر کا دھیان ہی نہ آتا لیکن اب میں جب بھی سونا بنانے بیٹھتا ہوں تو بندر میرے اندر اچھلنا شروع کر دیتا ہے اور میری ساری محنت اکارت چلی جاتی ہے ۔ آپ نے بلاوجہ ہی بندر والی شرط عائد کی۔ نہ آپ بندر کا ذکر کرتے اور نہ وہ میرے دھیان میں آتا اور نہ ہی میری محنت رائیگاں جاتی۔

اندازہ ہے کہ گرو نے یہی کہا ہو گا کہ مجھے جو سکھانا تھا میں نے سکھا دیا اب اس پر عمل کرنا نہ کرنا تمہاری اپنی صوابدید پر منحصر ہے۔ لیکن شعور میں یہ استفہام ضرور اُبھرا کہ اُس گرو نے بندر کا تذکرہ کرنا کیوں ضروری سمجھا تھا؟

آخر اس میں کیا حکمت پوشیدہ ہو سکتی ہے اور پھر بندر اور سونے کا آپس میں کیا جوڑ یعنی سونا بنانے کے فارمولے کا بندر کے خیال سے کیا سمبندھ ہو سکتا ہے؟

شعور عموماً چیستان اور معموں سے گھبراتا ہے۔ جہاں اس کو سوچنا پڑ جائے تو وہ تساہل پسندی کا اظہار کرنے سے باز نہیں آتا اور گہرائی میں اُتر کر بات کی تہہ تک پہنچنے سے گریزاں ہوتا ہے۔ وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ بنا بنایا نوالہ میسر آئے اور لذت سے شاد کام ہوتے ہوئے اس کو نوش جاں کر لے۔ اس سہل پسندی میں یوں تو کوئی قباحت نہیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ بن طلب ہاتھ آئے مال کی قدر کم پڑ جاتی ہے اور شعور اُس کو بھول کے خانے میں ڈالنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا۔ لیکن اگر مغز پچی اور دماغ سوزی کے بعد کوئی بات ہاتھ لگے تو وہ اس کو گوہر نایاب کی طرح ہمہ وقت نگاہ میں رکھتا ہے۔ اس ہی لئے غور و فکر کرنا ہر فرد پر انفرادی طور پر فرض کرتے ہوئے قرآن حکیم میں بار بار غور و فکر اور تدبر و تعقل کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

اس اصول سے آگاہی سے زیادہ اُس میں یہ دلچسپی اُبھر آئی کہ وہ بندر کا سونا بنانے کے فارمولے سے تعلق کو سمجھ لے تو شاید اس کو سونا بنانے کا فارمولا علمی طور پر ہی سمجھ میں آجائے۔ اس لالچ نے اس کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اس معمے کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ یہ بات جانے کیوں اُس کو کلیدی حیثیت کی حامل لگتی تھی کیونکہ روایت کے مطابق بندر کا خیال آتے ہی سب کچھ جل کر خاک ہو جاتا تھا۔ یعنی اس کو یہ تلاش کرنا تھا کہ بندر کے خیال میں ایسی کیا بات تھی کہ آگ اُن اجزاء کو سونا بنانے کی بجائے جلا دیتی تھی جو کہ نسخہ کے مطابق اس عمل میں استعمال ہوتے تھے۔ یہ بات اس کی حیرت میں اضافہ کرتی چلی جا رہی تھی۔

کئی بار اس نے یہ سوچ کر اس خیال سے پیچھا بھی چھڑانا چاہا کہ ہو گا کچھ۔ یہ قصے کہانیوں کی باتیں ہیں ان پر کیا سر مانا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں یہ بات آجاتی کہ آخر ان قصے کہانیوں میں بھی کوئی نہ کوئی نکتہ حکمت ہی تعلیم کیا جاتا ہو گا اور اگر اُن میں حکمت و آگہی کا عنصر نہ ہوتا تو وجدان کو یہ باتیں پسند ہی کیوں آتیں۔ یہ بات اُس کو دوبارہ اس طرف راغب کر لیتی کہ سونا بنانے کا فارمولا نہ سہی کوئی حکمت کا موتی ہی ہاتھ لگ جائے گا۔ ذہن کو سوچ بچار کی مشق ہی ہو جائے گی اور کچھ نہ سہی ایک بات سمجھ آنے کے سبب اُس کو دوسروں پر ایک برتری اور فوقیت تو لازماً حاصل ہو جائے گی۔

سمجھ میں آجانے کے حوالے سے اس کو ایک بات یاد آئی کہتے ہیں کہ جب حضرت جنید بغدادی کو بارگاہ خداوندی میں شرف باریابی نصیب ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اُن سے دریافت کیا کہ اُن کو وہاں پہنچ کر کیسا لگ رہا ہے؟ تو انہوں نے اللہ رب کریمکی جناب میں یہ بات عرض کی حضور میں تو یہ سمجھا ہوں کہ ایک عام بندے اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ تم میں اور عام آدمی میں یہی تو فرق ہے کہ وہ یہ بات نہیں سمجھتا۔

اُس نے اپنے چند دوستوں سے بھی اس بارے میں بات کی۔ کسی نے دلچسپی لی اور کسی نے ''ہٹاؤ یار'' کہہ کر اپنی دل پسند بات کا آغاز کیا۔ جن لوگوں نے دلچسپی لی، ان میں سے کسی نے کہا کہ گرو نے یہ بات اس لئے کہی ہو گی کہ وہ اس نوجوان میں اپنے حکم کی تعمیل کا جذبہ جانچنا چاہ رہا ہو گا۔ ورنہ بندر کے CONCEPTکا سونے کی دھات سے کوئی تعلق کیسے ہو سکتا ہے؟ ایک اور صاحب نے یہ اظہار کیا کہ یہ سب چکر دھیان میں یکسوئی کا ہے گرو نے چیلے میں یکسوئی پیدا کرنے کے لئے اُس کے لالچ کو اس رخ پر ڈال دیا کہ اپنے ذہن سے لڑتا رہے۔ تیسرے نے خیال ظاہر کیا کہ یہ سب باتیں تمثیلی ہیں۔ اس واقعے میں سونا دنیا کا اور بندر انسان کے اندر کے حیوانی رخ کا استعارہ ہے اور اس

واقعے میں یہ فلسفہ بیان کیا گیا ہے کہ جب دنیا کی طلب ہو تو اس کے حصول کا واحد طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے حیوانی رخ کی بجائے اپنے اندر کے انسان کو اُبھار لے تو وہ دنیا میں تصرف پر قدرت حاصل کر لیتا ہے۔

اس نے ان سب باتوں کو بہت غور سے سُنا لیکن یہ سوچ کر اُن کو ماننے میں متامل ہوا کہ دنیا کی طلب ہی حیوانی رخ ہے اور اگر دنیا کی طلب ہو گی تو انسانی رخ تو ویسے ہی زیر بحث نہیں رہتا۔ بہت سوچنے پر بھی وہ کسی نتیجے پر پہنچا تو نہیں لیکن اس کی سوچ کو ایک رخ ضرور مل گیا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ تعمیل حکم کے نتیجے میں سونا بطور انعام بھی تو مل سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُس نے اور دھیان میں یکسوئی کے نتیجے میں اشیاء کی ماہیت میں تبدیلی پیدا ہونے کے امکانات کا بھی جائزہ لیا۔ اس بات میں اس کو قدرے دم محسوس ہوا۔

اُس نے سوچا کہ یکسوئی کا تعلق بہر حال طاقت اور قوت سے تو ضرور ہے۔ اب یہ طاقت چاہے جسمانی ہو، ذہنی ہو، یا روحانی بہر حال یک سوئی ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ بعض لوگ جسمانی قوت رکھنے کے باوجود بھی کسی کام کو کرنے پر آمادہ نہیں ہو پاتے تو کہا جاتا ہے ان کے جی کا زور نہیں ہے یعنی خواہش قلبی بھی ایک قوت ہے جو انسان میں قوت عمل متحرک کرتی ہے۔ یہی خواہش قلبی انسان میں وہ ذہنی قوت اُبھار دیتی ہے جو اس کو نادر تخلیقات پر مجبور کر دیتی ہے۔ کہیں وہ آرٹ کے شہ پارے تخلیق کرتا ہے اور کہیں ایجادات کرنے پر اُتر آتا ہے اور پھر جب یہی خواہش قلبی اس کو روحانی دنیا کے اسرار و رموز سمجھنے پر مائل کر دیتی ہے تو وہ تسخیری فارمولوں کی کھوج میں اتنا آگے نکل جاتا ہے جہاں فطرت اپنا ہر راز اس پر آشکار کر دینا ضروری قرار دے دیتی ہے۔ ہو نہ ہو یہی بات ہو گی۔۔ اس نے سوچا لیکن کچھ ہی دیر بعد اور اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اس واقعہ میں خواہش قلبی سے روحانی قوت کے اس درجے پر

فائز ہونا کیسے ثابت ہوا جہاں مادی اشیاء کو اپنی ہیت تبدیل کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہو اور پھر اس سارے چکر میں بندر کا کردار کیا ہوا؟ یہ ضرور کوئی اور ہی بات ہے۔

اس طرح وہ سوچوں کے گرداب میں گھرا چکراتا اور قدم بہ قدم سوچ کے زینے چڑھتا رہا۔ کئی بار اُس نے سوچا کہ وہ اپنے مرشد کریم سے اس بات کا حل دریافت کرنے کو اُن کو خط لکھے لیکن یہ بات وہ ضبط تحریر میں لا بھی سکے گا یا نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ یہ سمجھیں کہ اُس میں حرصِ دنیا بہت بڑھی ہوئی ہے۔ اس طرح وہ اُن کو خط لکھنے کی

ہمت ہی مجتمعکر تا رہا۔ خط میں لکھنے کے الفاظ سوچتے سوچتے وہ پھر اسی بات پر آجاتا کہ اُن سے مدد طلب کرنے سے پیشتر اس کو ایک آدھ بار اور کوشش کر لینا چاہیے ہو سکتا ہے کہ کوئی بات سوجھ ہی جائے اور پھر یہ کون سی کوئی اتنی اہم بات ہے جس کو اگر وہ نہ جانے گا تو کوئی بہت بڑی کمی رہ جائے گی۔

پھر ایک روز اس کے ذہنمیں یہ بات در آئی کہ اس واقعہ میں گرو نے اپنے چیلے کو در حقیقت یہ سبق دیا ہے کہ فطرتِ انسانی میں نافرمانی کا عنصر اتنا گہرا ہے کہ اُس کو جس بات سے منع کیا جاتا ہے یہ وہی کام ضرور کرتا ہے خواہ اُس میں خود اس کا اپنا کتنا بڑا نقصان ہی کیوں نہ ہو جائے۔ آدم کو بھی اللہ نے شاید اسی لئے شجر ممنوعہ کے قریب جانے سے منع فرمایا تھا تاکہ اس پر اس کی اپنی فطری بغاوت کو واضح کیا جا سکے۔ اب گرو نے جب چیلے کو منع کر دیا کہ بندر کا دھیان نہیں آنا چاہیے۔۔ تو اسی بندر پر ہی اصرار کیوں شروع ہو گیا۔ اس بات پہ اُس کا ذہن کسی قدر مطمئن ہو گیا۔ کیوں کہ یہ بات اس کے دل کو لگتی ہوئی محسوس ہوئی کہ فطرت انسانی میں بغاوت کا رجحانسامنے لا کر ہی تو اس کو اکھاڑا جاتا ہے۔ جب چیلے کو یہ بات سمجھ آگئی ہو گی تو اس میں خود سپردگی پیدا ہو گئی ہو گی اور جب خود سپردگی آئی ہو گی

تو لا محالہ اس میں وہ صلاحیتیں بھی ہو گئی ہوں گی جو ماورائی علوم کے حصول کے لئے درکار ہوتی ہیں۔ اُس نے فکر کے اس درجے تک رہنمائی حاصل ہونے پر شکر گزاری محسوس کی۔

اگلے روز دوران مراقبہ میں بھی اُس کے ذہن میں اسی بات کا اعادہ ہوتا رہا۔ جب مراقبہ ختم کر کے وہ سونے جا رہا تھا تو اس کے اندر خیال کی ایک لہر نے سر ابھارا۔۔۔ اُس گرو نے اپنے چیلے کو نفی کا درس دیا تھا۔ اُس نے اس خیال کو جانچا۔۔۔ نفی کا درس؟۔۔۔ بھلا وہ کیسے؟۔۔۔ اس بات میں نفی کا درس کہاں سے آ گیا؟ بندر کے خیال کو نہ آنے دینے میں نفی کیسے ہو گئی؟۔۔۔ سونے کے بنانے کا نفی کے عمل سے کیا سنجوگ؟۔۔۔ نفی کرنے والوں کو سونا بنانے کی کیا پڑی؟ وہ تو نفی ذات تک پر قدرت رکھتے ہیں اور جو اپنی ذات کی نفی کرنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے ہوں وہ اس کائنات کی مادی اشیاء کی نفی کیوں نہیں کرتے ہوں گے۔ وہ یوں ہی خود سے الجھتے لڑتے نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اگلے کئی روز رہ رہ کر اس کے ذہن میں نفی و اثبات کے حوالے سے خیالات دور کرتے رہے۔ اس دوران اُس کو حضرت عیسیٰؑ کے اُس واقعے کا بھی خیال آیا جس کے مطابق ایک یہودی راہب نے ان کے ساتھ سفر کرنے کی

اجازت چاہی اور راستے میں جب وہ کھانا کھانے رُکے تو اُس راہب نے یہ دیکھ کر کہ حضرت عیسیٰؑ کے توشہ میں صرف دو روٹیاں ہیں جب کہ خود اس کے پاس تین روٹیاں ہیں۔ اُس کو خدشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حضرت عیسیٰؑ اُس سے زائد روٹی میں سے حصہ مانگ لیں اور اُسے اپنے توشہ میں سے انہیں روٹی دینا پڑے۔ وہ اُن سے پانی لانے کا کہہ کر ایک روٹی خود کھا لیتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ جب پانی لے کر آتے ہیں اور وہ اپنا توشہ کھولتا ہے اور اُس میں دو روٹیاں دیکھ کر حضرت عیسیٰؑ اس سے استفسار کرتے ہیں کہ اُس کے توشہ میں تو تین روٹیاں تھیں اور وہ جھوٹ بولتا ہے کہ نہیں اس

کے توشہ میں تو دو ہی روٹیاں تھیں۔ حضرت عیسیٰؑ اس کی اس حرکت سے بیزاری محسوس کرتے ہیں اور رات کو اپنی باری کا پہرہ دینے کے دوران ریت کی تین ڈھیریوں پر پھونک مار کر انہیں سونے میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

صبح جب یہودی وہ سونا دیکھتا ہے تو اُن سے دریافت کرتا ہے کہ سونے کی وہ تین ڈھیریاں کس کی ہیں؟ حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں۔ ''یہ ایک ڈھیری اُس کے لیے ہے، دوسری خود اُن کے لیے اور تیسری اُس کے لیے جس نے تیسری روٹی کھائی تھی۔''۔۔۔یہودی یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ تیسری روٹی اُسی نے کھائی تھی۔ پھر اُس کا لالچ اُس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ تیسری ڈھیری بھی اُن سے مانگ لے۔ اس پر حضرت عیسیٰؑ اس کو اپنا ساتھ چھوڑنے کی شرط پر وہ تیسری ڈھیری بھی بخش دیتے ہیں۔ بعد میں ہوتا کچھ یوں ہے کہ وہاں تین ڈاکو آ جاتے ہیں۔ وہ یہودی سے اس سونے کو ہتھیانا چاہتے ہیں۔ یہودی کو کھانا لانے بھیجا جاتا ہے تو وہ شہر سے کھانے میں زہر ملا کر لے آتا ہے۔ ڈاکو اُس یہودی کو قتل کر کے سونے کی تینو ں ڈھیریوں پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ تینو ں ڈاکو یہودی کا لایا ہوا کھانا کھا کر وہیں ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ ہوا چلتی ہے اور سونے کے ذرات مٹی میں مل جاتے ہیں۔ ساتھ میں اُن چاروں کے جسم بھی۔

اس نے جب پہلی بار یہ واقعہ پڑھا تھا تو اُس نے اس کو فطرت انسانی میں موجود لالچ اور دنیا کی بے ثباتی کی دلیل جانا تھا۔ لیکن آج وہ اس واقعے کو ذہن میں دہرا کر اس میں سونا بنانے کی ترکیب کی مماثلت پر غور کر رہا تھا اور اس حوالے سے اُس میں نفی کا عمل تلاش کر رہا تھا۔

اس دوران اُس پر ایک عجیب سا انکشاف ہوا۔ وہ نفی کا مطلب انکار لے رہا تھا۔ اس کے ذہن میں نفی کا مفہوم کسی چیز کی موجودگی کا انکار کرنا تھا۔ لیکن اس طرح تو وہ اللہ کی دی ہوئی صلاحیتوں کا بھی منکر ہو رہا تھا اور وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ وہ نفی اور کفران کے درمیان باریک سی حد فاصل سے ہی واقف نہیں۔ ان دونوں میں جو لطیف سا

فرقے اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو نفی کا درس کفران پر منتج ہو جاتا ہے۔ یعنی نفی کرنے کے چکر میں بندہ اللہ کی بخشی ہوئی صلاحیتوں کا ہی انکار کر بیٹھتا ہے۔

تو پھر نفی کیا ہوئی؟ تجسس نے اس کو ایک نئی راہ پر ڈال دیا۔ وہ دن بھر اسی سوال کی جگالی کرتا رہا۔ اس کا ذہن اس سیدھے سادے لفظ کے اصل مفہوم کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اُس نے مراقبہ میں تصور کیا کہ وہ اپنے مرشد کریم سے پوچھ رہا ہے کہ نفی کا اصل مفہوم کیا ہے؟ اس کے ذہن میں مختلف باتیں گردش کرتی رہیں۔ کبھی اس کو خیال آتا کہ اس کا مطلب حذف کر دینا ہوگا، کبھی سوچتا کہ یہ کینسل کرنے کا مفہوم دیتا ہے اور کبھی اُس کو اس کا مطلب تفریق کرنا یعنی کسی عدد کو منفی کرنا محسوس ہوتا۔

لیکن پھر اس کو خیال آیا کہ یہ سب باتیں تو خود اس کا اپنا ذہن سوچ رہا ہے اور وہ یہ بات جاننا چاہتا ہے کہ اس کا مرشد اس کو کیا سمجھانا چاہتا ہے۔ اس پر اُس نے خود کوشش کرنا ترک کرتے ہوئے دھیان کو اپنے مرشد کی طرف لگا دیا اور ذہن کو ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ ایسا کرتے ہی اس پر غنودگی سی طاری ہوگئی اور اس نے محسوس کیا کہ اس نے غنودگی کی کیفیت میں اپنے مرشد کی آواز سنی۔ وہ اُس کو کہہ رہے ہیں کہ دھیان کو ہٹا لینا ہی نفی ہے۔۔ان الفاظ کا ادراک ایک جھٹکا بن کر اس کے شعور کو جھنجھوڑتا چلا گیا۔

دھیان ہٹا لینا ہی نفی ہے۔ وہ اس بات کی ندرت اور نکتہ آفرینی پر مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ دھیان ہٹا لینے سے نفی تو ہو گئی لیکن موجودگی سے انکار نہیں ہوا لہذا کفران بھی نہیں ہوا اور۔۔۔ اور اس گرو مہاراج نے اپنے چیلے کو یہی بات تعلیم کی تھی کہ یہ کیمیا گری یا سونا بنانے کا عمل۔۔۔ سب ذہن کی طاقت کا اظہار ہے۔ جب بندے کے ذہن میں اتنی شکتی اور طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ کسی بھی نقطے سے اپنا دھیان ہٹا لینے پر قادر ہو جائے تو اشیاء ایسے بندے کی

خواہش پر خود کو منقلب کر کے اپنی ماہیت تبدیل کرنے کی پابند ہو جاتی ہیں پھر وہ بندہ چاہے مٹی کو سونا بنا لے، پانی کو موتی بنا دے یا کوئلے کو ہیرا۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے شرط صرف یہ ہے کہ بندے کے ذہن میں اتنی سکت اور توانائی ہو کہ وہ ''بندر'' کو دھیان میں نہ آنے دے یعنی وہ کسی بھی شے سے دھیان کو ہٹا لینے پر قادر ہو۔

سورس آف انفارمیشن

مورخہ ۳فروری ۱۹۹۸ء کو جب حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے عرس کی تقریبات میں شرکت کے آنے والے زائرین اپنے اپنے گھروں کو سدھار گئے تو خانوادہ سلسلہ عظیمیہ الشیخ خواجہ شمس الدین عظیمی کی مصروفیات کا ایک نیا سلسلہ آغاز ہوتا ہے۔ وہ اپنے مرشد حضور قلندر بابا اولیاء کے مشن کی ترویج اور روحانی سائنس کی نشرواشاعت میں یوں جت جاتے ہیں گویا پہلی مصروفیت سے انہوں نے تھکن کی بجائے طاقت اور توانائی حاصل کی ہو۔ عرس کی تیاریوں کے بعد دنیا بھر سے آنے والے مہمانوں کی پذیرائی کی تیاریاں، تقریبات کا انعقاد روحانی تربیتی ورکشاپ، سینکڑوں مہمانوں سے فرداً فرداً ملنا، اُن کے مسائل کا حل تجویز کرنا، اُن کی دلجوئی کرنا، اُن کی دیکھ بھال کے انتظامات کرنا، خاطر مدارت کو مختلف محافل کا انعقاد کرنا اور پھر مہمانوں کو فرداً فرداً رخصت کرنا۔ مہمانوں کے جانے کے بعد کئے جانے والے کاموں میں منہمک ہو جانا، پھیلائے گئے انتظامات کو سمیٹنا۔۔اُس کے بعد اپنے روزمرہ کے معمولات کا ازِ سرنو آغاز کرنا۔ یہ اُن ہی کا حوصلہ اور سکت ہے۔ دیکھنے والے اُن کے حوصلے کو دیکھ کر حوصلہ پاتے ہیں اور توانائی حاصل کرتے ہیں۔

اطلاع آتی ہے آج مرشد کریم کا انٹرویو ریڈیو بریڈ فورڈ سے نشر ہوگا۔ سننے والا یہ تاثر لیتا ہے کہ یہ معمول کی ایک کاروائی ہوگی۔ کچھ لوگ آئیں گے انٹرویو ریکارڈ کریں گے اور پھر جانے کب وہ انٹرویو ریڈیو سے نشر ہوگا اور ہم چونکہ پاکستان میں رہتے ہیں اس لیے اُس انٹرویو کو نہیں سُن سکیں گے۔ اس لئے اُس کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔

اُس وقت برطانیہ میں بعد از دوپہر ۳ بجے ہیں۔ وہاں رہنے والے پاکستانیوں کو معلوم ہے کہ اس وقت پاکستان میں شام کے ۸ بج رہے ہیں اور اب سے کچھ ہی دیر میں ملک میں ہونے والے انتخابات کے نتائج آنا شروع ہو

جائیں گے۔ اس لئے اکثر لوگ ریڈیو کی اور ٹی وی کی طرف متوجہ ہیں۔ ریڈیو بریڈ فورڈ سے اعلان ہو رہا ہے کہ آج سہ پہر ۴ بجے وہ اپنے سامعین کی خدمت میں معروف روحانی سکالر اور سائنسدان حضرت الشیخ شمس الدین عظیمی صاحب کا لائیو انٹرویو نشر کریں گے۔ یہ انٹرویو ریڈیو اسٹیشن کے اسٹوڈیوز میں نہیں بلکہ فون کے ذریعے لیا جائے گا۔ اُس میں سامعین بھی شرکت کر سکیں گے۔ اگر کوئی سوال پوچھنا چاہیں گے تو وہ اس نمبر پہ فون کر کے براہ راست سوال پوچھ سکیں گے اور اُن کو جو جواب دیا جائے گا وہ سب سامعین اپنے اپنے ریڈیو سیٹ پت سن سکیں گے۔ سوال پوچھنے والوں کو لوکل

کال کی قیمت پر انٹرنیشنل کال کی سہولت حاصل ہو گی۔

لاسلکی نظام کی ترقی سے ساری دنیا میں آپ سے بات کی جاسکتی ہے اور آپ کی بات سُنی جاسکتی ہے۔ یہ انٹرویو جانے کہاں کہاں سُنا جائے گا؟ اِدھر مرکزی مراقبہ ہال میں اعلان ہوا کہ الشیخ عظیمی کے اس انٹرویو کو مراقبہ ہال کے ساونڈ سسٹم پر مراقبہ ہال میں موجود افراد بھی سُن سکیں گے۔ اس اعلان نے اُس کی دلچسپی دوچند کر دی۔ وہ بے تابی سے اُس انٹرویو کے لئے کئے جانے والے انتظامات کو دیکھ رہا تھا۔ ٹیلی فون کی تاروں کو مائک اور سپیکر سے جوڑا جا رہا تھا۔ اِدھر اُن تاروں کو ساؤنڈ سسٹم سے منسلک کرنے کے بعد ٹیسٹ کیا جا رہا تھا۔

اُس کو اشتیاق ہوا کہ وہ دیکھے کہ اتنے اہم انٹرویو کے لیے حضور بابا جی کیا تیاری فرما رہے ہیں۔ وہ ٹہلتا ہوا اُن کے کمرے کی طرف چل دیا۔ کمرے کے دروازے پہ اقبال حسین صاحب کھڑے تھے۔ انہوں نے اُس سے پوچھا۔ کیا وہ ابا جی سے ملنا چاہتا ہے؟ اُس نے کہا۔ نہیں اس وقت وہ انٹرویو کی تیاری کر رہے ہوں گے۔ اس وقت انُ کو صدٹرب نہیں کرنا چاہیے۔ اُس کی بات سُن کر اقبال صاحب مسکرائے اور کہا۔ جی نہیں کچھ لوگ ملنے آئے ہوئے ہیں

وہ اُن سے باتیں کر رہے جب انٹرویو کا وقت ہو گا تو برطانیہ سے فون آئے گا اور وہ اٹھ کر اُس کمرے میں جا کر فون پر بات شروع کر دیں گے جس کمرے میں مائک وغیرہ لگائے جا رہے ہیں اور پھر قدرے مسکراتے ہوئے کہا۔ ابا حضور کو کسی تیاری کی ضرورت نہیں ہوتی وہ ہمہ وقت تیار ہی رہتے ہیں۔

اُس کو یہ بات سُن کر کوئی اچنبھا نہیں ہوا۔ اب وہ اپنے مرشد کے بارے میں اتنا کچھ تو جان ہی گیا تھا کہ روحانی علوم کا پرچار اُن کا اُوڑھنا بچھونا ہے۔ وہ ہزاروں لوگوں کے سامنے اُن کے پوچھے گئے سوالوں کے فی البدیہہ جواب دیتے ہیں۔ اُن کی تمام تر تعلیم و تربیت اُن کے مرشد کریم کا اعجاز ہی کہی جا سکتی ہے کیونکہ انہوں نے کسی اسکول یا درسگاہ سے کوئی باقاعدہ ڈگری تو لی نہیں لیکن پھر بھی دو درجن سے زیادہ کتابیں تحریر فرما چکے ہیں اور پھر وہ ایسے موضوعات پر جن کی بابت خود اُن کا یہ کہنا ہے کہ اس سے پہلے یہ علوم علم سینہ کے طور پر ہی پڑھائے جاتے تھے۔ آج کے دور کے انسان کا شعور اتنا بالغ ہو چکا ہے کہ اب ان علوم کو باقاعدہ درس و تدریس کے انداز میں پڑھایا جا سکتا ہے۔ آپ کا یہ بھی فرمانا ہے کہ وہ دن زیادہ دور نہیں جب میری کتابیں یونیورسٹیوں میں پڑھائی جائیں گی۔

وہ وہاں سے ہٹ کر اُسی کمرے کی طرف چل دیا جہاں مائک وغیرہ نصب کئے جا رہے تھے۔ وہاں مراقبہ ہال کے شعبہ نشرواشاعت کے کارکنان تیاریوں میں مصروف تھے۔ وہ انہیں کام کرتے دیکھتا رہا۔ جب سب کچھ سیٹ ہو گیا تو دو تین بار باہر سے فون کروا کر سسٹم کو چیک کیا گیا۔ ادھر جونہی یہ تمام تیاریاں مکمل ہوئیں ادھر فون کی گھنٹی بجی اس بار یہ فون بریڈفورڈ سے تھا۔ باباجی کو اطلاع دی گئی۔ پروگرام نشر ہونے میں پانچ چھ منٹ باقی تھے۔

آپ کمرے میں آ کر فرشی نشست پہ بیٹھ گئے۔ ایک دو منٹ کی ابتدائی گفتگو کے بعد پروگرام On Air ہونا شروع ہو گیا۔

پروگرام کے پیش کار Presenterجناب مہربان صاحب تھے اور انٹرویو پینل پر طارق محمود اور پروفیسر اخلاق مغل سمیت کل چار افراد تھے۔ پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے مہربان صاحب نے جناب الشیخ خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کا مختصر تعارف کروانے کے بعد فون پر عظیمی صاحب سے انٹرویو پینل کی جانب سے تعارف اور خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد پہلا سوال پوچھا:

آپ کی کتابوں میں اکثر روحانی سائنس کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے آپ روحانیت کو ایک سائنس کیوں کہتے ہیں؟ ایک سائنٹسٹ مظاہراتِ فطرت کے مطالعے اور ریسرچ کے بعد قوانینِ فطرت اخذ کرتا ہے اور ان کو وہ فارمولوں کی صورت Summarize کر لیتا ہے۔ کیا آپ بیان فرمائیں گے کہ ایک روحانی سائنسدان یہ سارا کام کیسے کرتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ لفظ ''سائنس'' علم ہی کے اظہار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کو علم سے باہر کوئی نام نہیں دیا جا سکتا ہے۔ گہرائی میں غور کر کے کوئی چیز ایجاد کرنا بھی سائنس ہے۔ علم کا کھوج لگانا بھی سائنس ہے۔ گہرائی میں تفکر کر کے کسی چیز کی ماہیت کو معلوم کرنا بھی سائنس ہے۔ روحانی سائنس ہم اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے پیشتر علم حاصل کرنے کے اس طریقے یعنی غور و فکر سے علم حاصل کرنے کی طرف لوگوں کی توجہ بہت ہی کم تھی۔ اسی طرح سے ہم شعور کی حدود سے گزر کر لاشعور میں داخل ہو کر علم حاصل کرتے ہیں اور وہی علم حقیقی ہوتا ہے جو لاشعور ہمیں دیتا ہے۔ ہم لوگوں کو یہ پیغام پہنچا رہے ہیں تا کہ انسان لاشعوری زندگی سے واقف ہو جائے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہم کوئی کام تب ہی کر سکتے ہیں جب ہمیں اس کام کی بابت کوئی خیال آتا

ہے۔ ہم کسی خیال کے تحت جو کام کرتے ہیں اُس کو تو سائنس کہتے ہیں لیکن کوئی خیال کہاں سے آ رہا ہے، اس کی بابت کچھ نہیں جانتے۔ روحانی سائنس ہمیں یہ بتاتی ہے کہ زندگی کی بنیاد خیال ہی تو ہے۔ کہیں سے خیال آتا ہے اور فزیکل باڈی میں داخل ہو جاتا ہے یعنی اگر خیال نہ آئے تو فزیکل باڈی کوئی ایسا کام نہیں کر سکتی جو زندگی کی تعریف پر پورا اترتا ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ فزیکل باڈی کو جب تک خیال منتقل نہیں ہوتا اُس میں کوئی حرکت ممکن نہیں اور حرکت نہ ہونا ہی تو موت ہے۔ یہاں سے آگے مادی سائنس اپنی بے بسی کا اظہار کر دیتی ہے۔ روحانی سائنس ہمیں سورس آف انفارمیشن۔۔ وہ مقام جہاں سے خیال نشر ہوتے ہیں ۔۔۔ کی جانب متوجہ کرتی ہے اور سورس آف انفارمیشن لاشعور کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ جس بندے کو لاشعور سے رابطہ قائم کرنا آتا ہے وہ کائنات کے تسخیری فارمولوں سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

اب اخلاق صاحب نے سوال پوچھا۔ مسلمانوں کی جو موجودہ حالت ہے اور ہم مسلمان عالمی سطح پر جس انحطاط کا شکار ہیں آپ اس کا کیا حل تجویز کرتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں انہوں نے ایک نہایت بصیرت افروز بات فرمائی۔ آپ نے کہا۔ مسلمان اپنے اسلاف کے کارناموں اور ورثے کو تلاش کریں۔ قرآن میں ریسرچ اور تفکر کریں اور اگر مسلمان قرآن پر تفکر نہیں کریں گے، اُس پر ریسرچ کر کے اُس میں موجود تعمیری فارمولوں اور تسخیری قوانین کو نہیں اپنائیں گے تو وہ مزید غلامی میں ہی دھنستے چلے جائیں گے۔

اس کے بعد پوچھا جانے والا سوال کچھ یوں تھا۔ آپ کو ہر ماہ گیارہ ہزار کے قریب خطوط موصول ہوتے ہیں۔ بیماریوں، پریشانیوں اور مسائل کے حل کے سلسلے میں آپ اتنے بہت سے خطوط کا جواب بھی لکھتے ہیں۔ روحانی

ڈائجسٹ کے لیے بھی لکھتے ہیں۔ اُس کی ہر ماہ با قاعدگی سے اشاعت بھی کرواتے ہیں۔ نت نئی تصانیف بھی فرماتے ہیں ۔ اخبارات اور رسائل میں کالم وغیرہ بھی لکھتے ہیں۔ اندروں و بیرونِ ملک دورے بھی فرماتے ہیں ۔ اپنے روحانی شاگردوں کی تعلیم و تربیت کا بھی سلسلہ سنبھالتے ہیں۔ آپ سے سوال یہ ہے کہ آپیہ تمام کام کیسے کر لیتے ہیں جب کہ آپ کسی سے کوئی چندہ وغیرہ بھی نہیں لیتے ؟

اس کے جواب میں آپ نے تفصیل سے بتایا۔ جہاں تک اتنے سارے کام کرنے کا تعلق ہے تو یہ بات سمجھ لیں کہ تمام کائناتی کاموں کا تعلق رفتار یعنی اسپیڈ سے ہے۔ ساری فزیکل سائنسی ترقی اسی رفتار کی مرہونِ منت ہے۔ اسی رفتار کو بڑھانے اور مزید زیادہ کرنے کو آپ سائنسی ترقی کہتے ہیں۔ جیسے فزیکل رفتار زیادہ ہونے سے ایک سفر کم وقت میں طے ہو جاتا ہے اسی طرح جب شعور لاشعور کے تابع ہو جاتا ہے تو وہ دس پندرہ آدمیوں کے برابر با آسانی کام کر سکتا ہے۔ جہاں تک ہمارے مشن کے کام کا تعلق ہے تو یہ ایک ٹیم ورک ہے۔ خطوط کے جوابات کے لئے ایک دفتر قائم ہے۔ وہ ایک نظام کے تحت جواب دیتا ہے۔ ہم اخراجات کو پورا کرنے کے لئے عام چندے کی اپیل نہیں کرتے بلکہ سلسلے کے بھائیوں کی آپس کی کنٹریبیو شن سے ہماری کئی کتابوں کی رائلٹی وغیرہ بھی آجاتی ہے۔ لوگ ہماری کتب خریدتے ہیں۔ ۲۴ کتابیں اردو میں، ۱۴ انگریزی میں، ۲ فارسی اور دو پشتو میں چھپ چکی ہیں۔

اس کے بعد پوچھا جانے والا سوال خواتین کے بارے میں اُن کے نظریات کے حوالے سے تھا کہ مسلم معاشرے میں عورت، جو کہ معاشرے کا نصف ہے، اُس کو صدیوں سے جزو معطل بنا دیا گیا ہے۔ آپ نے اپنی تحریروں میں اس بات کو اکثر اجاگر کیا ہے کہ روحانی اعتبار سے عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں ہے۔ عورت بھی

اللہ کی دوست ہو سکتی ہے۔ آپ عورتوں کو اُن کا جائز مقام دلوانے کے لئے کیا لائحہ عمل تجویز فرمائیں گے اور آپ کا سلسلہ اس بابت کیا اقدامات کر رہا ہے؟

اس پیچیدہ سوال کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ عورت اور مرد دونوں کی تخلیق مذہبی نکتہ نظر سے برابر ہے۔ عورت اور مرد کی عبادات یکساں ہیں اگر کوئی کام مرد کرتے ہیں تو عورت بھی وہ کام کر سکتی ہے۔ مذہب اس پر کوئی پابندی نہیں لگاتا۔ عورت ہر طرح سے مرد کی برابری کر سکتی ہے۔ عورتوں کو چاہیے کہ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ روحانی شعور حاصل کریں۔ اس سے مردوں پر برتری حاصل کر سکیں گی۔ میں نے اپنی کتاب ''مراقبہ'' اور ''جنت کی سیر'' میں مرد اور عورت دونوں کی روحانی کیفیات لکھی ہیں اور یہ وضاحت کی ہے اُن میں کوئی فرق نہیں ہے۔ عورتوں کو چاہیے کہ وہ روحانی علوم سیکھنے کے لئے مراقبہ کیا کریں۔

اس سے اگلا سوال اُن کے جانشین کے حوالے سے کرتے ہوئے یہ پوچھا گیا کہ مسلمانوں میں بہت اچھی اچھی تحریکیں چلیں، بڑے بڑے راہنما ہوئے جو اپنے وقتوں میں یکتائے زمانہ تھے مگر انہوں نے اپنا کوئی جانشین پیدا نہیں کیا جو اُن تحریکوں کو اسی جوش و جذبے کے ساتھ زندہ رکھ سکتا اور نتیجتاً وہ تحریکیں دم توڑ گئیں یا وقتگزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت کھو بیٹھیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے آپ بھی اپنی فیلڈ میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں، کیا آپ نے اپنے مشن کو جاری رکھنے کے لئے کوئی جانشین تیار کیا ہے جس کو آپ صحیح بدل کہا جا سکے؟

اس سوال کو سن کر وہاں موجود لوگوں کے ساتھ خود اُس نے بھی دم سادھ لیا کہ دیکھیں اس دور رس اہمیت ے سوال کے جواب میں اُس کا مرشد کس خوش نصیب کے نام کا تذکرہ کریں گے، کریں گے بھی یا نہیں؟ اس پر انہوں نے اپنے اُسی مخصوص دھیمے انداز میں کہا، جس انداز میں بات کہنا اُن کا طریقہ تھا۔ ہر آدمی کی خواہش ہوتی ہے

کہ وہ اپنا جانشین چھوڑے۔ انبیاء نے بھی اپنے جانشین چھوڑے ہیں۔ ہمارا مشن خدمتِ خلق ہے۔ یہ ایک انسٹیٹیوشن کی مانند ہے۔ انشاء اللہ میرا مشن فلاپ نہیں ہوگا۔ میرے بعد میرا مشن چلتا رہے گا۔ اس میں میرے شاگرد ہیں جن میں عورتیں اور مرد دونوں ہیں اور جس پر اللہ کی رحمت ہو وہ کام کبھی نہیں رُکتا۔

وہاں موجود لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جس سے اُس نے اندازہ کیا کہ یہ جواب اُن کے لئے غیر متوقع ہی تھا۔

اس کے بعد کا سوال دلچسپ تھا۔ مہربان صاحب نے دریافت کیا کہ آپ نے روحانی ڈائجسٹ کے کسی شمارے میں تحریر فرمایا تھا کہ موجودہ دور کے جنات کی اکثریت تعمیر پسند ہے یعنی اُن میں تخریب کم ہے جبکہ جنات کے بارے میں عام نظریہ یہ ہے کہ وہ آگ سے بنے ہیں اور اُن کی سرشت ہی تخریب ہے۔ کیا آپ اس بات کی وضاحت فرمائیں گے کہ نوع جنات نے کن کن اقدامات سے اپنے اوپر تعمیری پسندی کا پہلو غالب کر لیا ہے اور انسان اپنے اوپر سے تخریب پسندی کا غلبہ کیسے توڑ سکتا ہے؟

اس کے جواب میں آپ نے نہایت فکر انگیز بات ارشاد فرماتے ہوئے کہا۔ تخریب اور تعمیر دونوں ہی ذہنی رویے ہیں اگر کسی کام میں تعمیری ذہن کام کرتا ہو یعنی اُس میں اجتماعیت ہو تو وہ تعمیر ہے اور جہاں انفرادی مفاد آجائے سمجھ لیں کہ وہی تخریب ہے۔ ساری کائنات روشنی اور رنگوں سے تخلیق ہوئی ہے۔ آدمی دو لہروں یعنی مرکب روشنیوں کی تخلیق ہے۔ اُس میں جہاں تعمیر کی صلاحیت زیادہ ہے وہیں تخریب بھی زیادہ ہے۔ جنات مفرد لہروں اور مفرد روشنی کی مخلوق ہیں اس لئے اُن میں تخریب کم ہے۔ ہمیں جنات کے جس گروہ میں جانے کا اتفاق ہوا اُن میں

اجتماعی ذہن زیادہ ہے اس لئے اُن میں تعمیر زیادہ ہے اور جن گروہوں میں انفرادی ذہن زیادہ ہے وہاں تخریبی عمل کی زیادتی ہے۔

مہربان صاحب نے۔۔۔بہت خوب بات فرمائی۔۔۔کہہ کر اس سے اگلا سوال پیش کیا کہ آپ نے اپنی کتاب روحانی نماز میں بیسویں صدی کے اختتام پر پوری دنیا کا اقتدارِ اعلیٰ عورتوں کے ہاتھ آجانے کی پیش گوئی کی ہے۔اُس کی کیا نوعیت ہوگی؟ مرد اقتدار اعلیٰ کیسے چھوڑیں گے؟

اُس کو لگا گویا یہ سوال خود اُس کے اپنے اندر کی صدا ہو جس کو طارق محمود نے سوال کی صورت پوچھ لیا تھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا۔اگر ہم تاریخِ انسانی کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ دنیا ۱۷ یا ۱۸ مرتبہ ختم ہوئی ہے۔اس میں کبھی عورتیں سربراہ ہوئی ہیں اور کبھی مرد۔جہاں تک میری پیش گوئی کا تعلق ہے کہ سنہ ۲۰۰۶ کے بعد عورت کا دور ہوگا تو میری پیش گوئی کی شروعات تو ہو بھی چکی ہے۔اس وقت دنیا میں نو ممالک ایسے ہیں جہاں کی سربراہ عورتیں ہیں۔اب عورتیں بھی جہاز تک تو اُڑا رہی ہیں اور باقی کام بھی کر رہی ہیں۔

ابھی انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک خاتون نے فون کر کے سوال پوچھا کہ کیا ہر آدمی حضور ﷺ کی زیارت کر سکتا ہے اگر ہاں تو کیسے؟

اس پر آپ نے بتایا کہ حضور نبی کریم ﷺ کی زیارت کرنے کی صلاحیت ہر مسلمان میں موجود ہے درود شریف کی کثرت اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حضور ﷺ کی زیارت ہو جاتی ہے۔کتاب روحانی علاج میں دیئے گئے زیارت کے عمل کو کرنے سے بھی لوگوں کو حضور ﷺ کی زیارت کی سعادت مل جاتی ہے۔

ایک اور صاحب نے فون کیا اور دریافت کیا کہ نماز میں یکسوئی کیوں کر حاصل ہو سکتی ہے؟ اس کے جواب میں آپ نے ایک ہی جملے میں سوال نمٹاتے ہوئے کہا۔ کتاب روحانی نماز میں درج طریقے کے مطابق عمل کرنے سے نماز میں یکسوئی حاصل ہو سکتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور فون آیا کہ یہ بتائیں کہ ہم غیر مسلم سائنسدانوں کو قرآن سے کیوں کر متعارف کروا سکتے ہیں؟

اس پر آپ نے جوابی سوال پوچھا اور کہا۔ آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ موجودہ دور کے سائنس دان قرآن سے بے خبر ہیں؟ اور بات کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ وہ قرآن کا حوالہ نہیں دیتے کیوں کہ وہ ایک مردہ قوم کی زندہ کتاب سے خوشہ چینی کا اعتراف نہیں کرنا چاہتے۔ غیر مسلم قرآن سے ہر گز بے خبر نہیں، وہ اُس میں تفکر کر کے نت نئی ایجادات کر کے اپنی برتری مستحکم کرنے میں لگا ہوا ہے لیکن بالآخر وہ یہ بات ماننے پر مجبور ہو جائے گا کہ قرآن میں کائناتی فارمولے موجود ہیں اور وہ اُن سے استفادہ کر رہا ہے۔

اس جواب کو سن کر وہ جھوم ہی تو اُٹھا۔ ''مردہ قوم کی زندہ کتاب'' کی ترکیب اُس کو بہت ہی بھائی۔ اُس نے اس جملے کی صنعتِ تضاد اور اس کے مبنی پر حقیقت ہونے کا بہت ہی لطف لیا۔

کسی صاحب نے مانچسٹر سے ایک بہت ہی عجیب سا سوال دریافت کیا کہ کوئی عورت پیر بن سکتی ہے؟ اس پر آپ نے جوابی سوال پوچھتے ہوئے کہا۔ ''آپ یہ بتائیں کہ کیا کوئی عورت کسی مرد کی استاد بن سکتی ہے؟ اس پر وہ صاحب گڑبڑا کر رہ گئے تو آپ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ اسکول میں اپنی میڈم سے ہی تو پڑھے ہیں۔ اس پر انہوں نے اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے فرمایا کہ پیر کا مطلب ہے استاد۔۔۔ روحانی استاد۔۔۔ کوئی بھی عورت جو

روحانی علوم جانتی ہو وہ روحانی استاد بھی بن سکتی ہے۔ جب ایک عورت مردوں کو دنیاوی علوم پڑھا سکتی ہے تو وہ اُن کو روحانی علوم کیوں نہیں پڑھا سکتی؟ آپ کو اکثر احادیث حضرت عائشہؓ سے ہی تو منتقل ہوئی ہیں۔ لوگ اُن کے پاس جا کر اُس سے سوال پوچھتے تھے۔ اُن کو سوال پوچھنے پر ہی تو یاد آتا تھا کہ اس موقعے کے لئے حضور ﷺ نے کیا بات ارشاد فرمائی تھی۔

اس کے بعد کا سوال نماز کی فرضیت کی بابت تھا جس کے جواب میں آپ نے اتنا ہی کہا کہ جی ہاں نماز ہر حال میں فرض اور لازم ہے۔ اس قسم کی کوئی بھی بات ہو تو آپ قرآن کی طرف رجوع کریں۔ کوئی مسلمان یہ کہہ ہی نہیں سکتا کہ نماز غیر ضروری ہے۔

ایک اور صاحب جن کو خواب میں ڈر لگتا تھا دریافت کیا کہ وہ کیا کریں؟ اِس پر جواباً کہا۔ شک اور وسوسوں میں پڑے رہنے سے دل کمزوری کا شکار ہے۔ آپ نماز قائم کریں خواب میں ڈر نہیں لگے گا۔ ایک اور سوال یہ ہوا کہ دُعا کی قبولیت کا کوئی مجرب طریقہ بتایا جائے۔ اس پر آپ نے کہا۔ دُعا کی مقبولیت کا عمل روحانی علاج کتاب میں موجود ہے۔ پڑھ کر کریں۔ ان شاءاللہ دُعا قبول ہو گی۔

ایک خاتون کا فون آیا کہ میں اپنے شوہر کو نیک راہ پر چلانا چاہتی ہوں۔۔ کیا کروں؟ اس سوال کا جواب آپ کی مسکراتی ہوئی آواز میں نشر ہوا۔ ”آپ اپنی اصلاح کرتی رہیں۔ اس بات کو لڑائی جھگڑے کا باعث نہ بنائیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو حضور ﷺ کو کہہ دیا تھا کہ آپ رنجیدہ نہ ہوں ہم نے آپ کو دروغہ بنا کر نہیں بھیجا۔ آپ بھی شوہر کو آرام سے سمجھا دیں۔ ضد اور بحث کا پہلو درمیان میں لائے بغیر۔۔۔۔

اس کے ساتھ ہی میزبان مہربان صاحب نے پروگرام کے وقت کے ختم ہونے کے سبب اس سوال جواب کے سلسلے کو یہیں روک دیا۔ آپ کا شکریہ ادا کیا کہ آپ نے اپنے وقت میں سے اُن کو وقت دیا۔ جب ریڈیو پر گفتگو کو سلسلہ اختتام پذیر ہوا تو پاکستان میں رات کے دس بجنے میں چند ہی منٹ باقی تھے۔

کہتے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کئے جانے کا حکم صادر ہو گیا اور اپنی دانست میں اہلِ یر وشلم ان کو سُولی دے چکے تو ان کے حواریوں کو سب سے بڑا مسئلہ در پیش ہوا وہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کو اگلی نسل تک منتقل کرنے کا کام تھا اور اس سے پیشتر خود ان کی اپنی بقا ضروری تھی۔ اس کام سے عہدہ بر آ ہونے کو وہ آپس میں چوری چھپے ملتے۔ ایک دوسرے کی پہچان کے لئے انہوں نے صلیب کے نشان کا انتخاب کیا۔ ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت اپنی شناخت کا اظہار کرنے کو انہوں نے صلیب کو بطورِ علامت چنا، اس کی ظاہری وجہ تو حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر سُولی دیا جانا تھا لیکن یہ تو اس زمانے کا دستور تھا کہ سزائے موت پانے والوں کو اس اذیت ناک طریقے سے ہلاک کیا جاتا تھا۔ ڈاکوؤں اور قاتلوں کو نشان عبرت بنانے کے لیے انہیں صلیب پر کیلوں سے ٹھونک دیا جاتا تھا۔ تو پھر مسیح کے حواریوں نے صلیب ہی انتخاب کیوں کیا؟

غور و فکر کرنے والوں نے اس کے بہت سے جواب تراشے۔ مثلاً یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معتوب ہونے کے بعد ان کے حواری اور پیروکاروں کو اپنی قوم اور حکومت سے خطرہ تھا کہ وہ انہیں بھی اسی طرح ہلاک نہ کروادیں۔ اس لیے وہ ایک دوسرے کو صلیب دکھا کر محتاط رہنے کی تلقین کرتے اور پھر بعد میں یہی بات رسم بن گئی اور اس کو تثلیث کی ظاہری مناسبت سے عیسائیت کا نشان ہی قرار دے دیا گیا بظاہر یہ بات دل کو لگتی ہے اور شعور بھی مطمئن ہو جاتا ہے لیکن ایک روز اس کے ایک عیسائی دوست نے اس کو یہ کہہ کر چونکا دیا کہ عیسائی راہبوں کے نزدیک صلیب کا نشان اس لئے چنا گیا کہ اس میں نفی ذات کا درس پوشیدہ ہے۔ اس نے یہ سن کر لطف لیتے ہوئے پوچھا : بہت خوب! تو گویا آپ بھی نفی ذات پر یقین رکھتے ہیں۔

اس کے دوست نے بُرا منائے بغیر کہا۔۔ ہمارے یہاں نہ صرف اپنی ذات کی نفی کرنے پر اصرار کیا جاتا ہے بلکہ خداوند کی رضا کو اولیت دینے کے لئے ہمارے یہاں یہ کلمہ ہر ایک کے ورد زباں رہتا ہے کہ ''تیری مرضی پوری ہو۔''۔۔اور اسی بات کو انگریزی میں THY WILL BE DONE کہا جاتا ہے۔

اس نے حیرت سے سنا اور پوچھا یہ تو ٹھیک ہے لیکن صلیب میں نفی ذات کا استعارہ کیسے ہوا؟

اس پر اس کے دوست نے سر سے ناف تک اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ ''میں''۔۔ یعنی انگریزی کا لفظ ''I''ہوا جو کہ صیغۂ واحد متکلم ہے اور پھر اسی ہاتھ سے بائیں سے دائیں کندھے کی طرف ایک خط تنسیخ کھینچتے ہوئے کہا اور یہ میری نفی ہوئی۔ ''آئی ایم نتھنگ'' I AM NTHING یعنی میں کچھ بھی نہیں ہوں۔

استعجاب اور حیرت سے اس کا منہ کُھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ جب بھی کوئی نئی بات سنتا ، کوئی تازہ چیز اس کے علم میں آتی اس کو حیرت اور لطف کی آمیزش بیک وقت اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ وہ دیر تک اس بات کا لطف لیتا رہا۔ پھر یکبارگی اس کو ایک طرح کا احساس محرومی ہوا۔ کیا وہ بھی اپنے مذہب کے حوالے سے اتنی ہی خوبصورت بات اپنے دوست کو سنا سکتا ہے۔ اس کو ذہنی طور پر تلاش بسیار کے بعد بھی جب کچھ پلے نہ پڑا تو وہ وہاں سے اُٹھ کر آگیا۔ اس نے بعد میں بھی کئی بار دوست کی اس بات کو ذہن میں سراہا اور پھر اسی دھن میں جت گیا کہ خود اس کے اپنے مذہب کی تعلیمات میں وہ کون سی بات ہے جس میں نکتہ آفرینی اپنے دوست سے سنی گئی بات سے اگر بڑھ کر نہیں تو اس کے ہم پلہ تو ہو۔

جب اُس نے غور کیا تو یہ دیکھ کر اسے ایک گونہ اطمینان ہوا کہ کلمہ طیبہ نفی و اثبات کا ایک عجیب خوبصورت مرقع ہے۔ ہر وہ شخص جو اسلام قبول کرتا ہے اور اپنے مسلمان ہونے اور حضور نبی کریم ﷺ کی تعلیمات پر عمل پیرا

ہونے کا اعلان کرتا ہے تو لا الہالا اللہ کہتا ہے۔ کوئی الہ ہے ہی نہیں، ماسوا اللہ کے۔ اس جملے میں ہر چیز بشمول خود کہنے والے کی اپنی ذات کے جو کسی بھی صلاحیت سے آراستہ ہے۔۔ اُس کی نفی اور اللہ رب العالمین کی ذات بزرگ و برتر کی الوہیت کا اقرار و اثبات۔۔ دونوں ہی اس کلمے میں بیک وقت موجود ہیں۔ اُس کو اس سوچ نے ڈھارس دی اور اٹھتے بیٹھتے لا الہ الا اللہ کی تکرار کرنے لگتا۔ کلمے کے مفہوم کی گہرائیوں میں اُترتا۔۔ اپنی سوچوں میں اس کلمے کے آہنگ کو محسوس کرتا۔ اُس کو وجدانی طور پر ایک لطف سا آتا۔

وہ اس لطف کا بار بار مزہ لینے کو اُس کی تکرار کرتا۔ ایک روز مسجد میں نماز سے فارغ ہو کر وہ گھر جانے کے بجائے بے خیالی کی کیفیت میں وہیں بیٹھا رہا۔ اس نے دیکھا کچھ لوگ محراب کے قریب اکٹھے ہو رہے ہیں اور پھر وہ سب ایک حلقہ سا بنا کر بیٹھ گئے اور پھر کلمہ کا ورد با آواز بلند ہونے لگا۔ اس حلقے میں شامل سب ہی لوگ ایک ہی تال میل سے لا الہ الا اللہ پڑھ رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے صرف لا الہ اللہ کی تکرار کرنا شروع کر دی۔ ان کے سر ہل رہے تھے۔ کچھ ایک عالموارفتگی میں کچھ کے سرور میں اور چند ایک محض تقلید میں، وہ انہیں دیکھتا رہا۔

کلمہ کا آہنگ، آوازوں کا تال میل، وہاں ایک طرح کی گونج پیدا ہو رہی تھی۔ وہ اس گونج میں اُبھرتا ڈوبتا رہا۔ وہ دس پندرہ منٹ وہاں بیٹھا۔ اس کو یوں لگا کہ وہ وہاں ہمیشہ سے بیٹھا ہے جیسے صدیاں اور قرن گزر گئے ہوں۔ وہ ایک ٹک دیکھتا رہا ایک عالم بے خودی میں وہ خود کھو گیا تھا۔ سوائے اللہ کے کچھ نہیں۔ یہ بات ہر حقیقت سے بڑھ کر حقیقی ہے اور حقیقت کی حقانیت کا لطف ہر دروغ اور غلط بات کے وقتی اور لمحاتی تاثر کی بجائے پائیدار اور لافانی ہوتا ہے۔ وہ اس کیف سے سرشار اس گونج میں کھویا بیٹھا اس ورد کو سنتا رہا۔ جب سربراہ حلقہ ''محمد رسول اللہ'' کہہ کر

ورد کا اختتام کیا اور وہاں موجود کچھ لوگوں نے انگلیوں کی پوروں کو چوم کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے ﷺ پڑھا تو وہ جیسے ہوش میں آگیا۔ بے خودی کی کیفیت اپنا تاثر چھوڑ کر اس کو واپس شعور میں لے آئی۔

مسجد سے نکل کر گھر جاتے ہوئے اس نے اپنے ذہن میں ایک سوال تشکیل پاتے دیکھا۔ ان لوگوں نے کلمہ کے حصہ اول کی تکرار تو کی لیکن حصہ آخر کو صرف ایک ہی بار کیوں کہا؟ انہوں نے مکمل کلمے کا ورد کیوں نہیں کیا؟ اگر وہ حصہ آخر کی بھی تکرار کرتے تو بھلا کیا فرق پڑتا؟ ہوگا کچھ سوچ کر اس نے سوال کو پیچھے دھکیل دیا۔ اس وقت وہ اس کیفیت کا مزہ برقرار رکھنے کو کسی اور سوچ میں الجھنا نہیں چاہ رہا تھا۔

رات کو سونے لیٹا تو دن بھر کی کارکردگی کا ایک طائرانہ سا جائزہ لیتے ہوئے اسے کلمہ کی تکرار، ذکر جہری کی گونج اور اپنا وہ سوال دوبارہ یاد آگئے۔ اس نے شعور کو اس سوال کی طرف متوجہ رہنے دیا۔ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔

شاید کلمے کا مفہوم کوئی سراغ دے دے۔ اس نے اپنے شعور میں کلمے کا مفہوم تازہ کرتے ہوئے سوچا۔ جتنی بار کلمے کے حصہ اول کی تکرار کی گئی تھی اتنی ہی بار حصہ آخر کی تکرار بھی ہونا چاہیے تھی۔ جب کافی دیر تک بھی کوئی بات سمجھ نہ آئی تو اُس نے خود کو نیند کے حوالے کر دیا۔ غنودگی کی ایک لہر آئی، حواس میں ایک سکون اور ٹھہراؤ کا وقفہ آیا۔ وہ بیداری سے نکل کر خواب کے حواسوں کے قریب ہو رہا تھا اور پیشتر اس کے کہ وہ نیند کی وادی میں پوری طرح سے داخل ہو جاتا، اس نے ایک آواز سنی۔۔ یہ ''اور'' کا کیا مطلب ہوا؟۔۔ آواز کا مفہوم شعور پر ایک ضرب لگا گیا۔ شعور نیند کی وادی میں اترتے اترتے رک گیا۔ ''اور؟ کون سا ''اور؟'' کیسا اور؟

شعور کی سطح پر پے در پے سوالیہ نشا ن ابھرے اور وہ نیند کی وادی سے پلٹ آیا۔ اس نے سوچا یہ کیا ہوا؟ اس کے ارد گرد دور تک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔۔ یہ کیا ہوا؟ یہ آواز کیسی تھی؟ اس کے تجسس نے اُس کو نیند سے باہر آنے پر مجبور کر دیا۔ پھر اس کو خیال آیا کہ وہ کلمہ طیبہ پر غور کر رہا تھا۔ ''اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔

اچانک ایک چھناکا سا ہوا۔ اُس کے شعور میں ایک کوندا سا لپکا ۔ جب خیال کا کوندا ذہن کی گہرائیوں میں سما گیا تو اس نے اس کو ایک سوال کی صورت ابھرتے دیکھا۔ کلمہ طیبہ میں حرف اضافت ''و'' نہیں ہے تو پھر ہم اس کے ترجمہ میں ''اور'' کیوں لگاتے ہیں۔ تو پھر یہ ''اور'' کیا ہوا؟ اس کا کیا مفہوم ہے؟ بات سلجھنے کی بجائے اور الجھ گئی۔ اس رات وہ دیر تک خود سے الجھتا رہا۔ مختلف پہلوؤں کو زیر غور لاتے ہوئے سوچتا رہا اس نے کبھی اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کو قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا تھا۔ لیکن لاشعور کی یہ صدا بازگشت بن گئی کہ یہ ''اور'' کیا ہے؟ اس لئے شعور اِدھر متوجہ رہنے کا پابند تھا۔

عموماً لاشعور سے ہدایت اور راہنمائی کا خیال شعور کو مکمل طور پر ہی منتقل ہوا کرتا ہے۔۔ لیکن اس بار صرف ایک اشارہ تھا۔ یہ ضرور مجھے کسی منزل تک پہنچا دے گا۔ وہ اس بات کو لے کر سو گیا۔ پھر کئی روز تک وہ اسی ادھیڑ بن مین لگا رہا لیکن بے سود۔ الجھن حل ہونے کی بجائے بے چینی کو جنم دینے لگی۔ وہ جب بھی کلمہ طیبہ کا ورد کرتا، اس کے مفہوم کو ذہن میں لاتا تو یہ خیال گرہ بن جاتا ۔۔۔ یہ ''اور'' کیا ہے؟

کلمہ طیبہ چونکہ اساسی اور بنیادی ارکین میں سے ہے۔ اس لئے اُس نے اپنے مذہب کی بنیادی باتوں پر غور کرنا شروع کیا۔ پہلی بات تو یہ طے کرنا تھی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا متعارف کردہ مذہب کیا ہے؟ جب اُس نے

اپنے ذہن میں اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ابھرتے دیکھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ سے متعارف کروایا اور اسلام وہ مذہب ہے جو بندے کو اللہ سے ملوا دیتا ہے۔

اس پر اُس کے اندر ابھی اپنے حاصل تفکر کی تائید کا خیال جڑ پکڑ ہی رہا تھا کہ اس کے اندر ایک اور بات یہ ابھری کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے والد ماجد کا نام عبد اللہ تھا۔ یعنی اللہ کا بندہ۔ اس کا مطلب ہوا کہ حضور کی پیدائش سے کم از کم ۲۰۔۲۵ سال پیشتر جب اُن کے والد کا نام رکھا جا رہا تھا تو لوگ اللہ سے بطور الٰہ اور معبود واقف تھے۔ اس کو معبود مانتے تھے۔ اسی لئے تو اُن کا نام اللہ کے ساتھ ملا کر عبد اللہ رکھا گیا تھا۔ یعنی یہ نام نہ صرف لوگوں کے تعارف میں تھا بلکہ وہ اس کو واجب الاحترام ہستی مانتے ہوئے اپنے بچوں کو اس کی عبدیت میں دینے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ تب ہی تو عبدالمطلب نے اپنے لخت جگر کا نام عبد اللہ قرار دیا تھا۔

تو پھر آخر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ان لوگوں کو اتنا بڑا اختلاف کس ضمن میں تھا کہ نوبت اس حد تک پہنچ گئی کہ انہیں قبیلے سے باہر نکال کر شعب ابی طالب میں تین سال انتہائی کسمپرسی کے حال میں بسر کرنے پڑے۔ اُن کا اختلاف اتنا شدید تھا کہ وہ سب لوگ ان کی جان کے درپے ہو گئے۔ وہ جو انہیں صادق اور امین مانتے تھے۔ اونٹ کی اوجھ اُن کے اوپر ڈال کر انہیں اُس میں بند کر کے ایک انتہائی تکلیف دہ موت اور ایک ذلت آمیز طریقے سے جان سے مار دینے کی مذموم کوشش سے لے کر ہجرت کی رات اُنؐ کا خاتمہ کر دینے تک کی کوششوں پر ہیا کتفا نہیں ہوا بلکہ یہ بات غزوہ بدر سے لے کر فتح مکہ تک کتنے ہی غزوات کا سبب بنی اور اس بات کو قائم کرنے میں کتنے ہی مسلمانوں نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے۔ بات محض اللہ کو متعارف کروانے کی نہیں تھی بلکہ کوئی اور بات بھی تھی ورنہ اللہ تعالیٰ کی ذات تو کفار کے تعارف میں پہلے سے ہی تھی۔

اب اُس کی سوچوں کا دھارا ہی بدل گیا۔ تجسس نے اس کو یہ بات سمجھائی کہ اس بات کا سراغ لگانا چاہیے کہ آخر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اُن ﷺ کے نہ ماننے والوں کے اختلاف کی اصل وجہ کیا تھی؟

اُس نے مذہبی تاریخ کی کتنی ہی کتابوں کو کھنگال ڈالا۔ کئی کتابیں بار بار پڑھیں اور کئی ایک کو دوبارہ پڑھا۔ ہر بات کی تان اسی پر آکر ٹوٹتی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے درس توحید دیا۔ اللہ کی وحدانیت کا علم بلند کیا تو اس پر کفار اُن کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

اس کے شعور میں یہ گرہ کچھ اس طرح سے الجھی تھی کہ سلجھانے کی ہر کوشش کا نتیجہ صفر سے اگے بڑھ ہی نہیں رہا تھا۔ جو بات اُس کو سمجھ نہیں آرہی تھی وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کے نام سے تو وہ پہلے ہی واقف تھے اور یہ بات طے تھی تو پھر آخر جھگڑا کس بات کا تھا۔ اُس نے اس زاویے پر اپنے دوستوں سے مدد چاہی۔ کچھ نے کہا کہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہ اللہ کے ساتھ اور خداؤں کو بھی شریک ٹھہراتے تھے۔ اللہ کے علاوہ دیگر ہستیوں کو بھی عبادت کے لائق سمجھتے تھے اور اسی بات پر انہیں مشرک کہا جاتا تھا۔ لیکن کفار مکہ کی اصطلاح سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضور کی بات ماننے پر آمادہ تو کجا اس کے رد میں اتنا آگے بڑھ گئے تھے کہ بات محض دشمنی کی نہیں بلکہ جانی دشمنی کی بن گئی تھی۔

وہ جرح کرتا تو دوست اس کی کج فہمی پر تاسف کا اظہار کرتے کہ تمہیں سامنے کی بات سمجھ نہیں آرہی۔ تم اتنے کند ذہن ہو اور وہ اپنی کم فہمی پر ندامت سی محسوس کرتا لیکن یہ ضرور کہتا چلو مان لیا کہ وہ شریک ٹھہراتے تھے اور حضور اکرم انہیں اس شرک سے روکنا چاہتے تھے لیکن محض اس نظریاتی اختلاف سے بات کیسے بڑھ گئی کہ نوبت جنگ و جدال اور قتال تک پہنچ گئی۔ اگر حضور نبی کریم ﷺ ایک نئے طریقہ عبادت کو رائج کرنا چاہتے تھے تو انہوں

نے اس وقت مذہبی رواداری کا نعرہ کیوں نہیں لگایا۔ آخر آج کل بھی تو ہم ہر مذہب کے پیروکار کو اپنے اپنے مذہب کے پرچار کا آئینی تحفظ دیتے ہیں۔

وہ دوستوں سے کہتا کہ بات ضرور کچھ اور بھی تھی ورنہ کفار کو ایسی کیا مصیبت آن پڑی تھی کہ وہ خاندان قریش کی ناموس تک کو خاطر میں نہیں لا رہے تھے بلکہ خود اہلِ قریش ہی ان کے خلاف تھے۔ اس کے دوست اس کی ہٹ دھرمی سے عاجز آ کر اس کی ہاں میں ہاں ملا کر اٹھ جاتے۔

یہ بات اُس کو مزید سند مہیا کر دیتی کہ جب وہ ایک بات کہتا ہے۔۔ سننے والا بندہ اُس بات کو نہیں مانتا تو خاموش ہو جاتا ہے کہ اچھا ٹھیک ہے تم اپنی راہ چلو۔ یہ تھوڑا ہی ہے کہ وہ اُٹھ کر اس سے مار پیٹ کرنے لگیں کہ نہیں تم ہماری ہی بات مانو۔

کچھ کتابوں میں اس کو یہ بات بھی ملی کہ کفار مکہ اپنے اسلاف کی روایات سے پیچھے ہٹنے پر تیار نہ تھے اور سارا جھگڑا ہی یہ تھا کہ اسلاف کے عقائد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نظریئے سے متصادم تھے۔ اب اس کے اندر یہ سوچ بھی وارد ہوئی کہ اُن کے اسلاف کے نظریات میں ایسی کیا بات تھی جو وہ حضور کے پیش کردہ نظریے سے اتنے الرجک ہو گئے تھے کہ ان کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا اُن کا مشن بن گیا تھا۔ مشن بھی کوئی ایسا ویسا نہیں بلکہ اس کے لیے انہوں نے اپنی جانیں تک لڑا دیں اور سینکڑوں افراد اپنی اس سعی و کاوش میں جہنم رسید ہو گئے۔

اس کی سوچ زینہ بہ زینہ جب یہاں تک پہنچ گئی تو ایک روز ایک واقعے نے اُس کی فہم میں ایک دریچہ سا وا کر دیا۔ ہوا یوں کہ وہ کسی کے گھر گیا۔ وہاں صاحبِ خانہ نے گھر میں ختم دینے کو ایک تقریب کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ قریبی مسجد سے لڑکے اور آدمی طے شدہ ہدیہ پر بلا کر انہیں ختم قرآن پر لگا کر وہ احباب سے گپ شپ کر رہے تھے۔ باتوں ہی

باتوں میں معلوم ہوا کہ انہیں نے ختم قرآن کا پروگرام اس لئے کیا ہے تا کہ اُن کے کاروبار میں برکت ہو اور منافع میں اضافہ ہو جائے۔

اس کو یہ بات سن کر کچھ عجیب سا لگا۔ اس نے دھیمے سے لہجے میں ''آپ کاروبار کرنے میں محنت اور دیانت سے کام کرتے ہوئے ساتھ ساتھ ہمت کریں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کے کاروبار میں ضرور برکت عطا فرمائے گا۔''

اُس کی بات کے جواب میں میزبان کے منہ سے نکلا۔ ''مجھے کسی نے بتایا کہ ختم قرآن کے بعد دعا کروائیں اور اتنے لوگوں کو کھانا کھلا دیں تو کاروباری حالات بہتر ہو جائیں گے۔ بھئی ہمیں تو کوئی جو بھی طریقہ بتاتا ہے ہم اس کے مطابق اپنے کاروبار میں اضافے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔'' وہ یہ سُن کر بہت کچھ کہنے کی خواہش رکھنے کے باوجود خاموش ہی رہا۔۔ وہاں سے واپسی پر وہ خیالات اور سوچوں کے مختلف دھاروں میں بہتا اپنے سابقہ سوال پر واپس پہنچ گیا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دور میں بھی لوگ اسی طرح خدا کو راضی کرنے کے لئے نذر و نیاز اور چڑھاوے چڑھاتے ہوں گے۔ خدا کی رضا اُن کے نزدیک ایک قابلِ خرید شے بن چکی تھی۔ خدا کو راضی کرنے کا آسان راستہ انہوں نے تلاش کر لیا تھا۔ وہ اپنے ہر جرم پر پردہ ڈالنے کو اپنے خود ساختہ خدا کے سامنے چڑھاوا دے کر خود کو بہلا لیا کرتے تھے۔ خداوند تعالیٰ سے سودے بازی میں ان کو مہارت اور سہولت دونوں حاصل تھیں۔ انسانوں ہی کے ایک طبقے نے خدا کی نمائندگی سنبھالتے ہوئے خدا کے نام پر آنے والے چڑھاووں کو اپنے تصرف میں لانے کا ''مقدس'' فریضہ سرانجام دینا شروع کیا ہوا تھا۔

حضور نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں اسی غلط تصور پر ضرب لگائی ہو گی اور بتایا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کسی خاص مقصد کے لئے تخلیق کیا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ کی عبدیت اس طرح سے کرنا چاہیے کہ وہ اس کے احکامات کی بجاآوری میں کوشاں رہے نہ کہ اُس سے اپنی ہی خواہشات کی تکمیل کی فرمائش کرتا رہے۔

انہوں نے اپنی عبودیت اور بندگی کا فریضہ نبھاتے ہوئے اپنے ہم جنسوں کو ان غلط عقائد سے ۔۔۔ جو اُن عقائد کے ماننے والے کے لئے ابدالآباد تک کی تکلیف و آزار کا سبب بن رہے تھے۔۔۔ بچانے کی خاطر کیا کیا تکلیفیں نہیں جھیلیں۔ اسی سبب انہوں نے اپنے ماننے والوں کو اس بات کا پابند بنانے کے لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے متعلق کسی بھی ایسے نظریئے کو نہ مانیں جو خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیان کردہ تصور الوہیت کے خلاف ہو۔ وہ ان سے کلمہ طیبہ کے الفاظ کی صورت یہ عہد لیتے تھے کہ وہ اللہ کے صرف اس تصور کو اپنے ذہنوں میں قائم کریں گے جو حضور نبی کریم ﷺ نے پیش کیا ہے اس تصور کے علاوہ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی اور تصور کو کسی صورت میں قطعاً قبول نہیں کریں گے۔

اُس نے عربی جاننے والوں سے کلمہ طیبہ کے اس مفہوم کی تائید چاہی کہ اگر ہم کلمہ طیبہ کا یہ مفہوم سمجھیں کہ ایک بندہ عہد کرتا ہے۔ کہ وہ اُس اللہ کے سوا جس کے رسول محمد ﷺ ہیں کسی اور کو الٰہیہ نہیں مانے گا۔۔ تو کیسا رہے گا؟ اُس وقت انتہائی خوشی اور مسرت محسوس کی جب اُس کے خیال کی تائید میں کئی لوگوں نے اقرار کیا کہ یہ مفہوم زیادہ زوردار اور قابلِ فکر ہے۔

وہ اس مفہوم کے حوالے سے جتنا بھی سوچتا، اس کے اندر رہ رہ کر یہ بات راسخ ہوتی چلی گئی کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے جب لوگوں کو اللہ کے نام پر سودے بازی کرنے سے روکا اور اس کی ذات کو خرید و فروخت اور نذر نیاز سے بالا اور بلند تر بتایا تو اُن کو اپنے اس نظام کی جڑ کٹتی محسوس ہوئی جس کی آڑ میں وہ خدا کے نام پہ دکان سجائے

، سیدھے سادھے بے شعور عوام سے خراج وصول کرتے تھے۔ اس بات کو ان کے مادیت پرست شعور بھلا کیسے گوارا کر سکتے تھے لہذا وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جان کے ایسے دشمن بن گئے ، جس کی نظیر پیش کرنے میں تاریخ کامیاب نہیں ہو سکتی۔

اس بات کو سوچ کر اس کے اندر ایک طمانیت کا احساس ابھرا کہ کلمہ طیبہ کا اصل مفہوم یہ بنتا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے ہر ماننے والے کو اللہ کا صرف وہ تصور اپنے اندر راسخ کرنا چاہیے جو حضور ﷺ نے پیش فرمایا تھا۔ اللہ کو اُسطرح سے سمجھنا جس طرح سے سمجھنا چاہیے جس طرح مجھے اللہ کا رسول محمد ﷺ سمجھانا چاہتا ہے۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے اللہ کا وہ تصور جو حضور ﷺ مجھے سمجھانا چاہتے ہیں اس کی خبر کہاں سے لائی جائے؟

اس کے اندر سے اس بات کے دو جواب ابھرے اور بازگشت بن کر گونجنے لگے۔ قرآن حکیم اور اُس کو سمجھانے والا کوئی بندہ۔ اگر اس کو کوئی ایسا بندہ مل جائے جو اُس کو قرآن حکیم کی درست تفہیم کی راہ پر گامزن کر دے تو وہ اللہ کے اس تصور سے واقف ہو سکتا ہے جس کو اللہ کے رسول حضور ﷺ نے لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا۔

اسے دیکھ کبیر ارویا

کہتے ہیں ایک فقیر کے خدا رسیدہ ہونے کی بات سن کر ایک امیر ان سے ملنے چلا گیا۔ فقیر نے اس امیر کی بہت ادب سے پذیرائی کی اور اس کی آؤ بھگت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ امیر نے سمجھا کہ فقیر اس کے تزک و احتشام، شان و شوکت، عزت و مرتبے، اُس کے لباس فاخرہ اور ٹھاٹ امیری سے مرعوب ہو گیا ہے۔ اُس نے کچھ دیر تو اس مہمان داری کا لطف لیا لیکن آخر جب اُس سے رہا نہ گیا تو اُس نے کہا۔ ''میں تو کچھ اور سمجھ کر آپ سے ملنے آیا تھا۔''

فقیر نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے دریافت کیا۔

''آپ نے کیا سمجھ کر فقیر کو عزت بخشی؟''

امیر نے کہا۔ ''میں تو آپ کو ایک خدا رسیدہ فقیر جان کر آپ کی خدمت میں حاضر ہونا ایک سعادت سمجھا تھا لیکن آپ نے جس طرح سے مجھ دنیادار کی عزت افزائی دنیاداروں کے انداز میں فرمائی ہے، اس سے مجھے بہت مایوسی ہوئی ہے کہ آپ بھی میری امارت کے سحر کا شکار ہو گئے ہیں۔''

فقیر نے یہ دیکھ کر کہ امیر کی بنی ہوئی توقعات فقیری کی چوٹ کی تاب نہ لا کر ٹوٹ چکی ہیں، بڑی رسانیت سے کہا۔ ''کیا میں یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ نے اس خاکسار کو فقیر کیوں کہا؟''

امیر اس غیر متوقع سوال سے قدرے الجھ سا گیا لیکن کہا۔ ''آپ دنیا کو چھوڑ کر شہر سے باہر جا گزین ہوئے، اس پر میں نے آپ کو فقیر جانا اور اس ہی لئے آپ کو قابلِ صد احترام سمجھتے ہوئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔''

''اور میں نے تو آپ کو خود سے بڑا فقیر سمجھتے ہوئے آپ کی پذیرائی کی۔ آپ کا احترام میں نے اسی لئے کیا کہ آپ مجھ سے کہیں بڑے فقیر ہیں۔'' فقیر نے مسکراتے ہوئے امیر کو بتایا۔

وہ امیر یہ سن کر بالکل ہی الجھ گیا اور کہا۔

''آپ یہ کیا فرما رہے ہیں؟ میں تو دربار شاہی سے وابستہ ایک عام سا دنیا دار انسان ہوں اور آپ کے نیاز حاصل کرنے، آپ سے فیض کی طلب اور دعا کی آس میں، آپ کے آستانے پر حاضر ہوا تھا۔ یہ آپ مجھے کن کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہیں؟''

فقیر نے اسی دھیرج اور متانت سے کہا۔ ''میں نے غلط نہیں کہا۔۔۔ میں نے دنیا کو چھوڑا تو آپ جیسے امیر نے مجھے قابلِ عزت گردانا۔ اب اگر آپ جیسا سمجھدار انسان ۔۔۔ آخرت کی لافانی زندگی کو چھوڑ کر محض دنیا پر ہی قناعت کر لے تو لامحالہ اُس کی قربانی مجھ سے بڑی ہو گی اور وہ تو بہت ہی فقیر ہوا۔ لہذا مجھ پر آپ کی عزت و تکریم واجب ہوئی یا نہیں؟''

فقیر نے ضرب کلیمی سے امیر کی طرزِ فکر پر جو چوٹ لگائی اُس نے اُس امیر کے شعور میں کیا اتھل پتھل مچائی ہو گی اسکا اندازہ ہر صاحب ذوق خوب اچھی طرح سے لگا سکتا ہے۔

یہ واقعہ پڑھ کر اُس کے ذہن میں خیال وارد ہوا کہ یہ فقیر لوگ بھی خوب ہوتے ہیں۔ ایسی بات کہہ سناتے ہیں کہ ایک بار تو بنی ہوئی سوچوں کا پورا سانچا بھک سے اڑ جاتا۔ ساری ہوا نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ ذہن محدودیت کے جال سے باہر موجود لامحدود فضاؤں سے آشنا ہو جاتا ہے اور اوندھی کھوپڑی ایک جھٹکے سے سیدھی ہو جاتی ہے لیکن شعور

بڑی محنت اور تگ و دو سے واپس اپنے خول میں سمٹ آتا ہے اور اپنی خیر مناتا ہے کہ اس نے سیدھے ہونے کے اس موقع سے بھی نجات پائی۔

شعور انسانی خود فریبیو ں کی جس غلط روش پر اڑا ہوا ہے اس کے کئی مظاہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھگت کبیر داس نے یہ دُکھڑا رویا تھا۔

رنگی کو کہیں نارنگی، تنت مال کو کھویا

چلتی کو کہیں گاڑی، اسے دیکھ کبیر رویا

سننے والوں نے اس وقت بھی اس بات کو اسی طرح سراہا ہوگا جیسے آج کا انسان اس کو پڑھ کر سر دھنتا ہے لیکن کیا اس نے چلتی ہوئی چیز کو گاڑی کہنا چھوڑ دیا؟ کیا وہ حاصل مال کو کھویا کہنے سے باز آگیا؟ کیا اُس نے نارنگی کہنا ترک کر دیا؟ تو پھر ہوا کیا؟ اس کے اندر اس ''کیا ہوا'' کی گردان تکرار بنتی چلی گئی۔

اس نے گڑ گڑا کر اللہ سے سکون اور اطمینان قلب عطا ہونے کی دعا مانگی تو اس کے اندر سے ایک لہراتے ہوئے خیال نے کوڑے کا روپ دھار لیا۔ سکون مانگنے والے کیا واقعی سکون کے طلب گار بھی ہیں؟ یا سکون کا مطلب کسی بھی ایسی کوفت سے بچنا لیتے ہیں جو شعور کو سیدھی، کھری اور بے نیام سچائی کا سامنا کرتے وقت ہوتی ہے۔۔۔ اب اس کا کیا مطلب ہے؟۔۔۔ نہیں۔۔۔ بالکل نہیں وہ گڑ بڑا کر رہ گیا۔ بھلا اس بات کا کیا مطلب ہوا؟

سکون مانگنے اور پھر سکون ہی سے گھبرانے کی مثال انسانوں کے مختلف رویوں سے کس قدر آشکار ہوتی ہے اس کے ذہن میں کئی ایسی مثالیں عود کر گئیں۔ کون ہے جو سکون کا طلب گار نہیں لیکن اس کے باوجود کتنے لوگ ایسے ہیں

جو حقیقتاً پر سکون بھی ہیں۔ ہر آدمی مضطرب، بے چین اور بے صبرا ہو رہا ہے۔ بل جمع کرواتے وقت، سڑک پر چلتے ہوئے، ڈاکٹر کے پاس اپنی باری کا انتظار کرتے۔۔۔ وہ دن میں کتنی ہی بار تو اضطراب، ہیجان اور جلد بازی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ سکون کا طلب گار ہو کر بھی وہ سکون سے ہی گھبراتا بھی ہے۔

بجلی چلی جائے تو فضا میں ایک سکون اور ٹھہراؤ سا آجاتا ہے لیکن وہ گھبرا کر اسے سناٹا سمجھتے ہوئے کتنی بے زاری کا اظہار کرتا ہے۔ جب مراقبہ کرنے کے لئے بیٹھتا ہے تو کچھ ہی دیر میں اپنے اندر پھیلتے سکون سے بچنے کو کیا وہ آنکھیں کھول کر باہر کی دنیا کو اپنی نگاہوں کی کمند سے جکڑ لینے کو بے تاب نہیں ہو جاتا۔ اس کو اپنے مرشد کریم کی کہی ہوئی یہ بات اچانک ہی سمجھ آنا شروع ہو گئی کہ انسان محدودیت کا شاکی ہونے کے باوجود بھی اس محدودیت سے نکلنا ہی نہیں چاہتا۔

سکون کے طلب گار شہر میں سب سے زیادہ بے سکون، پُر ہنگام اور پُر شور مقام ہی کی سب سے زیادہ قیمت لگاتے ہیں۔ بڑھ چڑھ کر اس کے دام لگاتے ہیں اور اس کو انتہائی بارونق مقام ہونے کے اعزاز سے مشرف کرتے ہیں۔ کہیں سکون اور آرام اُن کی زندگی میں در آئے تو گھبرا اُٹھتے ہیں۔ اُف کیسا سناٹا ہے؟ یہ کیا بور زندگی ہے۔ یہاں تو عجیب ویرانی ہے۔ رونق اور چہل پہل ہونا چاہیے۔۔۔ جیسے جملے اس کی یادداشت میں کچھ زیادہ پرانے نہیں ہوئے تھے۔

یہی حال انسان کا آزاد رہنے کی خواہش کا ہے۔ وہ اپنے ارد گرد چار دیواریں ایستادہ کر کے ان میں داخلے کو ایک دروازہ بھی رکھ لیتا ہے۔ اس چار دیواری میں داخل ہو کر دروازے کو اندر سے بند کر کے، اس کو کنڈی لگا کر، سمجھتا ہے کہ محفوظ ہو گیا ہے۔ اب وہ آزادی سے ہمکنار ہو گیا ہے۔ اس آزادی کی یقین دہانی کو اس بند کمرے میں بے لباس ہو کر

آزماتا ہے۔ اگر کہیں ایسے میں اسے یہ معلوم ہو جائے کہ دروازے کی چٹخنی کسی نے باہر سے لگا دی ہے تو وہ رو دیتا ہے ۔ ہائے مجھے بند کر دیا۔ میں قید کر دیا گیا ہوں۔

بہت خوب چٹخنی اندر سے لگے تو آزادی، باہر سے لگے تو قید۔ واہ کیا اقدار ہیں۔ کیا معیار ہے آزادی اور سکون کا۔ خیال کا کوڑا لہرایا۔ خیال کے اس کوڑے کی مار نے شعور کو جھنجھوڑا۔ خود فریبی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گیا کہا ایک طرف تو اس بات کی تشہیر پہ لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کئے جا رہے ہیں کہ کینسر اور ایڈز لا علاج امراض ہیں۔۔ ان سے بچو۔ جبکہ دوسری طرف انہی بیماریوں کے علاج کو مہنگا اور مہنگا تر کیا جا رہا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ جب ایک مرض کو لا علاج ہی قرار دے دیا گیا ہے تو اُس کے علاج کے لئے ہزاروں کی قیمت کے انجکشن تجویز کرنے کا کیا مفہوم ہوا؟ مرے کو ماریں شاہ مدار۔۔۔۔؟

ان بیماریوں کے سدِ باب کے نام پر فنڈز اکٹھا کرنے کی مہمیں چلائی جا رہی ہیں۔ واک کا اہتمام ہوتا ہے۔ جغادری پیشہ ور مقرر تقریریں فرما کر مخیر حضرات کا جی گرماتے اور جیبیں خالی کروانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ موت کے شکنجوں اور خون آشام جبڑوں کا تذکرہ کر کے عوام کے دل دہلائے جاتے ہیں۔ موت کا خوف آسیب بنا کر لوگوں کے اعصاب میں پیوست کیا جاتا ہے لیکن وہ جو ہاتھ میں موت کا آلہ لئے سڑکوں پر دن دھاڑے سب کے سامنے لوگوں کے سینوں میں گولیاں اُتار دیتے ہیں ان کے خلاف کچھ کہنا بھی جرم قرار دیا جاتا ہے۔ وہ جس کے ہاتھ میں اسلحہ ہو کیا وہ موت نہیں بانٹ رہا؟ کیا وہ کسی کینسر یا ایڈز سے کم خطرناک ہے؟ آج تک کتنے لوگوں نے اسلحہ سازی کے خلاف کسی واک کا اہتمام کیا؟

اُس کے ایک دوست نے تبصرہ کیا تھا۔ جس صورت حال کی طرف اُس نے اشارہ کیا تھا وہ اپنی لطافت اور مضحکہ خیزی کے باوجود اس کو بُری ہی لگی تھی۔ اُس نے تبصرہ کیا کہ ہم جنت میں جانا تو چاہتے ہیں لیکن مرنا نہیں چاہتے۔ ہمارا مذہب موت کے خوف سے نجات پا لینے کا پرچار کرتا ہے اور دوسری طرف ہمارا یہ حال ہے کہ ہم موت کے خوف سے ہی مرے جا رہے ہیں۔ کینسر اور دیگر موذی امراض سے بچنے کے مواقع تو شاید مل بھی جاتے ہوں لیکن جدید قسم کے اسلحہ اور گولہ بارود سے پناہ کہاں؟

ہم ایک طرف تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس حدیث کی تکرار کرتے ہیں۔ ''مر جاؤ مرنے سے پہلے'' اور دوسری طرف موت سے خوف زدہ اور سہم کا یہ عالم کہ روزانہ کئی افراد اسی خوف سے جی ہار رہے ہیں۔ سوچ میں الجھن اور پیچیدگی بڑھ کر تضاد کا روپ دھار لیتی ہے۔ جو بیک وقت دو سمتوں میں سفر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اُن کو کسی نے کامیاب ہوتے نہیں دیکھا تو پھر بھلا ہمارے کامیابی کا کتنا امکان رہ جاتا ہے۔

اکثر اخبارات میں جرائم کی خبروں کی بھرمار کچھ اس طرح کی جا رہی ہے جیسے پوری قوم ہی چوری، ڈاکے، قتل و غارت گری اور لوٹ مار میں مصروف ہو۔ اغوا، قتل، ڈکیتی اور دہشت گردی کی خبریں شہ سرخیوں میں مقام پا رہی ہیں۔ کسی بھی نیکی اور خیر کے اچھے کام کو اول تو کوئی خبر ہی نہیں مانتا اور اگر مان بھی لیں تو ایک کالمی خبر سے زیادہ جگہ دینا مناسب نہیں سمجھا جاتا۔

اُس نے اس سوچ کا جائزہ لینے کو ایک بار حساب لگانا شروع کیا۔ ایک دن کے اخبار میں کل پندرہ بیس جرائم رپورٹ کئے گئے تھے۔ مزید اتنے ہی یا اُس سے دوگنا۔۔۔ ایسے کیس مزید بھی شامل کر لیں جو رپورٹ ہونے سے رہ گئے ہیں تو یہ کل پچاس ساٹھ جرائم ہوئے۔ اب اگر ایک شہر کی آبادی بیس پچیس لاکھ افراد پر ہی مشتمل ہو تو یہ فیصد

تناسب کے حوالے سے کتنے فیصدی ہوا؟ اب اتنی کمزور سی اقلیت، معمولی سی تعداد کی یہ اہمیت کہ پورا اخبار ہی اس کے نا ممختص ہو لیکن وہ جو باقی اکثریت نے راست روی اور اعلیٰ قدروں پر عمل درآمد کا اظہار کیا اس کا کوئی تذکرہ ہی نہیں۔ یہ تو نری دھاندلی ہوئی۔ اتنی کم تعداد کو اہمیت دیئے جانے کا ایک نتیجہ یہ بھی نکل رہا ہے کہ اس سے برائی کی مقدار اور اس کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور اکثریت کو نظر انداز کرنے کا یہ انجام سامنے آرہا ہے کہ وہ اپنے آپ میں ہی گھری، سمٹ کر بے وقعت اور بے وزن ہو گئی ہے۔ اتنی بے وقعت کہ چار آدمی ہتھوڑے لے کر پوری قوم کو شبِ بیدار بنا دیتے ہیں۔

ایک طرف دن رات جمہوریت کا پرچار اور دوسری طرف میں نہ مانوں۔۔۔ سب کو میری ہی ماننی چاہیے کا

نعرہ۔ طاقتور اقلیت کمزور اکثریت کو جدھر چاہتی ہے ہانک رہی ہے۔ ہر فرد ڈرا ہوا، سہما ہوا اس ہی لئے تو ہے کہ اس کے اندر یقین کا پیٹرن ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ روشنی کی وہ لہریں جن پر اُس کا وجود، اس کی ذات اور اس کی شخصیت قائم ہے یقین کی روشنیوں سے محروم ہو کر کمزور تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اس کے اندر کے اندھیرے بڑھتے اور پھیلتے اتنے طاقتور اور مہیب ہو گئے ہیں کہ ہر سورج انہی تاریکیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ ہم ان روشن ظلمات کا شکار ہیں جہاں ہزاروں واٹ کے طاقتور قمقمے تو روشن ہین لیکن ان قمقموں کے تباہ کن اثرات ہمارے جسم و جان میں کیا کیا خرابیاں پیدا کر رہے ہیں؟۔۔اس بات سے ہم اب اتنے بے خبر بھی نہیں رہے ہیں۔

اب یہ بات کوئی راز نہیں کہ تاروں میں موجود بجلی، انسان میں کیسے کیسے موذی امراض کو جنم دیتی ہے۔ ہم ہمہ وقت جس الیکٹرک فیلڈ میں گھرے رہتے ہیں وہ ہمارے اعصابی نظام کو اس قدر مفلوج اور ناکارہ بنا رہا ہے کہ آج شاید ہی کوئی شخص خود کو مکمل طور پر صحت مند کہہ سکتا ہو۔ لیکن اس کے باوجود ہم اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کی

بجائے مزید گہرائی میں ہی دھنسے جا رہے ہیں۔ ریڈیائی لہروں کی تباہ کاریوں سے بچنے کی بجائے اب ہم اپنا باقی ماندہ وقت بھی ٹی وی اور کمپیوٹر اسکرین کے سامنے بیٹھ کر گزارنا اپنے وقت کا واحد مصروف بناتے چلے جا رہے ہیں۔ اور کوئی تھوڑی بہت کسر رہ جاتی ہے وہ ٹیلی اور موبائل فون پر گپ شپ سے پوری کر لیتے ہیں۔

ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ ایک بچہ میٹرک کرنے کے لئے کم از کم آٹھ مختلف مضامین پڑھتا ہے اور جوں جوں آگے بڑھتا ہے اِن مضامین کی تعداد کم ہوتے ہوتے۔۔۔ایم اے میں صرف ایک واحد مضمون رہ جاتا ہے اور پھر پی ایچ ڈی کے لئے ۔۔ایک واحد مضمون کے کسی ایک باب کا محض ایک موضوع پڑھا جاتا ہے۔ اب یہ سمجھ نہیں آتا کہ علم بڑھ گیا یا محدود ہو گیا؟ اگر علم سمٹ کر ایک موضوع کا احاطہ کر لے تو ایک پی ایچ ڈی کی گردن میں جتنی نخوت بھر جاتی ہے، اُس کو اُس کے حاصل کردہ علم سے کیا نسبت ہوتی ہے؟ وہ سوچوں میں کھوتا چلا گیا۔

ہمارے ہاں کچھ یوں کر دیا گیا ہے کہ علم جتنا محدود ہوتا چلا جاتا ہے اس کی توقیر میں اتنا ہی اضافہ کر دیا جاتا ہے کہ مزید لوگ بھی اسی محدودیت کی طرف راغب ہوتے چلے جائیں جو اُن کا مقدر بن چکی ہے۔ ہم روزانہ سینکڑوں ہزاروں افراد کو مرتے، مٹی میں ملتے اور خاک ہونے کے شاہد ہونے کے باوجود اس مٹی کے پتلے کی ٹہل سیوا میں ہی لگے رہتے ہیں۔ یہ خیال آ بھی جائے کہ اس مٹی کے پتلے میں حرکت ہونا اس کے چھوٹے سے وجود سے بڑھ کر چھ فٹ کا قد آور انسان بننے میں مٹی کا یہ وجود محض ایک میڈیم ہے تو بھی ہم اس خیال کو درخور اعتنا نہیں گردانتے اور اس خیال پر اپنی توجہ مرکوز ہی نہیں ہونے دیتے۔

اس خیال کی کاٹ نے اس کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے اپنی سوچوں میں پڑتی دراڑوں سے نظریں چراتے ہوئے سوچا۔ اس صورت حال میں، میں کیا بھلا کر سکتا ہوں؟ یہ جو کچھ ہے اس کو بدلنے پر تو میں قادر نہیں۔ تو کیا جو کچھ ہے، اسی کو مان کر، اسی پر صبر کرتے ہوئے، قانع ہو کر، زندگی بسر کرتا رہوں؟ اس نے تھکے ہوئے انداز میں بے بسی سوچا۔

آج اس کے اندر سے جواب اُبھرنے میں کوئی دیر نہیں لگی۔ اس کے شعور میں ایک من موہنی سی صورت اُبھری۔ اس نورانی سے پیکر کے چہرے پر ایک منور سی مسکراہٹ نے اس کے اندر اُجالا سا بکھیر دیا۔ اس اجالے نے اس کو ایک ایسی بالیدگی سے روشناس کر دیا کہ اس کو خیال کی ان لہروں کو الفاظ کے قالب میں ڈھال کر اپنے حافظے میں سمیٹ لینے میں کوئی دقت نہیں ہوئی جو اس کے اندر لہراتی اس کے مرشد کی صورت سے نشر ہو رہی تھیں۔ اس نے جانا وہ کہہ رہے ہیں۔ آپ خود کو ہی سنبھال لیں۔ دین میں کسی کے لئے اکراہ نہیں۔ کسی پہ جبر کا کوئی اختیار نہیں دیا گیا۔ آپ صرف خود پہ قابو پا لیں۔۔ خود کو سنوار لیں گے تو کم از کم ایک فرد تو پار لگ ہی جائے گا نا۔ اس نے من ہی من میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے ذہن اپنی سوچوں اور اپنی طرز فکر کے سدھار میں جُت جائے گا۔ اس میں وہ کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں ہونے دے گا۔

بات سمجھ میں آگئی تھی۔ سمجھ میں آنے کے بعد یہ بات ایک روشنی بن کر اس کے اندر پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ کسی نے اس کے اندر ایک نغمہ گھول دیا ہو۔ اس نغمے کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ فقیر کسی کو درست نہیں کرتا۔۔ وہ تو اپنے ہی برتن کو صاف کرنے میں لگا رہتا ہے۔ پھر لوگ اس کے صاف شفاف برتن کو دیکھ کر اپنے اپنے برتن صاف کرنے لگ جاتے اور یوں اعلیٰ ظرفی رواج پاتی چلی جاتی ہے۔

دیئے سے دیا جلتا ہے۔ اجتماعی طرز فکر کو درست کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ انفرادی طرزِ فکر کو درست کیا جائے۔ اجتماعی طرز کی خامیوں کو روشن طرزِ فکر کے افراد ہی دور کیا کرتے ہیں اور جس روز بھی اجتماعی طرز فکر روشن ضمیر لوگوں کے رنگ میں رنگی گئی تو وہ دن ہوگا۔۔۔ جس کو سویرا کہیں گے۔

السلام علیکم

توجہ بھی کیا چیز ہے۔ آنے پر آئے تو تاریکیوں میں روشنی دیکھ لے۔ دھندلی حقیقتوں کو واشگاف کر کے رکھ دے، پتھروں میں جلوۂ خداوندی دکھادے۔ نہ ہو تو ہر وقت سامنے رہنے والی ہوا بھی نہ دیکھنے دے۔ اپنے تن پر سجے لباس تک کا ادراک نہ ہونے دے۔ اپنے اندر بسی دنیا ہی کی موجودگی کا شعور نہ ہونے دے۔

جب حضرت ابراہیمؑ کی توجہ اپنے رب، اپنے پروردگار اور اپنے خالق اور مالک ذات کی تلاش میں سرگرداں ہوئی تو حقیقت ازلی نے خود کو ستارے کی صورت منوانے کی کوشش کی لیکن ذوق آگہی کی اس پر تسکین نہ ہوئی تو وہ بڑھ کر دوچند ہوگئی۔ جب اس پر بھی انہیں اطمینان نہ ہو سکا، تو اُس نے شمس کی تابندگی کا روپ دھار لیا۔ لیکن ذوق حقیقت نے جب اُس کا بھی استقبال نہ کیا تو حقیقت منتظر کو لباسِ مجاز سے باہر آنا ہی پڑا اور حضرت ابراہیمؑ کی توجہ نے ہمہ وقت پیشِ نظر رہنے والی سچائی کو بھانپ ہی لیا اور اپنا رخ زمین اور آسمان پیدا کرنے والی ذاتِ واحد اور احد کی طرف کر لیا۔

یہی توجہ جب نہ ہونے پر اتر آئی تو بتوں کے ٹوٹے ہاتھ پاؤں اور کٹے سروں کو دیکھنے کے باوجود یہ سمجھنے پر راضی نہ ہوئی کہ یہ بے جان بت جو خود اپنی حفاظت اور دیکھ بھال کی قدرت نہیں رکھتے، کسی کے خدا ہونے کے کیونکر اہل ہو سکتے ہیں۔ جن ہاتھوں نے انہیں تراشا تھا بے شک وہی ہاتھ انہیں توڑنے اور مٹا دینے کی قدرت بھی رکھتے تھے۔

لیکن اب یہ توجہ ہی تو تھی جو اس طرف آ ہی نہیں رہی تھی کہ خود ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو سکنے والی شے بھلا ان کی زندگیوں میں کوئی تعمیری کردار کیونکر ادا کر سکتی ہے۔ جو خود دفنا کی زد میں ہو، وہ ان کی بقا کا کوئی بندوبست کرنے کے بھلا کہاں قادر ہو سکتی ہے۔

کسی بھی شے کی موجودگی کا ادراک تب ہی ہوتا ہے جب توجہ اُس کی طرف مبذول ہو جائے ورنہ ایک شے وجود رکھنے کے باوجود۔۔۔ موجود معلوم نہیں ہوتی۔ یہ بات الوہی حقیقتوں سے لے کر عام مادی اشیاء تک۔۔۔ سب کے لئے یکساں طور پر لاگو ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ آپ جس کرسی پر بیٹھتے ہیں۔۔ وہ ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں لگتی۔۔۔ پیروں میں پہنی جوتی بھی ہماری توجہ میں صرف اُسی وقت داخل ہوتی ہے جب کسی بھی سبب ۔۔۔ ہم اس کی طرف متوجہ ہو جائیں یا کر دیئے جائیں۔

وہ یہی باتیں سوچ رہا تھا کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا ''السلام علیکم'' آنے والے نے اپنی آمد کا اعلان کیا تو وہ اپنے خیالوں سے باہر نکل آیا اور ''وعلیکم السلام'' کہتے ہوئے اس نے آنے والے کی طرف متوجہ ہونے کی کوشش کی۔۔ ''آئیں بیٹھیں'' یہکہہ کر مہمان کے بیٹھنے تک وہ یہ اندازہ کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ یہ صاحب کس غرض اور مدعا کے ساتھ اُس کے پاس آئے ہیں۔ مہمان ایک ادھیڑ عمر، مخروطی چہرے پر عینک لگائے، صاف ستھرے لباس میں ملبوس تھا۔ وہ اُن کو پہلے سے نہیں جانتا تھا۔ لیکن اُن کے چہرے پر نرمی اور ملاحت سی دیکھ کر اس کو اجنبیت کا تاثر کچھ کم پڑتا محسوس ہوا اور وہ تناؤ سے باہر آتے ہوئے ڈھیلا سا پڑ گیا۔

اپنے تعارف کے ساتھ ساتھ انہوں نے چند ایک معروف لوگوں کے حوالے دینے کے بعد اپنا مدعا بیان کیا۔ اُن کا مطمحِ نظر اُس سے کسی غیر قانونی کام میں مدد لینا تھا۔ وہ اُن کے مقصد کو سمجھ گیا تھا لیکن وہ کام اس کے مطابق

کرنے کا نہیں تھا۔ اس نے پہلے اخلاق اور نرمی سے انکار کیا لیکن جب وہ صاحب اپنی بات کی تکرار پر مصر ہو گئے۔ اب ان کا اصرار بڑھنا شروع ہوا۔ اپنے اصرار کے حق میں دلائل دینے لگے۔ اس کا انکار اور اپنے انکار کے حق میں دلائل دیتا رہا۔ ان کا اصرار اور اس کا انکار چلتے رہے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کی اس لے دے کے دوران بات کئی بار تلخی تک بڑھ گئی۔ پھر وہ اُس کو دھمکانے پر اُتر آئے۔ اِس پر وہ بھیڈ ٹ گیا۔ بالآخر اُس نے اُن کی بات پر غور کرنے کی حامی بھر کر جان چھڑائی اور وہ اُسے خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد وہ دیر تک خود سے الجھتا رہا۔

وہ ان کے کام آنے سے عاجز تھا تو یہ بات انہیں سمجھ کیوں نہیں آ رہی تھی۔ انہوں نے بلا وجہ ہی اتنا اصرار کیا۔ جب اُس نے انہیں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یہ کام کرنے میں اُس کو خطرہ محسوس ہوتا ہے تو انہوں نے اُس کی سلامتی کو کیوں مقدم نہیں جانا؟ میری سلامتی کی انہیں کیا پڑی تھی وہ تو اپنے لالچ میں اندھے ہو رہے تھے۔۔ وہ اسی الجھن میں گرفتار کوفت کا شکار ہوتا رہا۔

شام کو جب گھر لوٹا۔ اس کے گھر داخل ہونے پر اس کے بیوی بچوں نے اُس کو ''السلام علیکم'' کہہ کر اس کا خیر مقدم کیا تو اس نے سوچا یہ سب تو میری سلامتی کے خواہاں ہیں اور ایک وہ صاحب تھے کہ آتے ہوئے تو میری سلامتی کے خواہاں ہونے کا اعلان فرما رہے تھے اور جاتے ہوئے مجھے خدا کی حفاظت کا مژدہ بھی سنا رہے تھے۔ لیکن جس اصرار سے وہ میرا بیڑہ غرق کرنے کی کوشش اور ضد کر رہے تھے اس کو کیا کہا جا سکتا ہے۔

اُس کو اپنی الجھن یاد آ گئی اور وہ ایک اور ہی بات سوچنے لگا۔ ہم سب ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں۔ بچے صبح سو کر اُٹھتے ہیں تو سب سے پہلے اپنے والدین کو سلام کرتے ہیں۔ ہم گھر سے جاتے ہیں تو سلام کرتے ہیں۔ گھر آتے

ہیں تو سلام کرتے ہیں۔ کسی سے ملتے ہیں تو سلام کرتے ہیں۔ لیکن کیا ہمارے ذہنوں میں واقعتاً ایک دوسرے کی سلامتی کا خیال ہوتا ہے؟ کیا واقعی ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کی سلامتی اور خیریت کی خواہش موجزن ہوتی ہے؟

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تو یہ سب اس لئے آغاز کروایا تھا کہ اگر افراد ایک دوسرے کی سلامتی اور خیریت کے لئے دعا کریں گے تو خود ان کی اپنی سلامتی اور خیریت یقینی ہو جائے گی۔ اس نے خود اپنا جائزہ لیا۔ اُس نے نوٹ کیا کہ کسی کو سلام کرتے ہوئے شاذ و نادر ہی اُس کا دھیان اپنے مخاطب کی سلامتی کے جذبے سے معمور ہو کر اُس کی طرف مبذول ہوتا ہے۔ اگر دھیان سلام کرنے کے مفہوم کی طرف کبھی مبذول ہو بھی جاتا ہے تو بات الفاظ کے معنی کی سطح تک ہی رہتی ہے۔ وہ خود اپنے اس خیال پر مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔

دوسروں کی سلامتی اور خیر و عافیت کی خواہش ایک آرزو بن جائے، ایک تمنا اور دعا بن کر اُبھرے تو اس کا اثر بھی ہوگا ورنہ تو وہ محض ایک صوتِ حیوانی ہے جس سے ہم ایک دوسرے کو اپنی موجودگی اور دوسرے کی موجودگی سے باخبر ہونے کی اطلاع نشر کرتے ہیں۔ جب آپ تہہ دل سے دوسروں کی سلامتی کے آرزومند ہو جائیں گے تو لامحالہ وہ سب بھی آپ کی سلامتی اور خیریت کے لئے دُعا گو ہوں گے اور جب لوگ ایک دوسرے کی سلامتی اور خیریت کی دُعائیں کرنے والے ہوں تو اللہ تعالیٰ اُس سلامتی اور خیریت کو یقینی کیوں نہیں بنائے گا جس کے لئے سب ہی دلی خواہش اور آرزو رکھتے ہوں گے؟

انہی سوچوں میں کھویا ہوا جب وہ نماز کے لئے کھڑا ہوا اور ادائیگی نماز کے بعد اس نے سلام پھیرا تو اس کو اور بھی حیرت ہوئی سلامتی کی دُعا پر نماز کا اختتام ہونا۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ”سبحان اللہ“ واہ کوئی مخاطب نہ ہو تب بھی آپ دوسروں کی سلامتی اور عافیت کے لئے دعا گو ہوں۔ نماز میں اللہ تعالیٰ سے ربط ہونا اور جونہی آپ اِدھر

نماز سے فارغ ہوں تو واپس شعوری حالت میں انے پر اپنے دائیں بائیں موجود یا نا موجود لوگوں کی سلامتی کی خواہش کرنا۔ یقیناً یہ پورا نظام انسانیت کی بہتری اور بہبود کا نظام ہے۔

نماز کے بعد وہ وہیں بیٹھا سوچتا ہی رہا۔ سلامتی کے اس نظام کی بابت جو نبی کریم ﷺ نے دین اسلام کے نام سے قائم فرمایا۔ اسلام کا لفظ بھی تو سلامتی اور عافیت ہی کی نشاندہی کرتا ہے۔ جب سے وہ اپنے مرشد کریم سے مل کر آیا تھا اکثر یہی ہوتا تھا کہ کوئی چھوٹی سی بات اس کی توجہ کا مرکز اور محور بن جاتی۔ وہ اس بات پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا اور اس کے اندر احساس اور خیال کا ایک فوارہ پھوٹ پڑتا۔ کہاں کہاں کی باتیں اس کے شعور کی سطح پر اُبھرتیں اور اُس کے حواس میں ایک جلترنگ سا بجتا رہتا۔ اس فوارے سے امڈتے بکھرتے قطرے اُس کے وجود پر پھوار کی طرح گرتے اور اُس کی رگ رگ میں سرور کی لہریں بکھرتی چلی جاتیں اور وہ اس سرورِ لذتِ آگہی کی لہروں پر تیرتا علم کے کسی جزیرے پر جا اترتا۔ وہ اپنی سوچوں کے ہلکورے لیتا، خیالوں کے دھارے میں بہتا چلا جا رہا تھا کہ ایک سوال کے تیز نشتر نے اس کے شعور کو ایک کچوکا دیا۔

جب یہ اتنا شاندار نظام موجود ہے تو ہم سب اتنے ٹوٹے ہوئے، اتنے ناآسودہ اور اتنے بکھرے ہوئے کیوں ہیں؟ ہم سلامتی کے نظام کے امین ہونے کے باوجود سلامتی سے کیوں دور ہیں؟ یہ تو کچھ ایسی بات ہے جیسے کوئی آدمی کپڑے لئے کھڑا ہوا، انہیں پہنے نہ اور پھر خود ہی حیران ہوتا رہے کہ میں بے لباس کیوں ہوں؟ مجھے سردی کیوں لگ رہی ہے؟ اس مثال کے ساتھ اس کے اندر ایک خیال لہراتا ہوا اُبھرا تو پھر ہم اس سلامتی کے نظام میں داخل کیوں نہیں ہو جاتے؟

سوچ کے بنتے بگڑتے دائروں کی تان ایک منطقی سوال پر آکر ٹوٹ گئی اور اس نے بہت سنجیدگی سے اس کیوں کا جواب تلاش کرنا چاہا۔ رات سونے سے پیشتر وہ مراقبہ کرنے بیٹھا تو مراقبے کے دوران بھی اس نے خود کو اسی سوال کے جواب کی تلاش میں سرگرداں پایا۔ اس کے ذہن میں بہت سے جواب آتے رہے۔ لیکن کوئی ایسی بات جو اس کے اندر اترتی چلی جائے، وہ حاصل نہیں ہو پا رہی تھی۔ جب شعور نے کوشش کو لاحاصل جانا تو اُس نے اس گتھی کو لاشعور کے حوالے کرتے ہوئے اپنی توجہ اُدھر سے ہٹالی اور سونے چلا گیا۔

صبح بیدار ہوا تو رات دیکھے ہوئے خواب کا عکس حافظے میں لہرایا۔ اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ قرآن مجید کھولے بیٹھا ہے اور ہر سطر پر انگلی پھیرتے ہوئے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ رہا ہے یعنی وہاں بجائے آیات کے صرف تسمیہ لکھی دیکھ رہا ہے اور وہی پڑھ رہا ہے۔ اُس نے سوچا کہ اِس خواب کی تعبیر وہ اپنے مرشد کریم سے دریافت کرنے کو یہ خواب انہیں لکھ بھیجے گا۔ اُسے یہ سوچ کر اچنبھا سا ہو رہا تھا کہ قرآن حکیم کے خواب میں دیکھے گئے نسخے میں ایات کی جگہ صرف تسمیہ ہونے کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے؟ پھر اس کے ذہن میں تسمیہ کا ترجمہ آیا۔ ''میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔'' وہ ذہن میں اس ترجمے کو دہراتا رہا کہ اچانک کتاب ''لوح و قلم'' میں پڑھا ہوا ایک جملہ اس کے حافظے میں عود کر آیا۔

بسم اللہ شریف کی باطنی تفسیر کے ضمن میں حضور قلندر بابا اولیاؒ نے انبیاء کی طرزِ فکر کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ انہیں کسی چیز کی طرف توجہ دینے سے پیشتر یہ احساس عادتاً ہوتا تھا کہ یہ چیز ہم سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ اس چیز کا اور ہمارا واسطہ محض اللہ تعالیٰ کی وجہ سے ہے۔ یعنی جب وہ کسی چیز کے متعلق سوچتے تو اس چیز کے اور اپنے درمیان کوئی رشتہ براہ راست قائم نہیں کرتے تھے ان کی طرز فکر ہمیشہ یہی ہوتی تھی کہ کائنات کی

تمام چیزوں کا اور ہمارا مالک اللہ تعالیٰ ہے اس لئے کسی بھی چیز کا رشتہ اُس سے اللہ تعالیٰ کی وجہ سے اور اُسی کی معرفت ہے۔اس بات کی روشنی میں تو تسمیہ کا ترجمہ ۔۔۔یوں شروع کرتا ہوں ۔۔۔۔درست نہ ہوا۔اس میں تو فاعلِ حقیقی اللہ تعالیٰ کو قرار دینے کے بجائے اشارہ خود اپنی ذات کی طرف نکل رہا ہے اور پھر عربی قواعد کی رُو سے بھی بسم اللہ کا مطلب ''اللہ کے نام پہ جو رحمن اور رحیم ہے'' ہی بنتا ہے۔ یہ ''میرا'' شروع کرنا ۔۔ کیا معنی رکھتا ہے؟ اس نے سوچا۔

دراصل ہماری تربیت میں یہ بات شامل ہے کہ جب بھی کوئی کام شروع کرو بسم اللہ پڑھنی چاہیے۔اس لئے ہم نے اس کو کسی کام کے آغاز کے ساتھ ساتھ خود اپنے ساتھ منسوب اور مختص کر کے اس وسیع تر مفہوم کو محدود کر لیا ہے ورنہ درحقیقت ہر سورت کے آغاز میں اس کا مفہوم تو یہ بنتا ہے کہ ہم انبیاء کی طرز فکر کو اپناتے ہوئے اس کلام سے مستفیض ہونا چاہتے ہیں۔

عام زندگی میں جب ہم یہ کہتے ہیں یہ گاڑی میری ہے۔۔۔ تو گویا ہم نے گاڑی کا مالک خود کو قرار دے دیا۔ اس کے ساتھ بعض اوقات ہم یہ بات ازراہ دکھاوا شامل کر لیتے ہیں کہ یہ گاڑی مجھے اللہ نے دی ہے۔ فکر نبوی کے تحت یہ جملہ شاید اس طرح ہو گا کہ ''اللہ تعالیٰ نے یہ گاڑی مجھے استعمال کرنے کو دی ہے۔'' یعنی ترتیب میں اللہ تعالیٰ کو اولیت دی جانی چاہیے۔یعنی گاڑی کی طرف متوجہ ہونے کے ساتھ ہی دھیان پہلے اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کی طرف جانا چاہیے۔ پھر گاڑی کا اور اس کے بعد اپنا تذکرہ ہونا چاہیے۔

ساری بات ہی ترتیب اور توازنکی ہے۔ ترتیب نہ ہونا بدصورتی اور ترتیب ہونا حسن اور خوبی۔ اگر افکار میں ترتیب پیدا ہو جائے تو فکر سج اور سنور جاتی ہے۔ یہ ترتیب بگڑ جائے تو سارا نظام ہی تلپٹ ہو کر رہ جاتا ہے۔ پیغمبرانہ

طرز فکر کے مطابق سب سے اولین ترجیح اللہ تعالیٰ مالک کائنات کو دی جانی چاہیے کیونکہ یہی حقیقت بھی ہے۔ اس کے بعد اُس کی خلق کردہ کائنات کو اور پھر نمبر آنا چاہیے بندے کا اپنا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب یہ ترتیب اُلٹ جاتی ہے تو آدمی بندہ بننے کی بجائے نمرود، شداد اور فرعون بن کر رب ہونے کا دعویدار ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے گمراہ لوگوں کو نشانِ عبرت بنانے پر پوری طرح قادر ہیں۔ اس کے اندر سوچ کی لہریں اُبھرتی چلی گئیں۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک کلکاری سی اُبھری۔۔۔ ''تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ بندہ بننے کے لئے وہ طرز فکر اپنانے کی ہدایت کی جارہی ہے جو کہ انبیاء کی طرزِ فکر ہوتی ہے۔ قرآن کی آیات کی جگہ تسمیہ کا نظر آنا اس کو نبی کریم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرزِ فکر کی طرف متوجہ کیا جانا ہوا۔'' ہونا تو چاہیے تھا کہ وہ اس بات پہ خوش ہوتا کہ اُس کو ایسا اچھا خواب دکھایا گیا لیکن نہ جانے کیوں اس کے اندر ایک تاسف اور اُداسی در آئی۔ شاید یہ احساس زیاں کے سبب تھا۔۔۔ بے شک اس کا بہت نقصان ہو چکا تھا۔ یہ سیدھی، سچی اور سامنے کی بات اس سے پیشتر اس کی فہم کی دسترس میں کیوں نہیں آئی۔ تو پھر اب اس کی تلافی کیسے کرے؟ اس نے سوچا کہ تلافی تو کرنے سے ہی ہو گی یعنی اب عمل پیرا ہوئے بغیر کام نہیں بن سکتا۔ فکر کو نشانِ منزل تو مل گیا۔ سمت کا تعین تو ہو گیا۔ اب قدم بڑھانے کی ضرورت تھی۔

اس روز جب وہ گھر سے نکلا تو خدا حافظ کہنے سے پیشتر اُس نے اس بات کو اپنے اندر شعوری طور پر اجاگر کرتے ہوئے سوچا کہ وہ اہلِ خانہ کو واقعی خدا کی حفاظت اور تحویل میں دے کر جارہا ہے۔ راستے میں جب کوئی شناسا ملا تو اس نے پہل کرتے ہوئے، اُس کو خلوص نیت سے دُعا دینے اور اس کی سلامتی اور خیر و عافیت کی خواہش کا اظہار کرنے کو السلامُ علیکم کہا۔ دفتر پہنچ کر جب اس نے اپنے دفتر والوں کو اپنے باس کو، اپنے رفقاء کو سلام کیا تو اُس نے ہر

بار یہ محسوس کرتے ہوئے سلام کیا کہ وہ اُن کی سلامتی کی دُعا کر رہا ہے۔ آج وہ محض رسماً سلام نہیں کر رہا تھا۔۔ وہ سچ مچ دُعا گو تھا۔ اس نے اپنے اندر عجیب سی طمانیت پھیلتے دیکھی۔ جب وہ سب کی سلامتی کا خواہشمند ہے تو وہ خود اُس سلامتی سے کیوں کر بچا رہ سکتا ہے؟

صراطِ مستقیم

اُس گھنے جنگل میں ہر طرف راستے بکھرے ہوئے تھے لیکن ہر راہ بے نشان ، ہر راستہ کسی نہ کسی منزل کی طرف ضرور جاتا ہو گا لیکن جس منزل کی اس کو تلاش تھی اس کا راستہ اس کو مل نہیں پا رہا تھا۔ کبھی وہ ایک طرف جاتا اور کبھی دوسری طرف اگر یہ جنگل نہ ہوتا ، یہ اونچے اونچے سر بلند درخت نہ ہوتے تو اس کو منظر واضح اور وسیع ملتا اور وہ افق تک دیکھنے کے قابل ہوتا تو اس کو نشانِ منزل متعین کر لینے میں کوئی دشواری نہ ہوتی۔ یہ رکاوٹیں نظر میں حائل نہ ہوتیں تو کوئی راہ گم ہی کیوں ہوتی۔ ان رکاوٹوں کے باوجود جو لوگ بے نشان راستوں پر درست سمت بڑھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں وہ خود کو منزل کا اہل بنا لیتے ہیں لیکن اس گھنے جنگل میں وہ اپنے لیے کوئی راہ متعین کر ہی نہیں پا رہا تھا۔ وہ کسی سیدھے راستے کا متمنی تھا۔ لیکن وہاں ہر راستہ بل کھاتا ، درختوں ، پودوں اور جھاڑیوں میں جا کر گم ہو رہا تھا۔

اسی تگ و دو میں اُس کو ایک گونجتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ اُس نے غور سے سننا شروع کیا۔ اُس کو وہ آواز ایک لے اور سُر میں ہر طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آواز ہر سمت اور ہر راہ سے اُس تک پہنچ رہی تھی ۔ وہ اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ آواز اصل میں کس جانب سے آ رہی ہے ؟ اُس کو معلوم ہوا کہ یہ آواز تو اذان کی صدا ہے۔ وہ اذان کی آواز کا سہارا لے کر اپنے لئے سمت کا تعین کرنے کی کوشش میں چکرا رہا تھا کہ اُس کا شعور نیند کی سرحدیں پھلانگ کر بیداری کی حدوں میں داخل ہو گیا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ موذن نماز فجر کے لئے مدعو کر رہا تھا۔ وہ بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ حواس پر بیداری کی گرفت مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے ذہن میں خواب کے

تا ثر اور واقعات کو دہرایا اور وضو کرنے اور پھر نماز پڑھنے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وضو کر کے نماز کے لئے جاتے ہوئے اس کے ذہن میں دیکھے گئے خواب کا عکس لہرایا۔

اُس نے سوچا اِس خواب کا مفہوم اور تعبیر بھلا کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن وہ کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ نماز کے دوران وہ اپنے مرشد کریم کی ہدایت کے مطابق تلاوت کی جانے والی آیات کے مفہوم کو ذہن میں دہراتا ہوا جب اھدنا الصراط المستقیم پر پہنچا تو اُس کو ایک جھٹکا سا لگا۔" ہدایت دے مجھے سیدھے راستے کی طرف "۔۔۔ نماز میں ہزاروں بار دہرائی جانے والی یہ آیت اُس کے خواب کی پکار ہی تو نہیں؟

اُس نے اس آیت کو کئی بار دہرایا۔ اُس کو ایک عجیب سی کیفیت کا احساس ہوا۔ آج سے پیشتر ہمیشہ وہ اس آیت کو یونہی رسماً منہ سے کہتا اور پڑھتا چلا آیا تھا لیکن آج اپنے خواب کی کیفیت کے حوالے سے اس کو یہ آیت حسبِ حال سی محسوس ہوئی۔ نماز مکمل کر کے بھی وہ اسی خیال میں ڈوبا رہا کہ یہ سیدھے راستے کی طلب پر نماز میں، قرآن کی تلاوت نماز میں اور پھر خواب میں گھنے جنگل میں کس طرح سے آپس میں ہم رشتہ ہو سکتی ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن حکیم کی اس سورہ کی تلاوت کو نماز کی ہر رکعت میں کیوں لازم قرار دیا ہے؟ اس میں آخر وہ کون سی حکمت ہے۔ جو آج سے پیشتر کبھی اُس کی توجہ کو اپنی طرف مبذول نہیں کر سکی۔ اس کے ذہن میں صراط المستقیم کی دعا کا اتنی بات تکرار کیا جانا اس کی اہمیت اور ضرورت کی دلیل بن کر ابھرا۔ اس نے حساب لگانا شروع کیا کہ ایک دن کی نماز پنجگانہ میں نوافل اور سنتغیر موکدہ سمیت کل کتنی رکعتیں پڑھی جاتی ہیں؟ اڑتالیس رکعتیں ہوں تو ایک سال میں پابندی سے نماز پڑھنے والا خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔۔اس دُعا کی 17520

مرتبہ ادائیگی کا پابند ہے۔ اگر کوئی چالیس سال تک پابندی سے نماز ادا کرتا ہے تو یہ تعداد سات لاکھ سے تجاوز کر جاتی ہے۔

اِس دُعا کی اہمیت کا اس سے بڑا اور ثبوت کیا ہوگا کہ انسان کو اپنی پوری زندگی اہتمام اور التزام سے اسدُعا کو ہر نماز کی ہر رکعت میں تلاوت کرنا، پڑھنا بلکہ مانگنا فرض کر دیا گیا ہے۔ اُس نے اس بات سے متاثر ہو کر سوچا کہ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر تو اس کے اصل مفہوم کی تلاش اور بھی ضروری ہو جاتی ہے کیونکہ اتنی بار مانگی جانے والی دُعا کی مقبولیت کے آثار اس کو اپنے ارد گرد کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ لاکھوں کروڑوں انسانوں میں سے جو نماز کی ادائیگی کا باقاعدگی سے اہتمام کرتے ہیں، کتنے لوگ ہیں جو اس اعزاز سے مشرف ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دُعا کو قبول فرماتے ہوئے انہیں سیدھے راستے کی ہدایت نصیب فرما دی ہو؟ اس قدر کثرت سے مانگی جانے والی دُعا قبولیت سے اس قدر تہی و عاری کیوں ہے؟ دکھ کی ایک لہر نے اس کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی بھلائی کے پیشِ نظر ہی تو اُن کو یہ دُعا خود تعلیم فرمائی ہے اور پھر خود ہی اُس کو قبول کرنے میں اتنا تغافل کیوں کر رہے ہیں کہ کہیں لاکھوں میں سے کسی ایک آدھ کا نصیب یاوری کرتا ہے اور اس کو صراط مستقیم پر چلنے اور قائم رہنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ وہ دن بھر اسی ادھیڑ بن میں رہا۔

ظہر کی نماز میں بھی جب جب اُس نے اھدنا الصراط المستقیم کے الفاظ زبان سے ادا کئے، اُس کے اوپر ایک لرزے کی کیفیت گزرتی رہی۔ اس نے نہایت سراسیمگی کے عالم میں سوچا کہ جب وہ حالت نماز میں یہ دُعا کر رہا ہے تو اِس کا ایک مطلب تو یہ بھی نکل رہا ہے کہ وہ سیدھے راستے پر نہیں ہے۔ تبھی تو وہ دُعا کر رہا ہے کہ مجھ کو سیدھے راستے کی ہدایت نصیب فرما۔ اِس خیال سے اُس پر بالکل وہی کیفیت طاری ہو گئی جس سے وہ اپنے خواب میں دوچار ہوا تھا۔

ایک راہ گم کردہ انسان کی کیفیت جب وہ صحیح راستے کی تلاش میں پریشان اور سر گرداں ہو اور راستہ وہیں کہیں موجود تو ہو لیکن مل نہ رہا ہو۔ اسپر گھبراہٹ اور وحشت سوار ہو گئی۔

نماز تو اس نے جوں توں کر کے مکمل کی لیکن وہیں بیٹھا سوچتا کہ اگر حالت نماز میں بھی وہ صراط مستقیم سے محروم ہے تو پھر بھلا اور کون سی صورت ہو گی جب وہ سیدھی راہ پر گامزن ہو سکے گا؟ یہ سوال ایک ایسا معمہ اور چیستان بن گیا کہ وہ اس کو جتنا سلجھانے کی کوشش کرتا وہ خود کو اتنا ہی بے بس اور لاچار محسوس کرتا۔

اُس نے سوچا کہ پل صراط بھی اسی صراط مستقیم کی ترکیب لفظی کی رعایت سے کچھ ایسی ہی بات ہو گی۔ تبھی تو اُس کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز ہو گا۔ گنہگار اور مجرم اس پر سے گزرتے ہوئے کٹ کٹ کر نیچے جہنم میں گریں گے۔ وہ مجرم اور گنہگار کون ہوں گے؟ ظاہر سی بات ہے جو صراط مستقیم سے بھٹکے ہوئے ہوں گے۔

سوچنے کو اس نے سوچ تو لیا لیکن خود ہی پشیمان سا ہو گیا۔ اُس کو صراط مستقیم کا پتہ تو چل نہیں رہا تو وہ ایک دلدل میں کہاں اتر رہا ہے جس میں سنبھلنے کا اُس کا یارا ہی نہیں رہا۔ اس کے بعد کئی روز تک اُس کی یہی کیفیت رہی۔۔اُس نے اپنے دوستوں سے مدد چاہی۔ جاننے والوں کے سامنے اس سوال کو رکھا کہ صراط مستقیم سے کیا مراد ہے اور اس کا اصل مفہوم کیا ہے؟ تقریباً سبھی نے یہ کہا کہ اس سے مراد وہ سیدھا راستہ ہے جو بندے کو اللہ سے ملا دے۔ جس پر چل کر بندہ اللہ تک پہنچ جائے۔ کچھ نے کہا کہ نیکی اور بھلائی کے راستے کو سیدھا راستہ کہتے ہیں۔ ایک دوست نے کہا اگلی آیات کو بھی تو پڑھو۔ اُن میں اس کی تشریح موجود ہے کہ ایسا راستہ جس پر چلنے والوں پر اللہ تعالیٰ اپنا انعام

فرماتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نہ تو ناراض ہو کر ان پر اپنا غضب نازل فرماتے ہیں اور نہ ہی وہ بھٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔

اس نے یہ سب باتیں سنیں ضرور لیکن ایک بھی اُس کے دل کو نہ لگی۔ وہ یہ سب کچھ تو بچپن سے سنتا آرہا تھا۔ وہ تو کچھ ایسی بات سننا چاہتا تھا جو عقل اور منطق کو پچھاڑتی ہوئی سیدھی اس کے دل میں اتر جائے۔ اس نے اس پر غور کیا کہ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے تو ایکیہ بات کھلی کہ صراط الذین کے الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ ''ان لوگوں کا راستہ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا۔'' یعنی یہ ایسا راستہ ہے جو انعام یافتہ لوگوں نے اپنایا۔

اس نے اپنی سوچ کے پھیلتے دائرے کو سمیٹنے کی بجائے اس کو کسی ساحلِ مراد تک پہنچنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا۔ یہ بات واقعی سوچنے کی تھی کہ انعام یافتہ لوگ کون ہو سکتے ہیں اور کوئی انسان اپنا شمار ان انعام یافتہ لوگوں میں کیونکر کروا سکتا ہے؟ اس نے سوچا کہ وہ لوگ جو نیکی اور بھلائی کے کام کرتے ہیں وہی تو انعام یافتہ ہوتے ہیں۔ اس میں تو زیادہ اشتباہ نہیں تھا۔ لیکن اس کا ذہن ساتھ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ نیکی اور بھلائی کچھ ایسی مبہم اصطلاحات ہیں جن کی تعریف مختلف لوگوں کے نزدیک مختلف ہیں۔ جب کہ حقیقت میں اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ حق بات تو سب کے نزدیک ایک ہی ہو گی دو چار دس بیس نہیں۔

ایک استاد کسی بچے کو اس کی تربیت کے خیال سے اگر ایک طمانچہ لگا دیتا ہے تو اپنی طرف سے تو اس نے نیکی اور بھلائی ہی کا کام کیا لیکن کیا بچہ اور اس کے ماں باپ اس استاد سے متفق ہوں گے؟ ہو سکتا ہے کہ چند ایک اسے جائز کہہ دیں لیکن اکثریت کی رائے اس عمل کو نیکی ماننے سے گریزاں ہی رہے گی۔ اس کے علاوہ انعام یافتہ کا تعین بھی کچھ کم دشوار نہیں اکثریت اسے مادی پیمانے سے ناپنے کے سبب امیر اور دولتمند صاحب ثروت اور ذی اقتدار لوگوں کو ہی

انعام یافتہ قرار دیتے ہوئے ان کی پیروی بلکہ نقالی میں مصروف ہے۔ جبکہ ایسے لوگوں کو جو مال و دولت اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ، اللہ تعالیٰ موجب سزا قرار دیتے ہوئے عذاب و تکلیف میں پکڑنے کا اعلان فرماتے ہیں۔

چند ایک کے نزدیک عزت و شہرت انعام ہیں اور اگر اُن کی اس بات کو اِس آیت کے حوالے سے مان لیا جائے تو اداکار اور کھلاڑی اِس میدان میں جتنا آگے ہوتے ہیں کیا ہمیں اُن کی تقلید اور پیروی کرنا چاہیے ؟ تو پھر یہ انعام کیا ہوا؟ علم و حکمت ، ذہانت و صلاحیتیں بلا شبہ بہ توفیق ایزدی حاصل ہوتے ہیں لیکن ان کو عطا کر کے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں۔ تو پھر یہ ضرور آخرت کی زندگی میں جنت جیسی نعمت کی بابت کہا جارہا ہوگا۔ لیکن یہ کیسے معلوم ہوگا کہ کن لوگوں کو واقعی اس انعام سے نوازا گیا اور کن لوگوں کو ریاکاری کے الزام میں اس سے محروم نہیں کیا گیا۔

اُس کے اندر جو ہلچل مچی ہوئی تھی اس نے اس کو بے قرار کیا ہوا تھا۔ یہ بات ایک پھانس بن کر۔۔۔اُس کے دل و دماغ میں چبھتی چلی جارہی تھی کہ ہر مسلمان پہ جس دُعا کا مانگنا فرض کیا گیا ہے اور جس کو مانگتے مانگتے لوگوں کی زندگیوں کا سورج غروب ہو جاتا ہے ، وہی دُعا بارگاہ خداوندی میں کیوں باریاب نہیں؟ کیوں ہم دعویٰ سے یہ اقرار نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری دُعا سن لی ہے اور ہمیں صراطِ مستقیم کی نعمت سے سرفراز کر دیا گیا ہے ؟

ایک روز وہ یونہی بے خیالی کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک ہی اس کیوں کا جواب اُس کی سمجھ میں ایک کوندے کی طرح لہرا گیا۔ جب مانگنے والے کو یہ علم ہی نہ ہو کہ وہ کیا مانگ رہا ہے تو دینے والے پر لازم نہیں رہتا کہ وہ اُس کو ضرور عطا کرے۔ اگر ایک بچہ اپنی ماں سے پستول مانگے تو ماں اپنے بچے سے کتنا ہی لاڈ کیوں نہ کرتی ہو ، اس کو پستول کبھی نہیں دے گی۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ بچے کو پستول کی تباہ کاریوں کا علم نہیں۔ لیکن جب وہی بچہ بڑا ہو کر

فوج میں چلا جاتا ہے تو پستول تو کیا اُس کو بندوق اور توپ تک دے دی جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی چھوٹا سا بچہ ماں سے یہ فرمائش کرے کہ میں دولہا بنوں گا تو ماں مسکرا تو دیتی ہے لیکن اس کی شادی کرنے نہیں بیٹھ جاتی۔ اسی طرح اگر کوئی صاحب جہاز اُڑانا چاہتے ہوں لیکن انہیں جہاز کی بابت کچھ معلوم نہ ہو تو ان کی خواہش کی تمام تر شدتوں کے باوجود انہیں کوئی بھی جہاز اُڑانے نہیں دے گا۔ بالکل اسی طرح صراطِ مستقیم کو جانے بوجھے بغیر اس کی کتنی ہی طلب کیوں نہ کریں اس طلب کا اظہار سات لاکھ بار نہیں بلکہ ستر لاکھ بار بھی کریں تو مالک ارض و سماء کسی بھی طور اس طلب کو پورا کرنے کا پابند نہیں۔

جب اس خیال نے اس کے شعور میں اپنی جگہ بنالی اور اس خیال کے نقوش اُس کے ذہن کی گرفت میں واضح طور پر آگئے تو اس کی جستجو اور تجسس فزوں تر ہو گئے کہ آخر وہ رب العالمین، الرحمٰن الرحیم ذات سے جس راستے کی ہدایت کا طالب ہے، اُس راستے کی منزل کیا ہے اور نشانِ منزل کیا ہے اور وہ راستہ بذاتہ ہے کیا؟ گہرائی میں سوچتے ہوئے اس کے اندر سے خیال کی ایک لہر ابھر کر ذہن کی سطح پر نمودار ہوئی اور پھیلتی چلی گئی۔ اس خیال نے اس کے اندر ایک اجالا سا پھیلا دیا۔ اس کو ایک مرتبہ اپنا خواب پھر سے یاد آگیا۔

خواب میں جنگل ہماری زندگی کا تمثل تو نہیں؟ زندگی میں بھی تو ہر طرف دشواریوں کے بلند اور پھیلے ہوئے درخت سد نظر بنے رہتے ہیں اور مجبوریوں اور پریشانیوں کی جھاڑیاں سدراہ بن کر نشانِ منزل کو چھپا لیتی ہیں۔ زندگی میں بھی ہر طرف جانے والے راستے، ہر سمت پھیلی ہوئی راہیں ہر لمحہ سامنے ہوتی ہیں مگر کوئی ایک ۔۔۔ صرف ایک راہ ایسی ہوتی ہے جس پر چلنے والا قوت و وقت کے زیاں سے بھی محفوظ رہتا ہے اور منزل کے انعام کا بھی حقدار بنتا ہے۔ اُسی ایک راستے کا انتخاب کر لینے کو اللہ تعالیٰ نے فوزالعظیم قرار دیا ہے۔ اُس راستے کا انتخاب اگر اختیاری ہوتا تو

اُس دعا کے الفاظ شاید کچھ یوں ہوتے کہ ہمیں سیدھے راستے کے انتخاب کی توفیق اور سمجھ عطا فرما۔ لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ اس راہ مستقیم کی ہدایت اللہ تعالیٰ سے طلب کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ہدایت وجدانی اور وہبی ہی ہو سکتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہدایت کو وصول کرنے کے لئے ایک ایسا ذہن تیار ہونا لازم ہے جو اس راہ مستقیم پر وجدانی طور پر قائم رہ سکتا ہو جس کا انجام ایک انعام بن کر نچھاور ہوتا ہے۔

سوچ کی اس منزل پر اس کی یہ الجھن تو رفع ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے اس دُعا کو اتنی کثیر تعداد میں تکرار کروانا کیوں طے کیا ہے؟ جب بات ذہن تیار کرنے کی آگئی تو لازم ہے کہ جن خطوط پر ذہن کو تیار کیا جاتا ہے ان کی تکرار اور اعادہ ہوتا رہے تاکہ ذہن بننے کے بعد بھی اسی راہ پر رہے جس راہ کی ہدایت اللہ کی طرف سے موصول ہوتی ہے۔ اُس کو اپنی اس الجھن کے رفع ہونے پر کچھ ایسا لطف آیا کہ وہ جھوم اُٹھا۔ اپنے مرشد کریم کا کہا ہوا ایک جملہ اس کے ذہن میں ابھر آیا انہوں نے فرمایا تھا کہ راہ سلوک پر چلنے والوں کو جب کوئی روحانی بات یا قانون معلوم ہو جائے تو انہیں چاہیے کہ وہ اس کی تکرار کرتے رہیں، اس بات کو ذہن میں دہراتے رہیں، اس کا تذکرہ اپنے دوستوں اور ملنے جلنے والوں سے کرتے رہنے سے وہ بات ذہن میں راسخ بھی ہو جاتی ہے اور اس کی گہرائی میں چھپے نکتے بھی واضح ہوتے رہتے ہیں۔

نماز کیہر رکعت میں سورہ فاتحہ جو کہ قرآن حکیم کا دیباچہ اور خلاصہ ہے، کہ تلاوت کے فرئضہ کی حکمت اس کو سمجھ آرہی تھی اور اس کو ایک احساس مسرت و تفاخر اپنے اندر ابھرتا محسوس ہو رہا تھا۔ اُس کو اس دُعا کی اہمیت کے واضح ہونے کے بعد یہ کھوج ہوئی کہ اس دُعا کا مفہوم دراصل کیا بنتا ہے۔ ''سیدھا راستہ'' کے الفاظ اپنی معنویت کے لحاظ سے جو گہرائی اور گہرائی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں ان کو عالمانہ انداز خطابت سے ہٹ کر عام فہم روز مرہ زندگی

کے حوالے سے کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کھوج میں وہ دل ہی دل میں ''اھدنا الصراط المستقیم'' کی آیت تلاوت کرتا رہتا، غور کرتا اور دھیان میں لاتا۔

ایک روز جب رات کو وہ سونے لیٹا تو اُس کے ذہن پر نیند غالب آرہی تھی کہ اس کے اندر ایک آواز ابھری ''سیدھی سوچ'' صرف یہی دو لفظ سنائی دیئے۔ اس کے نیم خوابیدہ ذہن نے ان الفاظ کی تکرار کی۔ یہ سیدھی سوچ کیا ہوئی؟ یہ سیدھی سوچ کیا ہوگی؟ اس کے شعور کو ایک جھٹکا سا لگا۔ یہ صراط مستقیم کا اصل مفہوم بھی تو ہو سکتا ہے۔ اس نے سوچا اور پوری طرح بیدار ہو کر سوچنے لگا کہ یہ بات درست ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایک ایسی سیدھی سوچ اور طرز فکر کی ہدایت دے رہے ہوں جس کو اپنانے والوں پر اللہ تعالیٰ کی شفقت اور رحمت انعام بن کر برسی ہے اس بات کو سوچتے سوچتے وہ ہنس پڑا۔ اتنی سیدھی صاف اور سامنے کی بات اس کو سمجھ نہیں آرہی تھی۔ یہ سارا معاملہ ہی طرز فکر کو سیدھا کرنے کا تھا۔

اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں پڑی یہ گرہ بھی کھلتی چلی گئی کہ جب بندے نے یہ اقرار کر لیا کہ میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں اور تجھ ہی سے مدد و استعانت کا طلبگار ہوں تو پھر وہ مزید اور کون سی راہ ہدایت کا طالب بن رہا ہے یعنی ایاک نعبد و ایاک نستعین کا مفہوم یہ ہوا کہ بندہ اللہ کی طرف سے عائد کردہ فرائض کی ادائیگی کو بخوشی تیار ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک ایسی طرزِ فکر کو حاصل کر لینا چاہتا ہے جس کو حاصل کر لینے والوں پر امن، سلامتی، سکون اور خوشی کے انعامات پھوار کی طرح برستے رہتے ہیں ایک ایک کر کے اس کی سوچ میں پڑی گرہیں اور الجھاوے دور ہوتے چلے گئے۔

جب گرہیں کھل رہی ہوں تو کسے ہوئے دھاگے خود بخود ڈھیلے پڑتے چلے جاتے ہیں۔ وہ دھاگے جو شخص اپنے تناؤ کے باعث بنے ہوئے ہوتے ہیں وہ بھی سنورتے اور سیدھے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی بات اس لمحے یہ ہوئی کہ اُس کی توجہ اس بات کی طرف مبذول ہو گئی کہ ''مستقیم 'لفظ' قیم'' کے مادے سے بنا ہے تو اس کا لغوی مفہوم سیدھے کی بجائے اگر قائم رہنے والا لیا جائے تو۔۔۔ یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ ایسی راہ جس پہ استقامت سے چلنے پر انسان حی و قیوم ذات تک پہنچ سکتا ہے۔ اسی طرح انعمت کا لفظ نعم سے مشتق ہے۔ اس کا مطلب بھی یہی ہوا کہ انسان جب قیوم کی راہ پر گامزن ہو اور اس کی نگاہ اس ذاتِ برحق سے براہ راست راہنمائی کو اسی پہ جمی ہوئی ہو تو اپنے ہر اٹھتے

قدم، اپنے ہر فیصلے پہ اللہ کو اپنے اس کام کی تائید کرتے محسوس کر سکتا ہے۔ اللہ کی تائید اور اثبات ہی انسان کو اس کے غضب سے بچا سکتا ہے۔ ورنہ انسان اپنی ہی کرتا رہے اور اس کو اس بات کی کوئی پرواہ ہی نہ ہو کہ اس کا مالک اس کا خالق رب اس کے کئے گئے کاموں کو سند پسندیدگی سے نواز بھی رہا ہے یا نہیں، تو لامحالہ وہ بالآخر اس کے غضب کو مدعو کر لیتا ہے۔

وہ دیر تک جاگتا رہا اور اپنی الجھن کے رفع ہونے کی خوشی کو محسوس کرتا رہا۔ مسرت و آگہی کی لہریں اس کو اپنے وجود میں پھیلتی محسوس ہوتی رہیں۔ اس شب اُس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک گھنے جنگل میں سے گزر رہا ہے۔ ہر طرف بلند اور تناور درخت اور گھنی جھاڑیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان بے شمار راہیں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے سر پر ایک روشن قمقمہ لگا ہوا ہے اور اس کی روشنی عام قمقموں کے برعکس بہت دور تک راہ کو روشن کر رہی ہے اور اس روشنی میں قدم اٹھاتا اس راہ پر بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ جو روشن کشادہ، سیدھی اور ہموار ہے۔

اس روشنی کے سبب راستے کی رکاوٹیں اور جھاڑ جھنکار دھواں ہو کر اس کو راہ دیتے چلے جا رہے ہیں اور وہ ایک عالم سر خوشی میں جھومتا بڑھے چلا جا رہا ہے۔ آگے ہی آگے۔ اس یقین کے ساتھ کہ اس کو اُس رحمٰن اور رحیم ذات اقدس کی حمایت اور مدد حاصل ہے جس کی تعریف کر کے وہ اُس کی بات سننے اور اُس کی بات ماننے پہ آمادگی کا اظہار کرتا رہا تھا لیکن یہ سب وہ بلا جانے بوجھے کرتا تھا اب آئندہ جب بھی وہ الحمد اللہ کہہ کر سورہ فاتحہ کی تلاوت کا آغاز کرے گا تو یہ بات اُس کے اندر پوری طرح روشن ہو گی کہ سب تعریفیں اُسی کے لئے ہیں کہہ کر وہ سب جہانوں کے پالنے اور سنبھالنے والے رحمٰن و رحیم رب کی عبودیت اور استعانت کے حصول کے لئے دل و جان سے اپنی آمادگی کا اظہار اور اقرار کرتا ہے اور اس کے لئے وہ اُس سے ایسی طرز فکر کا خواہاں ہے جس کی مدد سے وہ اللہ کی رضا مندی اور ناراضگی کا واضح اور دوٹوک ادراک کرنے والوں میں شامل ہونا چاہتا ہے۔

یااللہ میں چاہتا ہوں

نیند سے جاگنے پر اُس نے آنکھیں کھول کر گرد و پیش سے آگاہی کے لئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُس کی نگاہیں اپنی بیوی پر جا ٹھہریں۔ وہ اُس سے پیشتر جاگ چکی تھی لیکن محض اُس کی نیند خراب نہ کرنے کو اٹھنے سے رکی ہوئی تھی۔ وہ اُسی کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں تو وہ دونوں مسکرا دیئے۔ یہ مسکراہٹ صبح بخیر کا متبادل بھی تھی اور اُن کے درمیان تعلق کی مضبوطی اور باہمیاعتماد کی سند بھی۔ اُس کے کچھ کہنے سے پیشتر ہی اس کی بیوی کمرے سے باہر چلی گئی۔ وہ اُس کو پلنگ سے اُتر کر ننگے پاؤں کمرے سے باہر جاتے دیکھتا رہا۔ جب وہ باہر چلی گئی تو اُس نے آنکھیں موند لیں۔

اُس کو باورچی خانے میں کیتلی میں پانی بھر کر چولھے پر رکھنے جلانے اور برتنوں کی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ناشتہ بنانے سے پیشتر چائے بنانے کی تیاری ہو رہی ہے۔ دو پیالیاں چائے بنا کر وہ اُس کے پاس آکر بیٹھ جائے گی۔ چائے پینے کے دوران وہ اُس کو رات میں اپنے کسی دیکھے گئے خواب کی بات سنائے گی۔ گزشتہ روز کے کسی واقعہ پر تبصرہ کرے گی یا آج کرنے والے کاموں پر کوئی مشورہ لیا یا دیا جائے گا اور یا پھر بچوں کی کسی ضرورت کا تذکرہ ہو گا۔ آج کیا کیا کرنا چاہیے؟ یہ طے ہو گا اور پھر وہ چائے پی کر ناشتہ بنا کر بچوں کو جگائے گی۔ انہیں اسکول کے لئے تیار ہونے میں مدد دے گی۔ بچے ناشتہ کر کے امی ابو کو سلام کر کے انہیں خدا حافظ کہہ کر اسکول چلے جائیں گے۔ پھر وہ اُٹھے گا۔ دونوں اکٹھے ناشتہ کریں گے۔ وہ تیار ہو کر دفتر چلا جائے گا۔ یہ ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ بچوں نے آج اسکول جانے سے پیشتر اس کو بتایا کہ وہ اسکول کی طرف سے پکنک پر جانا چاہتے ہیں۔ اُس نے انہیں اپنی ماں سے اجازت لینے کو کہا۔ ”امی نے تو کہا تھا کہ اگر تمہارے ابو اجازت دیں گے تو میں اجازت دوں گی۔“ اُس کی بیٹی نے کہا۔

اُس کی بیوی نے بچوں کو اس سے اجازت لے کر جانے کی بات تعلیم کر کے بچوں کے دل میں اُس کی اہمیت اجاگر کرنے کی جو کوشش کی تھی، اُس نے دل ہی دل میں اس بات کو سراہا اور بچوں سے کہا۔ اور میں تو آپ کو آپ کی امی کے کہنے پر اجازت دوں گا۔۔۔ کیوں بھئی آپ کا کیا خیال ہے؟ اس نے بیوی کو مخاطب کیا۔ بیوی اس بات پر اپنی اہمیت محسوس کرتے ہوئے مسکرائی۔۔ ''جی ہاں۔'' آپ اتنے ہی تو تابعدار ہیں!۔'' اُس نے اپنے شوہر پر جوابی چوٹ کرتے ہوئے کہا۔ بچے ماں باپ کی نوک جھونک کا لطف لیتے اسکول چلے گئے۔

اُس کو ناشتہ کرواتے ہوئے اُس کی بیوی نے کہا۔ '' میں چاہتی ہوں کہ آج ذرا اپنی بہن کے یہاں ہو آؤں۔ اس کے بیٹے کی شادی قریب ہے۔ بچوں کے اسکول سے آنے تک واپس آجاؤں گی۔''

''ذرا کیوں۔۔۔ آپ بے شک پورے کی پوری چلی جائیں۔ کہیں تو میں خود آپ کو وہاں چھوڑتا ہوا دفتر چلا جاؤں۔'' اس نے خوشگوار انداز میں بات مکمل کی۔

بیوی کو اُس کی بہن کے یہاں چھوڑ کر وہ دفتر پہنچا تو منیجر صاحب نے کہا۔ '' میں چاہتا ہوں کہ آپ جا کر فلاں کلائنٹ سے مل لیں تا کہ معلوم ہو سکے کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟''

''جی ہاں ضرور، کیوں نہیں۔ آپ فکر نہ کریں میں اُن سے جا کر آج ہی مل لوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ دفتری معمولات میں مصروف ہو گیا۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف اس کا ایک پرانا دوست تھا۔

''خیر تو ہے آج ہماری یاد کیسے آگئی اور وہ بھی صبح صبح۔'' اس کے پوچھنے پر اس کے دوست نے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ آج شام تم لوگ ہمارے یہاں آؤ۔''

''وہ کیوں؟ خیر تو ہے؟''

''ہاں بھئی، وہ دراصل گڑیا کی سالگرہ ہے آج بھابھی بچے آئیں گے تو بچے خوش ہو جائیں گے۔''

''اور کیا تم خوش نہیں ہو گے؟'' اس نے دوست سے چہل کرنے کے انداز میں پوچھا۔

''کیوں نہیں، تم آؤ گے تو ہم بھی خوش ہو جائیں گے۔'' اس کے دوست نے کہا اور اس نے آنے کی حامی بھر لی۔ فون بند کر کے اس نے دفتر کے ایک کلرک کو بلایا اور کہا۔

''مجھے ایک کام سے جانا ہے تم مجھے بازار سے تحفہ دینے کے لئے کوئی چیز لا دو۔۔ ۵۔۔۔ ۶ سال کی عمر ہو گی اس بچی کی۔۔۔ سالگرہ کا تحفہ دینا ہے۔۔۔ یہ لو پیسے میرا خیال ہے کہ کوئی گڑیا بہتر رہے گی۔۔۔ پیک بھی کروا لینا۔ اصل میں میری بیوی بھی گھر پر نہیں ہے اور شام کو نہ جانے ہمیں فرصت ملے یا نہ ملے، اس لئے تمہیں زحمت دے رہا ہوں۔''

''جی بہتر ہے۔'' کہہ کر اُس کلرک نے پیسے لئے اور بازار چلا گیا۔

کچھ دیر بعد فون کی گھنٹی بجنے پر اُس نے ٹیلی فون کا چونگا اُٹھایا۔ اس بار شاید کوئی شنکی سا کسٹمر تھا۔

''آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو؟۔۔ میرا اتنا نقصان ہو جائے گا۔۔۔ اب تک میرا کام کیوں نہیں ہوا؟۔۔۔ میں نے تم لوگوں پر اعتماد کر کے تمہیں کام دیا تھا۔۔۔ لیکن لگتا ہے کہ تم لوگ کام کرنا ہی نہیں چاہتے۔۔ میں آئندہ تم سے کام نہیں کرواؤں گا۔''

وہ اُس کو تسلی دیتا رہا کہ آپ فکر نہ کریں، آپ کا کام ہو گا اور ضرور ہو گا۔ میں انشاءاللہ آج ہی آپ کا کام مکمل کروا کر آپ کو اطلاع دیتا ہوں۔۔۔ اُس نے اس کلائنٹ سے جان تو چھڑا لی مگر۔۔۔ ''تم لوگ چاہتے کیا ہو؟۔۔۔ تم کام کرنا نہیں چاہتے۔۔'' کی آواز اُس کے ذہن میں تکرار کرتی رہی۔

ہم سب کچھ نہ کچھ چاہتے ہیں۔ بچے پکنک پر جانا چاہتے ہیں۔ بیوی کو بہن کے گھر جانے کی خواہش ہے۔ کلائنٹ کیا چاہتا ہے؟ منیجر کیا چاہتا ہے؟ افسران کیا چاہتے ہیں؟ میرے دوست احباب، رشتے دار کیا چاہتے ہیں؟ میں کیا چاہتا ہوں؟ وہ کیا چاہتا ہے؟۔۔اُس نے سوچا۔

یہ سب کھیل ہی خواہشوں اور چاہتوں کا ہے۔ کہیں یہ خواہشیں نا آسودہ چاہتوں میں ڈھل کر روگ بنتی ہیں اور کہیں آسودگی پا کر تسکین بہم پہنچاتی ہیں۔ زندگی انہی چاہتوں کی آسودگی اور نا آسودگی کا مرکب ہے۔۔۔ فکر کے تالاب کی سطح پر خیالات کے دائرے بنتے اور پھیلتے چلے گئے۔

''زندگی۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ صرف اللہ کا چاہنا ہی زندگی ہے۔ جس طرح اور جب تک۔۔ اللہ چاہتا ہے، ہم زندگی کی قید میں رہتے ہیں۔'' اُس کے ذہن میں اُس کے بابا جی کے کہے ہوئے الفاظ ایک بازگشت بن کر ابھرے اور اُس کی فکر کو مہمیز کرتے چلے گئے۔

اُس نے سوچا کہ اگر زندگی کا ہونا، اُس کی نوعیت، اس کی مدت، سب کچھ اللہ تعالیٰ کی چاہت اور مرضی سے وابستہ ہے تو پھر اس زندگی میں ہماری چاہتوں اور خواہشوں کا کیا مقام۔۔۔ ہماری مرضیوں کا کیا مقام؟ اُس کے شعور نے ایک سوال سامنے لا کر اُس کو تفکر پر ابھارا۔ اُس نے سوچا۔

''ہم تو ساری زندگی اپنی ہی چاہتوں اور خواہشات کی تکمیل میں صرف کر دیتے ہیں۔ ہماری تمام تر کوشش و کاوشیں اور جد و جہد کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے۔۔۔ اپنی مرضی، اپنی خواہش اور اپنی چاہت کی تکمیل اور اس کا حصول اور تو اور ہم تو دعائیں بھی اپنی چاہتوں اور خواہشوں کو پورا کرنے اور کروانے ہی کے لئے کرتے ہیں۔۔ یا اللہ یہ کر دے ۔۔۔ اے اللہ وہ کر دے ۔۔ اے پروردگار کہیں یوں نہ ہو جائے۔۔ اے بار اللہ یوں نہ ہونے دینا۔۔۔ اگر ایسا ہو گیا تو ہم مارے جائیں گے۔۔۔۔ ہمارا تو بڑا نقصان ہو جائے گا۔ اپنی ان دعاؤں کی مقبولیت کو یقینی بنانے کو اُس کے ساتھ درود و سلام بھی ٹانک دیتے ہیں۔

اُس کو اپنے اس عجیب و غریب خیال پر حیرت ہوئی۔ اُس نے خود سے کہا۔ اگر ایسا نہ کریں تو اور کیا کریں؟ اللہ تعالیٰ خود ہی فرماتا ہے۔ مجھ سے مانگو، میں تمہیں دوں گا۔ میں تمہاری دعائیں سنتا ہوں۔ وہ الجھ سا گیا۔ الجھن محسوس کرتے ہی شعور نے اُسے واپس دفتری ماحول میں منتقل کر دیا۔ دن بھر مختلف مصروفیات کے دوران بھی رہ رہ کر اُس کو اپنی اس تازہ الجھن کا دھیان آتا رہا۔

شام کو وہ اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ دوست کی رہائش گاہ پر اُس کی بیٹی کی سالگرہ کی تقریب میں شامل ہوا۔ چائے کے بعد مہمانوں میں سے کسی ایک نے پوچھا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ اب میں نئی گاڑی لے ہی لوں، لیکن خدا کو نہ جانے کیا منظور ہے کہ جب پیسے ہوتے ہیں تو پسند کی گاڑی نہیں ملتی اور جب گاڑی ملتی ہے تو اُن دنوں پیسے نہیں ہوتے۔ آج کل پیسے ہو گئے ہیں تو کہیں کوئی پسند کی گاڑی نہیں مل رہی۔ تمہاری نظر میں کوئی ہو تو ضرور بتانا۔''

اُس کے ذہن میں پھر وہی چاہتا ہوں کی تکرار ابھری۔ اُس نے کہا۔ ''ہاں کیوں نہیں۔۔ اگر اللہ نے چاہا تو ضرور ہو جائے گا۔۔۔ تم فکر مت کرو۔'' یہ بات کہتے ہوئے اُس کو جھرجھری سی آ گئی اُس نے اپنے کہے ہوئے الفاظ کو

اپنے ذہن میں دہرایا اور سوچا۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہی سمیع و خبیر ہے ۔ جو بھی ہو گا۔۔اُسی کے چاہنے سے ہو گا۔ وہی تو ہے جو انسانی خواہشات اور توقعات کو پورا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اُس کے ذہن میں اپنے بابا جی کا کہا ایک جملہ گونجا۔

''اللہ میاں تو اتنے بڑے ہیں کہ اگر ان کی مخلوق میں سے ہر فرد روزانہ ایک لاکھ خواہشیں بھی کرے تو وہ اُن کو پورا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔''

ابھی اس جملے کی بازگشت اُس کے ذہن سے محو بھی نہیں ہوئی تھی ایک خاتون کی آواز نے اُس کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ کسی دوسری خاتون سے کہہ رہی تھیں۔''اللہ کو کیسے پکاریں کہ ہماری دعائیں سُن لے ۔ نہ جانے وہ ہماری دُعائیں کیوں قبول نہیں کرتا ؟''

کان میں پڑی اس آواز نے اُس کے اندر ایک بھنور کو جنم دیا۔ اُس بھنور کی زد میں آکر اُس کو اپنا پورا وجود ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ اس سوال نے ایک بڑے سے گرداب کی شکل اختیار کر لی جس کی لپیٹ میں آکر ہر چیز تہہ نشین ہوتی محسوس ہوئی اُس کا جی چاہا کہ وہ زور زور سے پکارنے لگے۔۔ بچاؤ، بچاؤ۔ لیکن پیشتر اس کے کہ اس کے منہ سے کوئی آواز نکلتی، اس کے بیٹے نے اُس سے پوچھا۔ امی کہہ رہی ہیں کہ کب چلیں گے؟ چنانچہ اُس نے میزبان سے اجازت لی اور سب اپنے گھر روانہ ہو گئے۔

رات گئے نیند کی وادی کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے اُس نے تیسری بار کروٹ لی۔ پہلو بدلتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ سب سو چکے ہیں اُس نے خاموشی اور سناٹے کی فضا میں کمرے میں گونجتی جھینگر کی آواز اور اپنے بچوں کے سانسوں کی آواز کے تال میل کو سننا شروع کر دیا۔ یہ رات کی آوازیں حواس میں کیسی تبدیلی لے آتی

ہیں؟ ہر چیز کی ہیت ہی بدل جاتی ہے۔ محسوس اشیا غیر محسوس ہو جاتی ہیں اور غیر محسوس کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ موجود معدوم ہو جاتا ہے اور معدوم اور مبہم ابھر آتے ہیں خیال کی پرواز بڑھ جاتی ہے اور فکر کے دائرے وسیع تر ہو جاتے ہیں۔ نیند شعور کو اپنی آغوش میں لے کر ایسی لوری سناتی ہے کہ شعور مست و بے خود ہو جاتا ہے اور لاشعور مستعد اور متحرک ہو جاتا ہے۔

مستعد لاشعور بے خود شعور کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ دن کی پر خار راہوں پر چبھی ہوئی پھانسوں کو نکالنے کا اہتمام کرنے میں جت جاتا ہے چوٹوں اور زخموں پر شفا بخش خیالوں کے مرہم لگاتا ہے، اُس کو توانائی بخش احساسات منتقل کر کے اُس کی تھکن اور پژمردگی دور کرتا ہے۔ اُس کو خوف و حزن کے شکنجے سے نکال کر راحت و سکون کی وادی میں اتار دیتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنے بابا جی کے ہمراہ ایک پُر فضا اور شاداب وادی میں حدِ نظر تک بکھرے پھولوں کے رنگ برنگے تختوں کے درمیان موجود ہے۔ اس روشن اور حسین وادی میں نکہت اور لطافت کے ساتھ ساتھ خمارِ مسرت کی بھی آمیزش ہے۔ اُس نے خود کو اپنے بابا جی سے پوچھتے دیکھا۔ جب اللہ تعالیٰ کہتے ہیں۔ ''مجھ سے مانگو تو پھر وہ ہمیں وہ کیوں نہیں دیتے جو ہم اُن سے مانگتے ہیں۔۔۔ وہ ہماری دُعائیں کیوں قبول نہیں کرتے؟''

''اس لئے کہ کائنات کا انتظام۔۔۔ آپ نہیں ۔۔۔ بلکہ اللہ تعالیٰ چلا رہے ہیں!'' ایک ٹھہرے ہوئے مدھر انداز میں دیئے گئے جواب نے لذت آگہی کو اس قدر بیدار کیا کہ اس کے پورے وجود میں ایک کرنٹ سا ڈور گیا۔ کرنٹ کے اس جھٹکے سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے، اس کیفیت کا شعوری ادراک کرنے کے لئے کئی بار پلکیں جھپکیں اور اس پورے منظر کو ذہن میں دہرایا اور سوچا کہ یہی تو وہ بنیادی نکتہ ہے جو انسان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور وہ اپنی چاہتوں کے جال میں پھڑپھڑانے لگتا ہے اگر یہ بات ہمہ

وقت سامنے رہے کہ کائنات کا پورا انتظام اللہ تعالیٰ چلا رہا ہے اور اس نظام کے چلانے کے لیے اُس نے کچھ اصول اور قواعد و ضوابط طے فرما دیئے ہیں۔ انہی اصولوں اور انتظامی قوانین سے واقفیت نہ ہونے کے سبب انسان اپنی دُعائیں بے وقوفی سے مرتب کر بیٹھتا ہے اور ایک طفلانہ ضد سے ان کو پورا ہونے پر اصرار بھی کرتا ہے۔ اس واقفیت کا نہ ہونا ہی تو جہالت ہے۔

ایک گھر کا سربراہ ہونے کے ناتے وہ اپنے بچوں کی ہر ضرورت کو پورا کرنے کی تگ و دو کرتا ہے۔ لیکن اُن کی تمام خواہشات کو اُن سے تمام تر محبت کے باوجود پورا کرنا روا نہیں سمجھتا۔ بچے اکثر ایسی خواہشات کا اظہار کر بیٹھتے ہیں جن کو اگر وہ پورا کرنے بیٹھ جائے تو گھر کا سارا نظام ہی درہم برہم ہو کر رہ جائے۔

جس نے گھر کا انتظام چلانا ہوتا ہے۔ اُس کی کچھ اپنی ترجیحات ہوتی ہیں۔ اگر وہ ان ترجیحات کو بچوں کی خواہشات پر مقدم نہ رکھے تو نظام بے نظامی کی تصویر بن جائے، بد نظمی کا شکار نظام نہیں چلا کرتے۔ ایسے نظام ٹھس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اُس کو اپنا ایک ملازم یاد آگیا۔ اُس نے گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں سہولت کے لئے ایک لڑکا ملازم رکھا۔ وہ ایک پہاڑی علاقے سے آیا تھا۔ سیدھا سادھا سا دیہاتی جان کر، اُس نے کھانا، پینا، رہنا، سہنا، کپڑا لتا اور کچھ تنخواہ کے عوض اُس کو اپنے گھر ہی میں رکھ لیا۔ دو چار روز تو اس کی سادہ لوحی اور سیدھے پن کا لطف لیتے گزرے۔ لیکن پھر اُس کی حرکتیں سب کو کھلنے لگیں۔

ایک روز جب اُس نے اس کو گاڑی دھونے کا کہا تو اُس نے اس پہ جی اچھا کہا اور گیراج کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ یہ دیکھنے آیا کہ وہ گاڑی کیسے صاف کر رہا ہے تو وہ لڑکا موجود نہیں۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد

کہیں باہر سے نمودار ہوا۔ پوچھنے پر بتانے لگا کہ گاڑی دھونے کے لئے کپڑا اور بالٹی لینے ہمسایوں کے گھر گیا تھا۔ اُس کو غصہ تو بہت آیا تھا مگر وہ اس کو پی گیا۔ اُسے سمجھایا کہ جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہوا کرے تو مجھ سے کہا کرو۔ ہمسایوں سے مانگنا غلط ہے۔ خبردار آئندہ ایسا مت کرنا۔ لڑکے نے ۔۔جی بہت اچھا کہا اور بات ختم کر کے گاڑی صاف کر کے دفتر چلا گیا۔

دوسرے روز اُس نے اُس لڑکے کو گاڑی دھونے کو کہا تو وہ وہیں کھڑا رہا۔ ''بھئی کیا بات ہے ؟ تم جا کر گاڑی صاف کرو۔ اچھی طرح صاف کرنا۔ ابھی اُس نے کچھ اور کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ لڑکا بولا۔

''صاحب جی بات دراصل یہ ہے کہ میری بنیان پھٹی ہوئی ہے۔''

''ہاں ۔۔تو اس وقت اس بات کا کیا تذکرہ؟ تم جا کر گاڑی تو صاف کرو۔'' اس نے بے وقت اطلاع کا برا مانے بغیر کہا۔

''صاحب جی۔۔مجھے نئی بنیان چاہیے۔'' لڑکے نے فرمائش کی۔

''ہاں بھئی وہ تو ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بیگم صاحبہ سے کہہ دوں گا۔ وہ تمہیں نئی بنیان لا دیں گی۔ تم اس وقت تو جا کر گاڑی صاف کرو۔ مجھے جلدی جانا ہے۔'' اُس نے اس کو کام ختم کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے کہا۔

''آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ تمہیں جس بھی چیز کی ضرورت ہوا کرے مجھ سے ہی مانگا کرو۔۔ہمسایوں سے مانگنا غلط ہے۔'' لڑکے نے اُس کی کہی ہوئی بات کو بطور سند اور دلیل پیش کرتے ہوئے اُس کو اپنے تئیں لاجواب کیا۔

وہ تپ کر رہ گیا۔ ”گویا تم بنیان بھی ہمسایوں سے مانگ کر پہنتے رہے ہو۔۔ خدا تمہیں سمجھے۔ تم گاڑی صاف کرتے ہو یا میں خود ہی کر لوں؟“

شام کو اُس کی بیوی نے اُس سے گلہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ لڑکا تو کچھ عجیب سنکی سا ہے۔ ہم اسے کوئی بھی کام کہتے ہیں تو کھڑے ہو کر اپنی کوئی نہ کوئی فرمائشیں جتانے بیٹھ جاتا ہے۔ کہو کہ بازار سے یہ لا دو تو کہتا ہے کہ مجھے فلاں شے درکار ہے۔ کہو کہ بچوں کے جوتے پالش کر دو تو کہتا ہے کہ میری جرابیں نہیں ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو کیسے سمجھائیں۔ میں نے اس کو کہا بھی کہ جب تمہارا کھانا، پینا، کپڑے، رہنا سہنا سب ہمارے ذمہ ہے تو پھر تمہیں اور کیا چاہیے۔ لیکن یہ اپنی ضرورتیں گنوانے سے ہی باز نہیں آتا۔ آپ نے ہی اس کو رکھا ہے آپ ہی اس کو سمجھائیں۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ صاحب جی نے مجھے کہا تھا کہ تمہیں جو کچھ بھی چاہیے مجھ سے مانگا کرو۔۔۔ ہمسایوں سے مت مانگنا۔

اُس نے اُس کو بہت دفعہ سمجھایا لیکن جب اپنی کسی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا تو بالآخر ایک روز اس کو فارغ کر دیا گیا۔

رات کے اس اندھیرے میں اس وقت اُس کو اپنے اُس ملازم کی یاد آنا کچھ عجیب سا لگا۔ اُس کا ذہن اُس ملازم لڑکے کے طرزِ عمل اور طرزِ فکر کا موازنہ خود اپنے طرزِ فکر و عمل سے کرنے لگا۔ کہیں میں خود بھی تو اسی ملازم لڑکے جیسے طرزِ عمل کا شکار نہیں ہوں؟ یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ میں بھی تو ہر روز صبح سویرے اُٹھ کر فرمائشوں کی ایک طویل فہرست لے کر اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑا ہو جاتا ہوں۔ یا اللہ یہ کر دے ۔۔ یا اللہ وہ کر دے۔۔۔ یا اللہ یوں کر دے۔۔۔ یا اللہ ووں کر دے۔ یا اللہ ایسا نہ ہونے دینا۔۔ یا اللہ تجھے واسطہ فلاں فلاں کا۔۔ ویسا تو ہرگز بھی نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ میری تمام خواہشات، آرزوئیں اور فرمائشیں میری اپنی ذات کے حوالے سے ہوتی ہیں۔ اگر میرا وجود ہونا

۔۔۔میری زندگی۔۔۔میری ہستی۔۔اللہ تعالیٰ کی عنایت اور کرم کی وجہ سے ہے تو اس کے قیام کے لئے درکار وسائل۔۔رزق کی فراہمی ۔۔کھانا پینا۔۔کپڑا لتا۔۔۔رہنا سہنا۔۔کار روزگار بھی تو سب اسی کا عطا کیا ہوا ہے۔

اُس کی ان سوچوں اور خیالات کا دھارا خود اس کے اپنے ضمیر سے پھوٹ رہا تھا۔ تبھی تو وہ اتنی صاف بے لاگ اور دو ٹوک تنقید کر رہا تھا۔ اُس نے اسی زد میں سوچا۔ ”مجھے آج تک کبھی یہ توفیق نہ ہوئی کہ میں اللہ تعالیٰ سے یہ دریافت کروں، یہ دعا کروں، یہ عرض گزاروں۔۔اے میرے مالک۔۔اے میرے پروردگار۔۔اے میرے خالق ۔۔تو نے مجھے جس مقصد کے لئے تخلیق کیا، جس کام سے عہدہ بر آ ہونے کے لئے پیدا کیا۔۔جو خدمت تو نے مجھے تفویض کی۔۔ وہ کیا ہے؟ میں اُسے کیونکر بحسن و خوبی مکمل کر سکتا ہوں؟“

یہ سوچتے سوچتے اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ۔ ندامت اور پشیمانی کے آنسو۔۔احساس زیاں اور غلط کارانہ روش پہ گامزن رہنے کا احساس ہونے کے بعد بہنے والے آنسو۔۔

اُس سے رہا نہ گیا۔ وہ بستر سے اُٹھ کر فرش پر بغیر مصلٰی بچھائے سجدہ ریز ہو گیا۔ خاموشی میں اُس کے اندر ایک ہی صدا گونج رہی تھی۔

”بار الٰہ ! میرے لئے تیرا کیا حکم ہے؟۔۔۔ تو مجھے حکم فرما۔۔مجھے فہم اور سمجھ عطا فرما۔۔۔کہ میں اپنی خواہشوں کی بجائے اپنے مالک۔۔اپنے رب۔۔اپنے خالق۔۔اپنے پروردگار کی مرضی اور خواہش پر کاربند ہو سکوں۔“

یہ محبوب کیا ہوتا ہے؟

وہ دفتر جانے کے لئے تیار ہو کر نکلا اور گاڑی میں آن بیٹھا۔ وہ جاتی سردیوں اور آتی بہار کے دن تھے۔ درختوں کی سوکھی برہنہ شاخوں پر تازہ کونپلوں، شگوفوں اور ادھ کھلے پتوں سے اُن پہ ہریالی کا رنگ چڑھنا شروع ہو چکا تھا۔ فضا میں بدلتی رُت کا خوشگوار تاثر پھیلا ہوا تھا۔ یہ تاثر اس کو اپنے رگ و پے میں اترتا محسوس ہوا۔ آج اُس کا موڈ خوشگوار تو تھا ہی اس تاثر سے وہ مزید نکھر سا گیا تھا۔ باہر کی رُت کا کچھ اثر اندر کے موسم پر بھی ہوتا ہی ہے۔ وہ زیرِ لب کچھ گنگنا بھی رہا تھا۔ اُس کی انگلیاں تال دینے کے انداز میں سٹیرنگ پر تھرک رہی تھیں۔

سڑک تک آتے آتے اُس نے اپنی ترنگ میں، اپنے اندر ابھرتی، پھیلتی اور دھڑکتی تال کا لطف لیتے کیسٹ پلیئر کا بٹن دبایا۔ محبت کا ایک گیت گاڑی میں پھیلنا شروع ہو گیا۔ گیت کے بول، گلوکارہ کی آواز کا حسن، سروں کا انتخاب سب ہی کچھ ایک دوسرے کو ابھار رہے تھے۔ موسیقی اور نغمگی کے ساتھ ساتھ مفہوم کی کسک نے جب اُس کے اندر اُٹھتی تال سے میل کیا تو وہ گیت کے افسوں سے مسحور سا ہو گیا۔ گاڑی چلاتے ہوئے سڑک کے کنارے اُگے درختوں پہ نئی روئیدگی کی سبز ردا کے نشان دیکھتا، محبت کے گیت کا لطف لیتا وہ دفتر پہنچ گیا۔

اپنی دفتری مصروفیات کے دوران بھی وہ اسی خوش گوار کیفیت کے زیرِ اثر رہا۔ شام کو گھر جاتے ہوئے، ڈھلتے دن کے اداس لمحوں میں بھی اُس کے اندر مسرت اور کیف کی پھیلی لہریں اپنا جادو طاری کئے رہیں۔ راستے میں اُس نے نرگس کے پھولوں کا ایک گلدستہ خریدا۔ اُس کی بیوی کو نرگس کے پھول اپنی بھینی بھینی مہک کی وجہ سے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر کس قدر خوش ہو گی۔۔ وہ اُس کی خوشی کا اندازہ کرتے ہوئے مسکرا اُٹھا۔ گاڑی میں محبت بھرے گیت کے آہنگ سے نرگس کے پھولوں کی مہک نے اس کے سرور کو دوچند کر دیا۔

گھر پہنچ کر اُس نے پھولوں کا گلدستہ بیوی کو دیا۔ حسبِ توقع وہ کھل اُٹھی۔ بچے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ وہ جا کر اُن کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ٹی وی پر اُس وقت جو پروگرام چل رہا تھا، وہ اس کے دل پسند پروگراموں میں سے ایک تھا۔ اُس پروگرام کا میزبان اشفاق احمد محبت کے موضوع پر کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا:

ایک روز اُس کی پوتی نے اپنی دادی سے پوچھا۔ ''دادی اماں یہ محبوب کیا ہوتا ہے؟''

دادی نے جواب میں پوتی کو بتایا۔ ''وہ جس سے محبت کی جاتی ہے!''

پوتی نے کہا۔ ''یہ تو آپ نے محبوب کا ترجمہ کر دیا۔ وہ ہوتا کیا ہے؟''

اب اس بات کا جواب شاید دادی کے پاس نہیں تھا۔ یا تھا تو وہ اُس کو بیان کرنے سے قاصر تھی بہرحال اُنہوں نے معاملہ دادا کے سامنے رکھا۔ اُس نے بھی اپنی سی توجیہہ دی لیکن وہ بھی پوتی کے چہرے پر اطمینان کا رنگ ابھرتے نہ دیکھ سکے۔ اس بات سے وہ خود بھی مطمئن نہ ہو سکا۔

پھر ایک روز وہ ایک بابا جی سے ملنے میاں میر کے قبرستان گئے۔ وہاں انہیں اپنی پوتی کا پوچھا گیا سوال یاد آگیا۔ انہوں نے وہ سوال بابا جی سے پوچھ لیا۔ بابا جی اُس وقت دال پکا رہے تھے۔ انہوں نے لکڑی کا چمچ ہنڈیا کے کنارے پر مار کر جھاڑتے ہو کہا۔

''محبوب وہ ہوتا ہے جس کی ناپسندیدہ بات بھی پسند ہو جائے۔''

وہ یہ بات سن کر جھوم اُٹھا۔ اُس کا ذہن اسی جواب کی تکرار کرتا، اس کے مختلف پہلوؤں پہ سوچتا اور لطف لیتا رہا۔ کھانے کے دوران بھی وہ اسی بات کا مزہ لیتا رہا۔ اس بات کی گہرائیوں میں اترتا، اس کا لطف لیتا اور سر دھنتا رہا۔

محبت اور عشق کا موضوع شعور کے لئے ہمیشہ ہی قابل توجہ رہا ہے۔ ہابیل اور قابیل کے درمیان جنگ و نزاع کی وجہ بھی محبت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی رقابت ہی بتائی جاتی ہے۔

معلوم تاریخ میں سینکڑوں نہیں ہزاروں واقعات اسی محبت کی جولانیوں کا نتیجہ رہے ہیں۔ مقالاتِ افلاطون کا مشہور زمانہ مضمون ''مذاکرہ'' بھی اسی محبت کے موضوع پر سقراط اور اُس کے ہم عصر دوستوں کے افکار کے ایک ریکارڈ کی صورت گزشتہ پچیس صدیوں سے موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ اُس میں محبت کو ایک دیوتا کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ سقراط اپنی ایک استانی ڈائیوٹیما کے حوالے سے تمثیلی انداز میں محبت کی مختلف النوع اور متضاد کیفیات کی بابت جو کچھ بیان کرتا ہے بعد میں لوگوں نے اُن کو اُسی کے نام کی مناسبت سے ''افلاطونی محبت'' کا نام دے کر اُس کی توقیر کو کم کرنے کی بہت کوشش کی۔ وہ محبت کو جسمانی سے زیادہ روحانی تعلق کے طور پر ثابت کرتا اور اسی طرز فکر کا پرچار کرتا رہا۔

ہر انسان ہوش سنبھالنے کے بعد اپنے ارد گرد کے ماحول کی بابت اپنا ایک نکتہ نظر وضع کر لیتا ہے۔ اس نکتہ نظر کو وہ اپنا نظریہ قرار دے دیتا ہے اور اُس کی بابت وہ یہ سمجھتا ہے کہ بس یہی بات حرف آخر بھی ہے اور حتمی بھی۔ لیکن کبھی کبھار وہ کوئی ایسی بات سن لیتا ہے، اس کے مطالعے میں آجاتی ہے یا اُس کو خود غور و فکر کے نتیجے میں معلوم ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے سابقہ نظریے میں تبدیلی کو ناگزیر مان لیتا ہے۔

عشق و محبت کی بابت اکثر لوگوں کے نظریات دوسروں کی رائے کے زیرِ اثر ہوتے ہیں۔ معاشرتی اقدار کے حوالے سے، اس کو اکثر و بیشتر شجرِ ممنوعہ گردانا جاتا ہے اور ظالم سماج ہمیشہ اس کے درپے آزار ہی رہتا ہے۔ چونکہ یہ ہر کس و ناکس کے ذاتی تجربے میں نہیں ہوتا، اس لیے اس کی بابت عموماً یہی رائے پائی جاتی ہے کہ یہ خلل ہے دماغ

کا۔ عشق کو دماغ کا خلل قرار دینے والوں کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ یہ آدمی کو نکما کر دیتا ہے۔ مزید یہ کہ اس کے ہاتھوں عزتِ سادات بھی جاتی رہتی ہے۔ اس لئے اس سے پرہیز اور احتیاط کا درس عام چلن قرار پاتا ہے۔

ہم پیار محبت کے جس روپ سے متعارف ہیں وہ تو صرف اتنا ہی ہے کہ فلم، ڈرامے یا ناول کا ہیرو، ہیروئن سے یہ کہتا ہے کہ تم مجھ سے شادی کر لو کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں یا پھر یہ ہوتا ہے کہ ہیوئن ہیرو سے کہتی ہے کہ اب ہمیں شادی کر لینا چاہیے کیونکہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ نہ کبھی کسی ہیروئن نے کسی ہیرو سے یہ کہا ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو کرتے رہو، میں جب تم سے محبت کروں گی تو شادی کا سوچوں گی اور نہ ہی کبھی کسی ہیرو نے ہیروئن سے پلٹ کر کہا۔ تم مجھے اپنا محبوب قرار دے رہی ہو تو اپنا شوہر کیوں بنانا چاہتی ہو؟ مجھے محبوب ہی رہنے دو۔ وہ ایسا کہہ ہی نہیں سکتے کیونکہ اگر وہ ایسا ویسا کچھ کہہ دیں گے تو وہ ہیرو ہیروئن نہیں رہیں گے۔۔ وہ تو عام سے سمجھدار لوگ بن جائیں گے اور یہی ہم نہیں چاہتے۔

اس سے ہمارے ذہنوں میں پیار محبت کا جو تصور راسخ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ پیار کرنے والے کو اپنے محبوب پر قبضہ جمانے کا حق حاصل ہو جاتا ہے اور جس سے پیار کیا جاتا ہے وہ پیار کرنے والے کی ہر بات ماننے والے کا پابند ہو جاتا ہے۔

اگر جذبات کی اندھی عینک اتار کر دیکھا جائے تو پیار دراصل خدمت کرنے کے اُس اعلیٰ جذبے کو کہا جاتا ہے جو ہمیں ممتا کے روپ میں نظر آتا ہے۔ ماں کا اصل محبوب اُس کی اولاد ہوتی ہے۔ اولاد کو وہ اپنے خون سے بناتی ہے اور پھر اپنے خون سے ہی سینچتی اور پروان چڑھاتی ہے۔ اُس کی ذرا ذرا سی تکلیف پر بھی بے چین ہو جاتی ہے۔ اپنی اولاد کی ہر خواہشپوری کرنا اُس کا ایمان اور اُس کی ہر ضرورت مہیا کرنا، اپنا فرض گردانتی ہے۔ تو پھر یہ پیار محبت اور

عشق اصل میں کیا ہیں؟ اس جذبہ دل کی اصل حقیقت کیا ہے؟ جس پر شعراء نے لافانی گیت تخلیق کئے، مصوروں نے اُن فن پاروں کو وجود بخشا جن کی بدولت وہ خود امر ہوگئے۔ داستان گو حضرات نے لوک قصوں میں ایسی رنگین بیانیاں کیں جو نسل در نسل حفظ کی جاتی رہی ہیں۔ ہیر رانجھا، سسی پنوں، لیلیٰ مجنوں، عذرا وامق، شریں فرہاد، رومیو جیولٹ اور نہ جانے کتنے ہی ایسے مزید قصے اور افسانے۔

وہ اپنے خیالوں کے ایسے ہی بنتے بگڑتے دائروں میں کھویا ہوا تھا کہ اُس کے بیٹے نے آکر اس سے اپنے ہوم ورک میں مدد چاہی۔ اُس کو کسی غزل کے اشعار کی تشریح کروانا تھی۔ غزل کے عشقیہ اشعار کی تشریح کرتے ہوئے، وہ اپنے بیٹے کے سامنے محجوب سا محسوس کر رہا تھا کہ اُس کے بیٹے نے خود ہی یہ کہہ کر اُس کی مشکل آسان کر دی کہ یہ عشق مجازی کی نہیں عشقِ حقیقی کی بات کہی جارہی ہے۔ اُس نے جلدی سے ہاں میں ہاں تو ملادی لیکن سوچ میں پڑ گیا۔ اُس نے یہ دوغلا پن کیوں کیا؟ اُس میں اتنی جرات کیوں نہیں کہ وہ اپنے بیٹے کو بتا سکتا کہ عشق تو صرف عشق ہوتا ہے۔ مجازی اور حقیقی کی تقسیم تو ہماری مصلحتوں نے کی ہے۔ شاید اس طرح ہم مصنوعی، بناوٹی، اصل اور خالص کے مابین فرق کو اجاگر کرنا چاہتے تھے۔

سوچ اور فکر کے پھیلتے دائرے شعور کی سطح پر اپنے نقوش ثبت کرتے چلے جارہے تھے کہ اُس کے اندر تجسس لہرایا اور ایک سوال کی صورت اختیار کر گیا۔ پیار محبت اور عشق کی بابت انبیاء نے کیا کچھ کہا ہے اور قرآن حکیم میں اس ضمن میں کیا کہا گیا ہے؟ اُس نے حافظے کو ٹٹولا۔ ہر مذہب نے خدا کو خدمت قرار دیا ہے۔ بعض مذاہب نے تو محبت کو ہی خدا مانا ہے۔ لیکن قرآن کے حوالے سے اُس کو کوئی بات یاد نہ آسکی۔ بالآخر وہ اُٹھا اور قرآنِ حکیم کھول کر بیٹھ گیا۔ اگلے کئی روز بھی اُس کی تلاش جاری رہی۔ وہ دفتر میں فارغ ہوتا یا وہاں سے گھر آنے کے بعد قرآن حکیم

لے کر بیٹھ جاتا اور اپنے سوال کو اپنے ذہن میں لئے ، کسی ایسی آیت کی تلاش میں سر گرداں ہو جاتا جو اُس کے اندر اس ابلتے کھولتے سوال کو ٹھنڈا کر کے ، اُس کو شانت کر دے۔

اس تلاش کے دوران اُس پر ایک عجیب سا انکشاف ہوا قرآن حکیم میں ایسی متعدد آیات موجود ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے کتنی محبت کرتا ہے ، وہ کیسے لوگ ہیں جن سے اللہ محبت نہیں کرتا اور وہ کون سے افراد ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کی نوید دی ہے۔ فساد کرنے والے ، حد سے گزرنے والے ، ظلم و زیادتی کرنے والے ، دوسروں کا حق غصب کرنے والے لوگوں کو اللہ تعالیٰ واضح طور پر بتاتا ہے کہ ایسے لوگ اس کے پیار و محبت تو کجا پسندیدگی کے دائرے میں بھی نہیں آ سکتے۔ دوسروں پر احسان کرنے ، دوسروں کا بھلا چاہنے ، غلطی کر کے توبہ کرنے اور انصاف کرنے والے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کی نوید سے نوازا ہے۔

اُس کو ایسی کوئی آیت نہ مل سکی جس میں انسانوں کو انسانوں سے یا کسی مادی اور دنیاوی چیزوں کی محبت کی اجازت دی گئی ہو۔ اس دریافت نے اُس کی سوچوں میں کئی نئے روزن کھول دیئے۔ پھر وہ سورہ آل عمران کی اس آیت کریمہ پر آن رکا۔ ”جو لوگ اللہ سے محبت کرتے ہیں تو آپ ﷺ اُن سے کہہ دیجئے کہ وہ میرا (یعنی آپ ﷺ کا) اتباع کریں تا کہ اللہ اُن سے محبت کرے۔“ اس آیت نے اُس کے شعور میں ایک اجالا سا کر دیا۔

جو لوگ اللہ سے عشق و محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اُن کو اللہ حکم دیتا ہے کہ وہ محبوب کبریاؐ کا اتباع کریں ، اُن ﷺ کی پیروی کر کے اللہ کے پیارے بننے کی کوشش کریں تا کہ اللہ اُن سے محبت کرے۔۔۔ تا کہ وہ اللہ کے عاشق بننے کی کوشش کریں۔ اُس نے اس محبت کی ندرت کو جانچا۔ بات سمجھ میں آ کر بھی نہیں آ رہی تھی۔ اُس نے اس سے پیشتر کبھی ایسا کیوں نہیں سُنا تھا۔ یہ کیا بات ہوئی؟ کیا انسان کو اللہ سے محبت نہیں کرنی چاہیے؟ عشق الٰہی کے ان گنت

واقعات جو اُس نے سُن رکھے تھے اُن کو وہ کس خانے میں فٹ کرے ؟ وہ الجھ سا گیا۔ اُس نے بہت سر لڑایا مگر بات سلجھنے کی بجائے الجھ کر گرہ بنتی گئی۔

اس بات کے سلجھاؤ میں جو امر مانع ہو رہا تھا وہ یہ تھا کہ عشق کو ایک ایسی آگ سے تشبیہ دی جاتی ہے جو لگائے نہ لگتی ہو اور بجھائے نہ بجھتی ہو۔ اب اگر عشق پہ زور بھی نہیں اور اس کی لگی بجھتی بھی نہیں تو اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو اپنی محبت کی اجازت دینے کی بجائے اپنا محبوب بنانے کی بات کیوں فرماتا ہے ؟ پھر اصل بات کیا ہے ؟ اگر یہ آگ ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنا محبوب قرار دے کر خود کو اس سوز اور تڑپ کا سزاوار کیوں کیا اور مخلوق کو اپنا محبوب بنا کر وہ اس آتشِ سوزاں کا مزید ساماں کیوں کر رہا ہے ؟ سوچ کی یہ لہر اُس کے لئے ایک ایسا دھماکا ثابت ہوئی جس نے اُس کے شعور کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔

کئی روز وہ خود سے الجھتا رہا۔ مراقبے کے دوران بھی وہ اس خیال سے پیچھا نہ چھڑا پاتا۔ کبھی اُس کو یہ خیال آتا کہ یہ سب محض جنسی جذبے کی کارستانی ہے لیکن جب وہ اپنے پیر و مرشد سے اپنے تعلق خاطر کے بارے میں سوچتا، اُن کی شفقتوں، اُن کی محبت کا اپنے لئے احساس کرتا تو یہ دلیل ٹھس ہو کر رہ جاتی۔ پھر وہ دوستوں سے اپنے تعلق کا جائزہ لیتا، اپنے لئے اُن کے خلوص آگیں جذبات کی بابت سوچتا کہ وہ کون سے جنسی جذبے کے تحت وجود پاتے اور اس کو سیراب کرتے ہیں۔

صنفِ مخالف میں کشش کو اگر جنس کے جذبے کا شاخسانہ مان بھی لیا جائے تو دوستوں سے محبت، مرید کا اپنے مراد سے پیار۔۔۔استاد کی اپنے شاگردوں سے الفت اور ان سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی بے حد و کنار وہ محبت جو وہ

اپنی مخلوق سے کرتا ہے، اُس کو کہاں فٹ کیا جائے ؟ جب وہ ہار گیا اور اُس کو کوئی راہ سجھائی نہ دی تو ایک روز اُس نے ٹکٹ لیا اور اپنے مرشد کریم کے حضور حاضر ہو گیا۔

سر میں پریشان خیالی کی دھول لئے وہ درماندہ سا اپنے بابا جی سے ملا۔ اُن سے مل کر، اُن کی محبت کی چھاؤں کا احساس کر کے، اُس کو یوں محسوس ہوا کہ وہ سکون کی ایک جھیل میں اتر گیا ہے۔ اُس کو ان کی قربتپا کر یہ بھی یاد نہیں رہا کہ وہ اُن سے ملنے کو اتنا بے تاب کیوں تھا؟ وہ سکون جو اُن کے ارد گرد گہرے پانیوں کی طرح ٹھہرا ہوا تھا اُس کے اندر اترتا چلا گیا۔ اُس کا جسم اور ذہن ہی نہیں بلکہ اُس کی روح تک شانت ہوتی چلی گئی۔ وہ دو تین دن رہا۔ ایک روز انہوں نے باتوں باتوں میں سرمد کی ایک رباعی پڑھی۔

سرمد غمِ عشق بوالہوس را نہ دہند　　سوز دل پروانہ مگس را نہ دہند

عمرے باید کہ یار آید بکنار　　این دولتِ عشق ہمہ کس را نہ دہند

(مفہوم: اے سرمد غمِ عشق بوالہوس کو نہیں دیا گیا۔ پروانے کے دل میں بھرا سوز مکھی کو نہیں دیا گیا۔ یار سے ہمکنار ہونے کے لئے عمریں درکار ہوتی ہیں۔ یہ دولتِ عشق ہر کسی کے نصیب میں نہیں)

اور فرمایا یہ لوگ عشق کو سوز اور محبت کو آگ نہ جانے کیوں کہتے ہیں؟ حالانکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ عشق میں انگ انگ زعفران زار بن جاتا ہے۔ عشق میں اگر سوز ہو تو یہ ضرور طلب اور بوالہوسی کے سبب ہوتا ہو گا۔ عشق میں تو بندے کے اندر گداز پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک ایسا گداز جو بندے کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ اپنے اندر موجود اللہ

سے واصل ہو جاتا ہے۔ عشق کو آگ کہنے والوں کے ذہن میں شاید یہ بات رہی ہو کہ یہ یکسوئی کی ایک ایسی اعلیٰ کیفیت ہے جس میں کوئی دوسرا خیال آ ہی نہیں سکتا۔ آ بھی جائے تو جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔

اپنے مراد کی اس بات نے اُس کے تپتے سلگتے اعصاب پر شبنم کا کام کیا۔ اتنی دوٹوک اور اتنی سامنے کی بات آنکھ سے اوجھل رہے تو راستے تاریکی میں گم نہیں ہوں گے تو اور بھلا کیا ہوگا؟ اُن کے فکر کی ضیا نے اُس کے اندر کا وہ اندھیرا مٹا کر رکھ دیا جس کے سبب وہ ٹامک ٹوئیاں مارنے پر مجبور تھا۔

اُس کے اندر ایک خفتہ سوال نے سر اُٹھایا۔ اُس نے موقعہ غنیمت جانا اور عرض کی۔

''آپ نے ایک جگہ لکھا ہے۔ پیار، محبت، عشق کے بعد عقیدت کا مرحلہ آتا ہے اور عقیدت کی منزل پا لینے کے بعد وجدان حاصل ہوتا ہے۔ اس بات کی وضاحت فرما دیں۔''

اس پر اُس کے مراد نے اپنے مخصوص تبسم ریز لہجے میں کہا۔

''مٹی میں مقید تفکر کا ایک پیٹرن ہے، تفکر کے اس پیٹرن کو کائناتی نظام کی روشنیوں سے فیڈ کیا جاتا ہے۔ تفکر کے اس پیٹرن میں یہ روشنیاں لہریں بن کر کام کرتی ہیں۔ انسان میں یہ لہریں ایک کرنٹ کی مانند دور کرتی ہیں۔ ہر انسان کے اندر قدرتی طور پر یہ تقاضا کام کر رہا ہے کہ وہ اپنی تسکین کے لئے دوسرے کرنٹ کا متلاشی رہتا ہے۔ اس تلاش کو ہی انسان اپنی زبان میں پیار کا نام دیتا ہے۔ پیار میں کشش سے محبت جنم لیتی ہے۔ محبت طلب کا ایک روپ ہے۔ محبت انسان کو اونچ نیچ کے دائرے میں قید رکھتی ہے۔ معاشرے کی متعین حدود محبت کو پابند کرتی ہیں۔ محبت کا جوش سمندر کا جھاگ بن جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہوتی ہے جس میں نہ تو بندہ سانس لے سکتا ہے اور نہ تیر سکتا ہے۔

محبت میں کچھ لو اور کچھ دو کا اصول کار فرما رہتا ہے۔ جب تک لو اور دو کا عمل رہتا ہے تو یہ عشق نہیں ہوتا۔

عشق متعین حدوں سے آزاد ہونے کو ترجیح دیتا ہے۔ عشقِ حقیقی ہو یا مجازی، دونوں کی ابتدا محبت سے ہوتی ہے۔ اگر محبت نہ ہو تو عشق کے دائرے میں داخل ہونا محض ایک مفروضہ ہے۔

حضرت اویس قرنیؓ عشق کی وہ واحد مثال ہیں جو آج تک نوع انسانی پیش کر سکی ہے۔ جیسا عشق انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کیا، آج تک ویسا عشق کرنے کا اعزاز کسی اور کے حصے میں نہیں آ سکا۔

عشق میں بندے کے اندر صرف یہ تقاضا ابھرتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کے لئے کیا کر سکتا ہے اور مجھے اُس کے لئے کیا کرنا چاہیے۔ عشق کے بعد بندہ عقیدت سے روشناس ہوتا ہے۔ یہ محبت کا وہ درجہ ہے جہاں ہر آرزو، حتیٰ کہ آرزوئے وصل بھی دم توڑ دیتی ہے اور بندہ اپنے محبوب کی رضا پہ راضی رہنا سیکھ لیتا ہے۔ محبوب کے اشارۂ چشم و ابرو پہ حرکت کرنا اُس کے لئے سعادت بن جاتی ہے۔ عقیدت کے بعد وجدان کا درجہ آغاز ہوتا ہے۔ وجدان میں صاحبِ وجدان خلوص و ایثار کا پیکر بن جاتا ہے۔ وہ وفا اور آگہی کا ایک ایسا نمونہ بن جاتا ہے جسے وجدانی طور پر اس بات کا احساس رہتا ہے کہ اُس کا محبوب اُس سے کیا چاہتا ہے؟

اُس نے اُن کے ان بصیرت افروز کلمات کو سُنا۔ اُس کو ایک انشراح اور بالیدگی کا احساس ہوا۔ اُس وقت اُس کے محسوسات کچھ یوں تھے گویا وہ کسی بلند عمارت کی چھت پر پہنچ گیا ہے اور اس بلندی کے سبب اُس کی نظر کا دائرہ بڑھ گیا ہے اور افق کی حدیں وسیع تر ہو گئی ہیں۔ اُس کھلے پن کے احساس کا لطف لیتے ہوئے اُس نے قرآن حکیم میں سورہ آل عمران کی اُس آیت کی بابت سوچا جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے اس شرط پر پیار کرنے کا وعدہ کیا ہے کہ وہ اُس کے محبوب ترین بندے کا اتباع کریں۔ لیکن بندوں پر خود سے پیار کرنا فرض نہیں کیا۔ اُس نے سوچا کہ وہ

اس بات کو کس طرح پوچھے۔ اُس نے نہایت احتیاط سے الفاظ کا چناؤ کرتے ہوئے جب پوچھا تو ایک اور ہی زاویہ کھل گیا۔ اُس نے عرض کی۔ کیا عشق مجازی میں بھی وجدان کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے؟

اُس کے مرشد کریم اُس کی اصل الجھن سے خوب واقف تھے تبھی تو انہوں نے اُس کو یہ ساری بات تعلیم کی تھی۔ اُس کی بات سن کر انہوں نے اُس کو سمجھانے کے انداز میں کہنا شروع کیا۔

"یہ جو ابھی ہم نے طلب اور کشش کی بات کی، آپ اس پہ غور کریں۔ یہ طلب اور کشش انسانی ذہن میں چپک کا باعث ہے۔ یہ چپک ہی تو ہے جو انسانی ذہن کو کبھی ایک چیز اور کبھی دوسری شے سے چپکا دیتی ہے۔ اگر انسان اس چپک کو دنیاوی، مادی، فانی اور تغیر پذیر اشیاء کے لئے بروئے کار لاتا ہے تو اُن متغیر، فنا ہونے والی مادی اور دنیاوی چیزوں کے اثرات ذہن میں منتقل ہوتے ہیں۔ مادی اور تغیر پذیر اشیاء میں دل لگانے کا یہی نقصان ہوتا ہے کہ اُن اشیاء کی طرح، اُن کے اثرات بھی قائم پذیر نہ ہونے کے سبب ختم ہو جاتے ہیں۔ ذہن کی ساری تگ و دو ضائع ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر اس فطری تقاضے کو، ذہن کی اس چپک کو لافانی، لامتغیر اور ابدی چیزوں پہ مرکوز و مرتکز کر لیا جائے تو اب جو اثرات ذہن کو منتقل ہوں گے وہ نہ صرف یہ کہ دیرپا، غیر متبدل اور لامتغیر ہوں گے بلکہ قائم بھی رہیں گے۔ قرآن کی تعلیمات کا خلاصہ یہی تو ہے کہ بندہ دنیا کی بے ثباتی کو سمجھے اور قائم رہنے والی۔۔ آخرت کی زندگی کو اپنانے کی طرف متوجہ رہے۔"

اس کے بعد انہوں نے انسانی ذہن کی اس چپک کے حوالے سے ایک واقعہ سنایا کہ حضرت فرید الدین عطارؒ ایک بہت بڑے روحانی بزرگ تھے۔ فقیری میں آنے سے پیشتر عطر کا کاروبار کرتے تھے۔ ایک روز ایک گداگر کاسۂ گدائی لئے اُن کی دکان پر آیا اور اُن سے مختلف چیزوں کے متعلق پوچھنا شروع کیا۔

اُس وقت فرید الدین عطارؒ مصروف تھے۔ اُن کو اُس وقت اُس کی مداخلت ناگوار گزری۔ انہوں نے اُس کو ٹالنا چاہا۔ لیکن وہ فقیر اڑا رہا۔ بالآخر انہوں نے اُس فقیر کو جھڑک دیا۔ اُس پہ اُس فقیر نے کہا میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں چپک بہت ہے۔ تم نہ جانے مرو گے کیسے؟

فرید الدین کو یہ بات اور بھی ناگوار گزری۔ انہوں نے کہہ دیا۔ جیسے تم مرو گے ہم بھی مر جائیں گے۔ تم یہاں سے جاتے ہو یا میں تمہیں دھکے مار کر نکلواؤں۔۔ اس پر فقیر بہت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ کیا تم ویسے مر سکتے ہو جیسے میں مروں گا؟۔۔ یہ لو دیکھو۔۔ میں مرنے چلا۔

یہ کہہ کر اُس فقیر نے اپنا کاسئہ الٹایا۔ وہیں دکان کے سامنے بازار میں سر کے نیچے اپنا کاسئہ رکھ کر سیدھا لیٹ گیا۔ کلمہ پڑھا اور کہا۔ ''اچھا بھائی خدا حافظ۔۔ ہم چلے۔'' اور یہ کہہ کر اُس نے آنکھیں موند لیں۔ حضرت فریدؒ پہلے تو یہ سمجھے کہ یونہی مکر کر رہا ہے۔ پاکھنڈی کوئی نیا ڈھونگ رچا رہا ہے۔ لیکن جب کافی دیر ہو گئی اور لوگوں نے جا کر دیکھا تو وہ فقیر سچ مچ اوپر سدھار چکا تھا۔

اس واقعے نے حضرت فرید عطارؒ کی زندگی میں ایک ایسا انقلاب برپا کر دیا کہ آج صدیوں بعد بھی جب اُن کا تذکرہ ہوتا ہے تو ذہنوں میں اُن کے لئے عقیدت و احترام کی لہریں دور کرتی ہیں۔

یہ بات سن کر اُس کو اپنے اندر ایک عجیب سی اتھل پتھل کا احساس ہونے لگا۔ جن باتوں کو سلجھانے میں اُس کو اتنی دشواری ہو رہی تھی انہوں نے اُن کو کس قدر آسان انداز میں، کس قدر سہولت کے ساتھ، ایسا سلجھا دیا تھا کہ اب اُن کے الجھنے کا کوئی امکان نہ رہا تھا۔ عقل و دانش کی فریب کاریوں نے سیدھی سادھی بات کو کس قدر پیچیدہ اور گھمبیر بنا کر لوگوں کی دسترس سے باہر کیا ہوا ہے۔ وہ دیر تک اپنے سامنے موجود، معصومیت سے آراستہ چہرے پر پھیلی

مسکان کو دیکھتا اور اُسے اپنے اندر اتارتا رہا۔ اُن کی کہی گئی باتوں سے سیراب ہوتے، عشق، محبت اور وفا کے حوالے سے وہ اپنے اور اُن کے مابین تعلق کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا میں اپنے مرشد سے پیار کرتا ہوں؟

یہ سوال اُس کے اندر ایک استعجاب بن کر ابھرا۔ اُس نے دل ہی دل میں اس کا جواب اثبات میں دینا چاہا لیکن اندر سے کسی نے اُس کو ''ہاں'' کہنے سے روک دیا۔ اُس نے خود کو دلائل سے قائل کرنا چاہا۔ میں اتنی دور سے اُن ہی کی خاطر آیا ہوں۔ مجھے اُن کی باتیں اچھی لگتی ہیں، مجھے وہ خود کتنے اچھے لگتے ہیں۔

اس کے اندر سے ایک آواز ابھری لیکن یہ تو سب تمہاری اپنی طلب اور غرض ہے۔ اُن سے پیار کا ثبوت نہیں۔ ابھی وہ اسی گومگو میں تھا کہ وہاں موجود کسی خاتون نے اپنا کوئی مسئلہ بیان کرتے ہوئے اُس سے داد رسی چاہی۔ مسئلہ کیا تھا؟ اپنے خیالوں میں مصروف ہونے کے سبب وہ سن نہیں پایا تھا لیکن اپنے مراد کی آواز نے اُس کو ادھر متوجہ کر دیا۔ وہ فرما رہے تھے۔

''میں نے آپ سے کہا تھا کہ غصہ نہ کیا کریں۔ اگر آپ کو مجھ سے محبت ہوتی تو میرے کہنے کا اثر لیتیں اور غصہ کرنا چھوڑ دیتیں۔''

اُس کو یہ بات سُن کر ایسا لگا گویا یہ بات انہوں نے اُسی کے اندر پھدکتے سوال کے جواب میں کہی ہے۔ اُس کو اتنی شرم آئی کہ اُس کا جی چاہا کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اُس میں گم ہو جائے۔ خجالت سے اُس کا سر جھکا اور تھوڑی سینے پہ آٹک گئی۔ انہوں نے اتنی طویل اور جامع بات کی اُس کو یہ تک سمجھ نہیں آیا کہ حاصلِ کلام کیا ہوا؟

محبوب مان لینے کے بعد اُن کی ہر بات کی تعمیل اُس پر واجب ہو چکی ہے۔ عشقِ الٰہی کا درس دینے والوں کے پیشِ نظر بھی یہی نکتہ رہا ہوگا کہ جب لوگ اللہ سے پیار کریں گے تو اُس کی سنیں گے بھی، مانیں گے بھی اور اُس پہ عمل بھی کریں

گے۔ جب وہ اللہ کا کہا مانیں گے تو لا محالہ اللہ اُن سے پیار کرے گا۔ اپنی مخلوق سے اللہ تعالیٰ پیار تو یوں بھی کرتے ہی ہیں لیکن جب بندہ اللہ کی بات مانتا ہے تو وہ پیار کچھ مزید بڑھ جاتا ہے۔

اُس نے اپنا جائزہ لینا شروع کیا کہ اپنے مراد سے تعلق استوار ہونے کے بعد سے اب تک اُس نے کون کون سی بات اس لئے ترک کی ہے کہ وہ انہیں پسند نہیں۔۔۔ یا اُس نے وہ کون کون سی بات اپنائی ہے جو انہیں پسند ہے؟ اُس کو اپنی تہی دامنی پہ رونا آگیا۔ اُس نے اپنے بکھرتے وجود کو کبھی اتنا بے مایہ نہ دیکھا تھا۔ خجالت اور شرمندگی نے اُس کو اپنی ہی نظروں میں گرا کر رکھ دیا تھا۔ وہ ایک شکستہ دیوار کی طرح خود پہ گر کر فنا ہونا چاہ رہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ اُس کو وہاں بیٹھنے اور اپنے مراد کے سامنے رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اُس نے وہاں سے ہٹنے کا ارادہ کر لیا اور جانے سے پہلے آخری دفعہ دیکھنے کے خیال سے اُن کی طرف نظر کی ۔۔ بے بسی اور لاچارگی کی نظر۔۔۔ اپنے جرم نا اہلیت کا اعتراف کرتی نگاہوں سے اُس نے اُن کو دیکھا۔

انہوں نے نہایت شفیق سی مسکراہٹ سے اُس کو براہ راست مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو جس بات سے بھی منع کیا ہے اُس میں بندے ہی کا نقصان ہوتا ہے۔ اللہ کا بھلا کیا نقصان ہوگا؟ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے اتنا پیار کرتے ہیں کہ اُس کی کوئی حد ہی نہیں۔ حدیثِ قدسی ہے۔ اللہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ لیکن بندہ اس پیار سے واقف ہی نہیں۔ وہ ہونا ہی نہیں چاہتا۔ اگر بندہ اُس پیار سے واقف ہو جائے تو اللہ کا لاڈلا ہی نہ بن جائے۔''

اُن کی بات سُن کر اُس کو یوں لگا کہ اُس کے وجود کی بکھرتی کرچیاں انہوں نے اپنی شفقت سے سمیٹ کر اُس کو واپس جوڑ دیا ہے۔ انہوں نے اُس کے ٹوٹتے بکھرتے وجود کو کس سلیقے اور نفاست سے ''لاڈلا'' بننے کا درس دے کر

بچا لیا تھا۔ اُس نے تشکر بھری نظروں سے اُن کو دیکھا۔ وہاں اُسی ملکوتی مسکان نے اُس کا استقبال کیا جو ایک ماں کے چہرے پر اپنے جگر گوشے کو خوش دیکھ کر نہال ہونے کے ثبوت کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔

اُس کو ڈھارس ملی تو اُس نے خفت مٹنا ے کا سامان کرنے کا عزم کیا۔ زادِ راہ کے طور اُس کو اُن ہی کی آشیر باد چاہیے تھی۔ اُس نے بہت سنبھل کر دریافت کیا۔ ”حضور یہ دوئی کیا ہوتی ہے؟ کیا دوئی ختم ہو سکتی ہے؟ پھر اپنے نکتہ نظر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا مطلب ہے کہ ایک ماں اپنی اولاد سے یا اولاد اپنی ماں سے کتنا ہی پیار کرے۔۔۔ یا جیسے ایک مرید اپنے مراد کو کتنا بھی کیوں نہ چاہے۔ لیکن ماں تو ماں ہی رہتی ہے ۔۔۔بیٹا بیٹا ہی رہتا ہے۔۔ مرید مرید ہی رہتا ہے۔۔ مراد مراد ہی رہتا ہے۔۔۔ تو یہ جو تصوف اور سلوک میں دوئی کا خاتمہ ہو جانے کا اتنی شدومد سے تذکرہ کیا جاتا ہے۔۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟“

اس پر انہوں نے تکیے پہ ٹیک لیتے ہوئے کہا۔ یہ بات درست ہے کوئی کچھ بھی کر لے۔۔ ایک وجود دوسرے وجود میں سما کر فنا نہیں ہو جاتا۔ آپ اس بات کو یوں سمجھیں کہ اگر آپ اپنے مراد کے حکمکی تعمیل اس طرح کرتے ہیں جیسے کسی استاد کے، باپ کے یا ماں کے حکم کی تعمیل کی جاتی ہے تو حکم کی تعمیل تو ہو جاتی ہے۔ لیکن اب اگر آپ اُس حکم کی تعمیل اس طرح سے کریں کہ وہ حکم خود آپ کی خواہش بن جائے تو اب جو تعمیل ہو گی وہ ہر لحاظ سے مکمل ہو گی۔۔ یعنی جب مراد کی خواہش مرید کی خواہش بن جائے، مراد کی پسند مرید کی پسند بن جائے تو کہا جاتا ہے کہ اب دوئی نہیں رہی۔ اسی طرح جب کوئی بندہ، اللہ کی رضا کو جان کر، اُس کو سمجھ کر، اُس کو مان کر، خود پہ اس طرح نافذ کر لیتا ہے کہ وہ خود اُس بندے کی خواہشِ قلبی بن جائے تو اب کیا دوئی باقی رہ سکتی ہے؟

اُس نے احسان مندی سے سرشار نظروں سے اپنے مراد کی طرف دیکھا اور سوچا۔ بار الٰہہ ! تیرا شکر کہ تو نے مرشد کامل تک رسائی نصیب فرمائی۔ اب مجھے یہ توفیق دے کہ میں ان کی طرزِ فکر کو اپنا سکوں۔ (آمین)

ماں کا مقام

وہ کئی روز سے بخار میں مبتلا تھا۔۔ اُس وقت بھی اُس کا بدن بخار کی حدت سے پھنک رہا تھا۔ اُس کے حواس پر ایک دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ جب بخار میں کمی ہوتی تب بھی وہ بستر پہ لیٹا چھت کو تکت رہتا۔ لیکن جب بخار کی شدت اُس کو اپنی لپیٹ میں جکڑ لیتی تو بے اختیاری میں اُس کے منہ سے ہائے نکل جاتی اور کبھی کبھی تو وہ ہائے اماں پکار اٹھتا۔

اُس وقت اُس کی بیوی جان جاتی کہ اُس کا بخار اُس کے سر کو چڑھ رہا ہے۔ وہ ٹھنڈے پانی میں بھیگی پٹیاں رکھنا شروع کر دیتی۔ ڈاکٹر کو بلا لاتی اور اُس کو تجویز کردہ دوائیں بھی دیتی۔ بچے اسکول سے آ کر اُس کے کمرے میں آجاتے۔ باپ کو بیمار دیکھ کر اپنے چہروں پر سنجیدگی کا نقاب اُوڑھ لیتے۔ اُن کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کریں تو کیا کریں۔

کسی بیمار کے لئے کوئی کر ہی کیا سکتا ہے؟ بیمار اپنی ہی کسی غلطی، کوتاہی یا بے احتیاطی کے سبب بیمار ہوتا ہے اور اُس کا مرض اُس کی اپنی قوت ارادی، ہمت اور یقین سے ہی دور ہو سکتا ہے۔ اُس کے لواحقین محبت ہوتا ہے تو اپنے لگاؤ اور تعلق کا اظہار کرنے کو اُس کا سر یا پاؤں دبانے کی اجازت طلب کرتے ہیں یا ڈاکٹر یا حکیم کا نام تجویز کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مجرب اور آزمودہ تجربات سنانے بیٹھ جاتے ہیں۔ اکثر اپنے زورِ علم کا اظہار علاج کے مختلف انداز اور طریقے کر کے بھی کرتے ہیں۔

اُس وقت وہ کمرے میں تنہا تھا۔ اُس نے اُس اکیلے کمرے میں ایک بے کلی سی محسوس کی۔ اُس کا منہ خشک ہو رہا تھا۔ اُس نے ہونٹوں کو تر کرنے کے لئے زبان ہونٹوں پر پھیری۔ ہونٹوں پر جمی پپڑیوں نے اُس کو احساس دلایا کہ وہ کمزور ہو چکا ہے۔ اُس نے کروٹ لی۔ پہلو بدل کر اُس نے آنکھیں موند لیں۔ نہ جانے وہ اُس حالت میں کتنی دیر رہا۔

اچانک اُس نے اپنے ماتھے پر نرم نرم انگلیوں کا لمس محسوس کیا۔ اُس لمس میں نرمی، شفقت اور محبت رچی ہوئی تھی۔ یہ جانا پہچانا لمس تھا کہ وہ بند آنکھوں کے باوجود یہ جان گیا کہ یہ اُس کی ماں کا ہاتھ ہے۔ اُس نے اپنے احساس کی تصدیق کو آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اُس کے سامنے اُس کی والدہ موجود تھیں۔ ماں کو اپنے ساتھ دیکھ کر اُس کے اندر ایک لہر سی ڈور گئی۔ اُس لہر میں خوشی بھی تھی لیکن اُس کے ساتھ ہی اُس کے اندر نقاہت کا احساس بھی بڑھ گیا۔ جیسے کسی ڈوبتے ہوئے آدمی کی ہمت اُس وقت بالکل جواب دے جاتی ہے جب وہ دیکھ لیتا ہے کہ مدد آن پہنچی ہے۔ اُس کو اُس وقت بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوا۔ اُس کو خوشی سے طاقت ملنے کی بجائے نقاہت غالب آنے کی وجہ یہی سمجھ میں آئی کہ وہ اپنی ماں کی انتہائی توجہ کا طلب گار ہے۔

''اب کیسے ہو؟۔۔ ماں کی آواز میں فکر مندی گھلی ہوئی تھی۔ اُس نے جواب دینے کی بجائے آنکھیں موند لیں۔ ماں کی بات کا جواب نہ دے کر اُسنے اپنی نقاہت اور لاغری کا جو اعلان کیا ماں کو اُسے سمجھنے میں نہ کوئی دشواری ہوئی اور نہ کوئی دقت۔ اُس کی بیوی نے اُس کے بیمار ہونے، اپنی خدمت کرنے، ڈاکٹر کی رائے اور دی گئی دواؤں کی تفصیل اُن کو بتائی۔ وہ آنکھیں موندے اُس کو سنتا رہا۔ اُس کی والدہ اس دوران کئے اور نہ کئے جانے والے اقدامات پر ساتھ ساتھ اپنا تبصرہ کرتی رہیں۔

اُس کی والدہ اُس کی بیماری کی اطلاع پا کر اُس کی عیادت اور تیمار داری کے لئے آئی تھیں۔ اُن کی موجودگی سے اُس کو طمانیت اور تقویت کا احساس ہو رہا تھا۔ اُن کے چہرے پر فکر مندی دیکھ کر اُس کو اپنائیت کا ایک جانفزا احساس ہو رہا تھا۔ اُسروز وہ تمام رات اُس کے سرہانے بیٹھ کر گزارنا چاہ رہی تھیں۔ اس پر اُس نے انہیں تسلی دی کہ

اب اُس کی طبیعت کافی سنبھل گئی ہے لہذا وہ سو جائیں۔ اگر اُس کو ضرورت ہوئی تو وہ انہیں جگا لے گا۔ کچھ رد و کد کے بعد وہ اس شرط پر مان گئیں کہ وہ اسی کے کمرے میں ہی سوئیں گی۔

رات گئے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں چلتے نائٹ بلب کی روشنی میں وہ اپنے پلنگ کے قریب لیٹی ماں کو دیکھنے لگا۔ سوتے میں بھی اُن کا رُخ اُس کی طرف تھا۔ اُس وقت اُس کو اپنی طبیعت کافی بہتر محسوس ہوئی۔ ذہن بخار کی دھند سے نکل چکا تھا۔

سوئی ماں کے چہرے کو دیکھتے دیکھتے وہ خیالوں کی وادی میں اترتا چلا گیا۔ ماں میرا کتنا خیال رکھتی ہے، مجھے کتنا چاہتی ہے۔ بچپن سے لے کر آج اُس وقت تک جب وہ خود ایک باپ بن چکا ہے۔۔ زندگی کے ہر ہر موڑ پر انہوں نے کس قدر محسوس اور غیر محسوس انداز میں اُس کی مدد کی۔ جب وہ اسکول جانے کے قابل ہوا تو ماں نے کس قدر ذوق و شوق سے اُس کا بستہ تیار کیا۔ خود اُس کو تیار کیا، اُس کو اسکول بھجوایا۔ وہ ہر گز گھر سے باہر نہیں جانا چاہتا تھا لیکن انہوں نے اُس کو بھجوا کر ہی دم لیا تھا۔ زندگی کے پندرہ سولہ سال اُس نے درس گاہوں کی نظر کیے۔ اُن تمام سالوں کے ہر دن پر کسی نہ کسی صورت اُس کی ماں کی چھاپ ضرور تھی۔

اُس کو صبح ناشتہ تیار ملتا، کپڑے دھلے ہوئے تیار ملتے اور اگر کسی روز کسل مندی سے اُس کو اُٹھنے میں دیر ہو جاتی تو وہ اُس کو بیدار کرنے پہنچ جاتیں۔ پھر جب اُس کو نوکری ملی تو بھی ماں ہی اُس کو کھانا دیتی، اُس کے میلے کپڑے دھوتی، اُس کے لئے بازار سے ضرورت کی چیزیں خریدتی۔ پھر کس قدر چاؤ سے انہوں نے اُس کے لئے لڑکی پسند کی، اُس کی شادی کروائی اور شادی کے تمام انتظامات کروائے۔ اُس کے یہاں پہلا بچہ پیدا ہوا تو وہ اُس سے بڑھ کر خوش

ہوتی رہیں۔ اُس نے اُن سے پوچھا۔ امی آپا تنی خوش کیوں ہو رہی ہیں۔ یہ آپ کا بیٹا نہیں پوتا ہی تو ہے۔ اس پر اُنہوں نے کہا تھا۔ ''مول سے بیاج پیارا ہوتا ہے۔''

اب جب کہ اُس کے بچے بڑے ہو کر سکول جانے لگے تھے، وہ جب بھی اپنی والدہ سے ملنے اُن کے پاس جاتا تو وہ اُسے دیکھتے ہی پوچھتیں۔ ''تم نے کھانا کھایا ہے یا نہیں؟ میں نے یہ سوئیاں بنائی ہیں، تھوڑی سی کھالو۔'' اُن کی یہ باتیں اُن کر وہ دل ہی دل میں ممتا کو خراجِ تحسین پیش کرتا۔ کبھی کبھار اُن کے سامنے کہہ بھی دیا کرتا تو وہ ہنستے ہوئے کہتیں۔ ''چل رے رہنے دے۔ تو مجھے مسکہ مت لگا۔''

یہ ماں بھی کیا چیز ہوتی ہے؟ کسی انسان کے ہونے کی وجہ بھی اور سبب بھی۔ اُس کو اپنے مرشد کا کہا ہوا ایک جملہ یاد آگیا۔ ''عورت کا اصل محبوب اُس کی اولاد ہوتی ہے۔''

اُس کو اپنے باپ کا پیار اور شفقتیں بھی حاصل رہی تھیں لیکن جو والہانہ پن اور بے ساختگی اُس کو اپنی ماں کے پیار میں نظر آتی تھی وہ اُس کے باپ کے پیار میں کسی اور رنگ اور روپ میں محسوس ہوتی تھی۔ اُن کے پیار میں ایک لئے دیئے رہنے کا انداز کا اور کیفیت ہوتی جب کہ ماں کی ممتا اُس کو خود پر محیط اور گھیرے میں لئے رکھنے والی محسوس ہوتی اور وہ بھی اس قدر کہ بعض اوقات تو چڑ کر رہ جاتا۔

وہ گھر سے باہر جاتا اور واپسی میں تاخیر ہو جاتی تو گھر داخل ہوتے ہی اُس کی ماں کا پریشان اور متفکر چہرہ اپنا منتظر ملتا۔ وہ منہ سے کچھ کہے بنا ہی اُس کو شرمندہ کر دیتیں۔ ''کہاں رہ گئے تھے۔ تمہیں شرم نہیں آتی ماں کو پریشان کرتے ہو۔'' باپ اُس گھرکتا تو وہ اور بھی الجھ کر رہ جاتا۔

وہ ماں سے کہتا۔ ''اب میں بڑا ہو گیا ہوں، آپ مجھے رسی سے باندھ کر گھر میں نہیں رکھ سکتیں۔ آپ کو کیا معلوم باہر کیا حالات ہوتے ہیں، ہمیں اُن سے نپٹنے کو کیا کچھ کرنا ہوتا ہے۔ میرے دوست احباب ہیں۔ مجھے کوئی کام بھی کرنا ہوتا ہے۔ آپ بلاوجہ پریشان ہوتی ہیں۔'' وہ گھر سے باہر جانے اور باہر رہنے کے جواز تراشتا اور ماں سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی انجان سی بنی کہتیں۔ ''تم اپنی چالاکیاں رہنے ہی دو۔ بڑا آیا کاموں والا۔''

وہ اُس کو ہر سہولت میسر کرنا اپنا فرض گردانتیں اور وہ اُن کی مہیا کردہ ہر سہولت کو اپنا حق سمجھ کر برتتا۔ یہاں تک کہ کبھی اُس کو خود اپنے کپڑے استری کرنے پڑ جاتے تو اُس کا موڈ آفسا ہو جاتا۔ وہ بقول اپنے والد کے بلیک میلنگ پر اتر آتا۔ ''کسی کو میرا خیال ہی نہیں، مجھے کوئی چاہتا ہی نہیں، میں کسی کا کیا لگتا ہوں کہ کوئی میرا خیال رکھے۔'' لیکن اُس کی ماں نے اُس کو کبھی نہیں جتایا کہ وہ کس قدر خود غرض ہے۔ خود اُس نے اپنی ماں کے لئے کبھی کیا کیا ہے؟

شاید ماں کی اسی اعلیٰ ظرفی ہی کے پیشِ نظر حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تھا۔ ''جنت تمہاری ماں کے قدموں تلے ہے۔'' اُس کی سوچ یہاں آکر رک گئی۔ اُس نے اس حدیث مبارکہ کو اپنے ذہن میں کئی بار دہرایا۔

اس حدیث مبارکہ سے تو جنت جیسے اعلیٰ مقام کی ذم کا پہلو نکلتا ہے۔ جنت کا ماں کے قدموں تلے ہونا۔۔ پیروں تلے روندی ہوئی چیز ہونا ہی ہوا۔۔ اور جو چیز پیروں تلے ہو بھلا اُس کو کیا مقام اور اہمیت ہوئی؟ شاید جنت کی تحقیر سے آپ ﷺ شعور انسانی کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ جنت کو زیادہ اہمیت نہ دیں لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے قرآن میں تو جنت ہی کی فضیلت اور اہمیت بتا کر اُخروی زندگی کی بنیاد درست کرنے کا حکم ہے۔ اُس

نے سر کو جھٹکا دیا۔ لاحول ولا قوۃ۔۔ یہ میں کن سوچوں میں غلطاں ہو رہا ہوں۔اُس نے خیال کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے کروٹ لی۔ اُس کے کروٹ لینے سے کپڑوں میں سرسراہٹ کی آواز کے ساتھ ہی اُس کو اپنی ماں کی آواز آئی۔

"کچھ چاہیے تو نہیں؟"۔۔آواز اتنی بلند تھی کہ اگر وہ جاگ رہا ہو تو سن لے اور اگر سویا ہوا ہو تو اُس کی نیند خراب نہ ہو۔ احتیاط اور فکر مندی کا یہ امتزاج وہ ہمیشہ سے دیکھتا چلا آرہا تھا لیکن جس شدت اور گہرائی سے اُس نے اُس کو اُس وقت محسوس کیا تھا اس سے پیشتر کبھی نہیں کیا تھا۔۔ وہ سوتا بنا رہا۔ ماں کو اپنی طرف نگران محسوس کرتا رہا۔ پھر انہوں نے کہا۔۔"سب ٹھیک ہے۔" محسوس کر کے ایک گہری سانس لی اور آنکھیں موند لیں۔ وہ اُن کی طرف کمر ہونے کے باوجود اُن کی کیفیات محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

کچھ ہی دیر میں خیال کی رو پھر جنت کے ماں کے قدموں کے نیچے ہونے کی طرف بہہ نکلی۔ وہ سوچنے لگا۔اس بات کا اصل مفہوم کیا ہو سکتا ہے؟ جب شوہر بیوی سے لڑ جھگڑ رہا ہو اور عورت سہمی ہوئی یہ محسوس کر رہی ہو کہ اُس کے قدموں تلے سے زمین کھسکی جا رہی ہے تو ایسے میں اُس کے بچے کیا محسوس کریں گے۔ جس عورت کے قدموں تلے زمیں کھسک رہی ہو وہ جنت کو کیا سنبھالے گی اور اُس کے بچے اپنی ماں کے قدموں تلے کھسکتی زمین کی خیر منائیں گے یا اُس جنت کا دھیان رکھیں گے جو انہوں نے کبھی دیکھی ہی نہیں۔ لہراتا ہوا خیال ایک کریہہ سوال بن کر اُس کے اندر اچھلنے لگا۔

اُس نے اس حدیث کے مفہوم کو اپنے حافظے میں ٹٹولا۔ اُس کو یاد آیا کہ اُس نے کہیں پڑھا تھا کہ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی ماں کی خدمت کرو تا کہ جنت میں مقام حاصل ہو سکے۔ آج تک وہ اپنے ذہن میں اسی مفہوم کو لئے ہوئے تھا۔ لیکن آج نہ جانے کیسے اُس کے اندر ایسی کیا کیفیت در آئی تھی کہ وہ اُس کا تجزیہ کرنے بیٹھ گیا۔

ایک بچہ اپنی ماں کی بھلا کیا خدمت کر سکتا ہے ؟ ماں کے لئے کبھی اُس نے کھانا پکایا ؟ کبھی اُس کے کپڑے دھوئے یا اُس کی ضرورتوں کا اُس طرح سے خیال رکھا جس طرح اُس کی ماں کرتی ہے ؟ ایک بچہ تو ساری زندگی اپنی ماں سے اپنی خدمت کرواتا ہے اور ماں بغیر کوئی احسان جتائے اپنے بچوں کی خدمت میں سرگرم رہتی ہے۔ اُن کے وجود کو قائم رکھنے کے لیے اپنا خون دودھ کی صورت اُن میں منتقل کرتی ہے۔ وجود قائم ہو جانے کے بعد وہ اُن کی نشو نما اور تربیت میں جتی رہتی ہے۔ وہ سامنے ہوں تو اُن کی بہتری اور آسائش مہیا کرنے میں جتی رہتی ہے۔ سامنے نہ ہوں تو اُن کی خیریت کے لئے بے چین رہتی ہے۔ دعائیں کرتی ہے۔ اُس کا دھیان اپنی اولاد ہی کی طرف لگا رہتا ہے۔

وہ تو اللہ تعالیٰ اُس کے دل میں اپنی اولاد کے لئے پیار بھر دیتا ہے اس لئے وہ اپنی ممتا کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہے ۔ اولاد کی خدمت کرتی ہے، اُن کو اتنا چاہتی ہے۔ اُس کے شعور نے ایک جواز تراشا۔ اُس نے اس بات کو اپنے ذہن میں تولا۔ اگر ماں اپنی ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر اولاد کی خدمت کرتی ہے تو سیدھی سی بات یہ ہوئی کہ چونکہ اولاد میں اپنی ماں کے حوالے سے ایسا کوئی جذبہ اُن کو ودیعت نہیں کیا گیا ہوتا اس لئے وہ اپنی ماں کی خدمت کرنے کی نہ تو مجاز ہوتی ہے اور نہ ہی کر سکتی ہے۔ یعنی ولاد اپنی ماں کی اُس طرح سے تو کوئی خدمت کر ہی نہیں سکتی جس طرح سے ایک ماں اپنی اولاد کی خدمت کرتی ہے۔ تو پھر یہ ۔۔ خدمت کر کے جنت حاصل کرنے کی بابت میں کتنا وزن رہا۔۔ اُس کے شعور میں پڑتی گرہ اور مضبوط ہوتی چلی گئی۔

اللہ تعالیٰ نے عورت میں تخلیق کے دو رُخ رکھے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے نظامِ تخلیق کا ایسا رکن ہے جو تخلیق مین براہ راست حصہ لیتی ہے۔ وہ ایک طرف جسمانی طور پر تخلیق کرتی ہے اور دوسری طرف اپنی ذہنی صلاحیتوں سے تخلیق کاری کرتی ہے۔ تخلیقی نظام میں اللہ تعالیٰ نے اُس کو یہ رتبہ اور مقام فرمایا ہے کہ وہ اپنے جیسا دوسرا انسان وجود

میں لانے کا فریضہ سر انجام دیتی ہے۔ اُس کی تخلیقی صلاحیتیں مردوں سے بڑھ کر ہوتی ہیں۔ اُس کا یہ اعزاز ہے کہ عورت ماں بنتی ہے۔ ایک مرد خواہ وہ کچھ بھی کیوں نہ کر لے بہر حال ماں نہیں بن سکتا۔ نہ جسمانی طور پر اور نہ معنوی طور پر۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی بے پایاں محبت اور پیار کی مثال دینے کو بھی ماں ہی کی محبت کو چنا اور فرمایا ہے۔ میں اپنی مخلوق سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔

سوچ کی اس منزل پر اُس کا دھیان اس طرف مڑتا چلا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق سے محبت کا عکس عورت میں ممتا کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بھی اپنی مخلوق کی خدمت میں سرگرم عمل ہے۔ اب جیسا کہ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کی ذات اس امر سے بے نیاز ہے کہ مخلوق اُس کی کوئی خدمت کرے۔۔۔ خدمت کرنا تو کجا۔۔۔ وہ اُس کی عنایات کو پوری طرح سمیٹ لینے، اپنے اندر جذب کر لینے اور اُن کا مکمل طور پر ادراک کر لینے پر ہی قادر نہیں۔ مخلوق کی کیا مجال ہے کہ وہ اپنے رب، اپنے خالق اور اپنے مالک اللہ کی کسی خدمت کا دعویٰ کرتی پھرے۔ یہ تو وہی ہے جو پہلے ایک انسان کو انسان بناتا ہے اور پھر اُس کو کوئی کام کرنے کی توفیق عطا کرتا ہے۔ اُس کی شانِ رحیمی کی یہ ادنیٰ سی مثال ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ کسی کام کی توفیق عطا فرماتا ہے بلکہ اُس کام کی تکمیل پر اُس کام کا اجر و ثواب بھی اُسی بندے کو مرحمت فرماتا ہے جس نے وہ کام کیا ہو۔

جس طرح مخلوق اپنے خالق کی خدمت کرنے سے عاجز اور قاصر ہے، اُسی طرح اسی نسبت اور تناسب سے اولاد اپنی ماں کی کوئی خدمت کرنے کا اعزاز حاصل نہیں کر سکتی تو پھر جنت کے ماں کے قدموں تلے ہونے کا یہ مفہوم کہاں سے نکل سکتا ہے کہ اولاد اپنی ماں کی خدمت کرے گی تو جنت کی حق دار قرار پائے گی؟ اُس نے شعور میں

ابھرتے اس سوال پہ الجھن سی محسوس کی۔ اُس الجھن کی اصل وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اُس لمحے جب اُس نے ایمانداری سے اپنا احتساب کیا کہ اُس نے اپنی ماں کی آج تک کیا خدمت کی ہے تو وہ اپنی تہی دامنی پر بلک اُٹھا تھا۔

اُس نے مانا کہ چند ایک باتیں جو اُس نے اپنی ماں کے حکم کی تعمیل میں سرانجام دی تھیں وہ کسی طور بے لوث خدمت کے ضمن میں نہیں آتی تھیں بلکہ وہ محض اُس کی فرمانبرداری کا ایک ادنیٰ سا اظہار تھا۔۔ اور جو باتیں اُس نے ماں کے حکمکی تعمیل میں کبھی مانی بھی تھیں تو اُن کے ماننے میں آخری فائدہ خود اُسی کی ذات کا تھا اُس کی ماں کا نہیں۔۔ بالکل اُسی طرح جس طرح احکاماتِ خداوندی کی تعمیل سے خود انسان ہی کا بھلا نکلتا ہے، اُس کا کسی بھی طرح کا فائدہ مالکِ کائنات کو نہیں پہنچتا۔

اُس کے ذہن میں ایک کوندا سا لہرایا۔ اُس کو اپنے مرشد عالی مقام کا ایک فرمان یاد آیا۔ یہ بات انہوں نے اپنے مرشدِ کریم کے حوالے سے ارشاد فرمائی تھی کہ اللہ والا بننے کے لئے لازم ہے کہ انسان وہی کرے جو اللہ کرتا ہے اور اللہ تو اپنی مخلوق کی خدمت کر رہا ہے۔ اس لئے جو لوگ مخلوقِ خدا کی خدمت میں سرگرم رہتے ہیں، انہیں اللہ اپنا محبوب بنا لیتا ہے۔ اُس کو اپنا دوست قرار دیتا ہے۔ وہ اس بات کو جائزہ لیتے لیتے یہ سوچنے لگا کہ ماں اپنی اولاد کی خدمت کرتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُس کو اعزاز دیا ہے کہ جنت کو اُس کے قدموں تلے قرار دے دیا ہے۔ وہ یہ سوچتے سوچتے نیند کی وادی میں اتر گیا۔

صبح ہوئی تو اس کا بخار اتر چکا تھا۔ ماں نے اصرار کیا کہ وہ ناشتے میں دلیہ کھائے اور پھر دوا لے۔ اس کا اصرار دیکھ کر اس کو رات کی سوچ کے حوالے سے اپنے خیالات کا دھیان آگیا اور وہ الجھن بھی تازہ ہو گئی کہ جنت جیسی برتر

اور اعلیٰ جگہ کو قدموں کے تحت کر دینے سے کیا جنت کی تحقیر نہ ہوئی۔ اس نے چاہا کہ وہ اپنی والدہ سے اس کی بابت بات کرے لیکن وہ ایسا کر نہ سکا۔

کئی روز وہ اسی ادھیڑ بن میں رہا۔ ایک روز مراقبہ کے دوران اس کو ایک عجیب سی بات محسوس کی۔ اُس کو یوں لگا گویا وہ الٹا ہو گیا ہے اور ہر چیز کو اسی حالت میں دیکھ رہا ہے۔ اس کو اچنبھا سا ہوا کہ یہ کیا ہوا۔ اس اچنبھے کی کیفیت سے اس کے شعور کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اُس نے مراقبہ ختم کر دیا لیکن وہ اسی گومگو میں رہا کہ یہ کیا ہوا؟ وہ اس کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک اس کو یہ بات سمجھ آگئی کہ اُس کو یہ اشارہ ملا ہے کہ شعور ہر چیز کو الٹا دیکھتا ہے۔ انسان زمین سے پیروں کے بل الٹا لٹکا ہوا ہے لیکن خود کو سیدھا دیکھتا ہے۔ سیدھا سمجھتا ہے۔ یہی حال انسان کے باقی ہر مشاہدے کا ہے۔

اُس نے اس نتیجے پر پہنچ کر جب اپنی الجھن کا جائزہ لیا تو مسرت سے کھل اُٹھا۔ اس نے دریافت کر لیا تھا کہ حدیث مبارکہ کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ماں کا مقام جنت سے اوپر ہے۔ یعنی یہ ہمارے دیکھنے کا زاویہ ہے کہ اگر ہم جنت کو ماں کے قدموں تلے دیکھیں گے تو اس کو نیچے کی طرف دیکھنے کے باعث ہمیں محسوس ہو گا گویا جنت کی تحقیر ہو رہی ہے لیکن اگر ہم خود نیچے ہوں اور جنت کو اوپر دیکھیں تو ماں کا مقام جنت سے بالا تر ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اُس سے ستر گنا اوپر فائز اور قائم ہیں۔

اس نتیجے پر پہنچ کر اس کو طمانیت کا جانفزا احساس ہوا اور اس نے سوچا کہ اسی لئے قرآنِ حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ”جب تمہارے والدین بوڑھے ہو جائیں تو انہیں اُف بھی مت کہو اور ان کے لئے دعا کیا کرو کہ اے اللہ تو ان کے ساتھ اسی شفقت اور کریمی کا برتاؤ فرمانا جس طرح صغر سنی میں انہوں نے میرے ساتھ کیا تھا۔

ایک روز وہ اپنی والدہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی تیمارداری پہ اُن کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اُس نے اِس حوالے سے اپنی حاصل فکر کو بتا کر ماں سے پوچھا کہ ۔''جب اللہ تعالیٰ نے عورت کو اتنا بلند مقام عطا فرمایا ہے تو پھر اس کی وجہ ہے کہ عورت کو ہم اِس گری ہوئی حالت میں پاتے ہیں جس کا آج وہ شکار ہے۔''

اس کی والدہ نے ایک لحظہ توقف کر کے بیٹے کو دیکھا۔ اُس دیکھنے میں اُس کو دو باتیں محسوس ہوئیں۔ اُس کو دیکھنے میں اُس کو ستائش اور ممنونیت دونوں گھلی ملی لگیں۔ اُنہوں نے ایک مختصر سا جملہ کہا۔''عورت نے اپنا مقام حسد کے ہاتھوں کھویا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھیں اور کہا۔''ٹھہرو میں نے تمہارے لئے سویاں پکائی ہیں۔ کھا کر جانا۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئیں اور وہ وہیں بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔

''عورت نے اپنا مقام حسد کے ہاتھوں کھویا ہے۔''

یہ جملہ اُس کے شعور میں تحیر پھیلاتا چلا گیا۔ حسد کی تباہ کاریوں کا دائرہ اتنا پھیلاؤ رکھتا ہے کہ آج عورت ماں ہوتے ہوئے بھی تماشا بن کر رہ گئی ہے۔ اُس کے اعصاب چٹخنے لگے۔ امہات المؤمنین کے بلند مرتبت قرار دیئے جانے کی ایک وجہ یقیناً یہی رہی ہو گی کہ وہ حسد کا شکار نہیں ہو سکی تھیں۔ حسد کا شکار ہونے والے تنگ نظری کے علاوہ

انانیت کے مریض بن جاتے ہیں۔ دوسرے کو خوش دیکھنا اُنہیں ناگوار گزرتا ہے اور قوانینِ فطرت کی زد میں آکر وہ جس آگ میں جلتے ہیں، وہ انہیں ہر طرح سے سوخت کر دیتی ہے۔ اس لئے تو جن جن اشیا کے شر سے پناہ طلب کرنے کا حکم قرآن حکیم میں مذکورہ ہوا ہے اُن میں سے حاسدوں کے شر کو جب کہ وہ حسد کریں کو واضحطور پر بیان کیا گیا ہے۔ ایک عورت دوسری عورت کو نیچا دکھانے کے چکر میں حسد کا شکار ہو کر اپنا مقام کھو رہی ہے۔

جب عورت ہی عورت کی دشمن ہو گی تو کسی اور نے اُس کو کیا گرانا۔ وہ تو خود ہی خود کو گراتی چلی جا رہی ہے۔ اس حسد ہی کا ایک روپ ساس بہو کے مابین کشمکش ہے اور اسی حسد کا ایک روپ بھابھی اور نند کے مابین تلخیوں کو جنم دیتا ہے اور اسی حسد سے سوکن پنے کی جلن بھڑکتی اور گھروں کو جہنم کدہ بنا دیتی ہے۔

وہ ششدر ہوا دم بخود بیٹھا سوچتا رہ گیا۔ یہ حسد اصل میں ہے کیا کہ اس کے شر سے پناہ طلب کرنے کو قرآن پاک میں خاص طور پر ترغیب دی گئی ہے کہ اللہ سے حاسدوں کے شر کی پناہ مانگو خصوصاً جب وہ حسد کرنے لگیں۔ اُس نے سوچا کہ یہ حسد کیا ہے اور اُس سے بچنے اور خود دوسروں سے حسد کرنے سے کیسے محفوظ رہا جا سکتا ہے؟

اُس کے ذہن میں اِس کے بہت سے جواب آتے رہے لیکن کوئی بھی اُس کو اطمینان بخش محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ پھر بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ بہر حال ایک شیطانی وصف ہے۔ اُس کو جونہی یہ خیال آیا کہ یہ ایک شیطانی وصف ہے تو اُس کو محسوس ہوا کہ اُس کو ایک مطمئن کر دینے والے جواب کا سرا ہاتھ لگ گیا ہے۔ اُس نے حساب لگانا شروع کیا کہ اللہ تعالیٰ ایک بچے کی پیدائش کے بعد اُس کو بڑا ہونے اور اُس کی نشو نما کے تمام وسائل مہیا کرتے ہیں تاکہ وہ بڑا ہو سکے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو مختلف صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں تاکہ وہ اُس کو استعمال کر کے دنیا میں کوئی مقام حاصل کر سکیں۔ کوئی اُن صلاحیتوں کو استعمال کر کے تعلیم کے میدان میں آگے بڑھتا ہے، کچھ اُن کو استعمال کر کے نام ور ہونے کی تگ و دو کرتے ہیں اور کچھ ان صلاحیتوں کے ذریعے دولت مند بننے کی راہ پر چل نکلتے ہیں۔

اب کسی کا کسی بھی میدان میں آگے بڑھنا ایک تعمیری کام ہو تو کسی آگے بڑھنے والے کو روکنا یقینی طور پر ایک تخریبی حرکت ہی کہلا سکتی ہے اور تخریب بہر حال ایک شیطانی عمل کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ کسی بھی ایسی

تخریبی سر گرمی میں مصروف ہونا حسد کہا گیا ہے جو کسی کو اپنے آگے یا بہتر حالت میں دیکھ کر اُس کو روکنے اور اُس کا بُرا چاہنے پر منتج ہو حسد کہلائے گا۔ یعنی اللہ تو بدتر سے بہتر کی طرف گامزن کرتا ہے اور شیطان بہتر کو بدتر بنانے پر تلا رہتا ہے۔

اُس نے اپنی ماں کے لئے اپنے دل میں انتہائی شکر گزاری کے احساسات کو موجزن ہوتے دیکھا کہ آج اُن کے طفیل اُس کو ایک اتنی اہم بات سمجھ میں آئی۔

پانچواں رشتہ

بچے تیار ہو کر اسکول جا چکے تو وہ اُٹھ کر کھانے کی میز پر آن بیٹھا۔ بیوی ناشتہ بنا رہی تھی۔ اُس نے اخبار اُٹھا کر اپنے آگے رکھ لیا۔ اس کی نگاہ اخبار کی سرخیوں سے گزرتی ایک خبر پر آ کر رُک گئی۔ ایک عورت کو زندہ جلا دیا گیا۔ اذیت کی ایک لہر اُس کے حواس میں داخل ہوئی۔ اُس نے خبر کی تفصیل پڑھی۔ گھریلو جھگڑے کا شاخسانہ تھا۔ شوہر نے اپنی بیوی پر تیل چھڑک کر اُس کو آگ لگا دی تھی۔

اُس نے بیوی کو میز پر ناشتہ لگاتے ہوئے دیکھ کر اُس سے پوچھا۔ ''تم نے یہ خبر پڑھی ہے؟''

''کون سی خبر؟''

''یہ جو ایک عورت کو زندہ جلا دینے کے بارے میں ہے۔'' اُس نے اخبار اُس کے آگے کرتے ہوئے، اُس کو وہ سُرخی دکھاتے ہوئے کہا۔

اُس کی بیوی نے خبر پر ایک نظر ڈالی اور تبصرہ کیا۔ ''یہ مردوں ہی کے تو کام ہیں۔ کبھی کسی بیوی نے اپنے شوہر کو زندہ نہیں جلایا ہو گا۔ یہ ضرور مردانگی دکھانے کا چکر رہا ہو گا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ ہو سکتا ہے کہ بیوی ہی کی غلطی رہی ہو۔'' اُس نے دفاعی جملہ کہا۔

''ہنہ! مرد ہو نا۔ اس لئے فوراً بیوی کی غلطی ڈھونڈنے لگے۔ چلو مان لیا کہ بیوی ہی کی غلطی تھی۔ تو کیا اُس کو معاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آخر وہ اُس کی بیوی تھی۔ اُس کو شوہر پر کچھ تو ناز ہو گا۔ اُس نے اُس کو اپنا شوہر تسلیم کیا تھا تبھی تو اُن کی شادی ہوئی تھی۔ پھر کچھ بھی ہوا ہو یہ زندہ جلا دینے کی سزا؟ یہ اجازت شوہر کو کس نے دے دی؟ دنیا

کے کسی تعزیری قانون میں کسی انسان کو زندہ جلا دینے کی سزا اگر موجود ہو تو بتاؤ اور پھر غلطی کو درست کرنے کا بھلا یہ کون سا طریقہ ڈھونڈا اُس بد بخت نے۔'' اُس کی بیوی نے جذبات میں آکر اُس کے کمزور سے دفاع کی دھجیاں اُڑاتے ہوئے کہا۔

اُس کو اُس کی کہی ہوئی بات کے جواب میں کوئی بات نہ سوجھی۔ وہ خاموشی سے ناشتہ کرنے لگا۔ اُس نے سوچا اُس کی بیوی نے بات تو درست ہی کہی ہے۔ کتنی ہی بڑی غلطی کیوں نہ ہو ایسی سزا دینا تو بالکل ہی ناجائز ہے اور زندہ جلانا۔۔۔ یہ تو نرا پاگل پن اور وحشیانہ عمل ہے۔ معاشرے میں ہر طرف اتنی بے سکونی اور ہیجان پھیلا ہوا ہے کہ لوگوں کے ذہنوں نے کام کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ پریشانیوں نے عقل کو اس قدر خبط کر دیا کہ وحشتوں کو ناچنے سے روکنے کا یارا اور سلیقہ دونوں ہی مفقود ہو چکے ہیں۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ پڑوس میں کسی کے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آئیں۔ پھر اُن آوازوں میں عورتوں اور بچوں کے رونے پیٹنے کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ اُس کی بیوی نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا اور پھر یہ کہتے ہوئے باہر چلی گئی۔ ''میں جا کر دیکھتی ہوں۔''

اُس کے جانے کے بعد وہ سوچنے لگا کہ میاں بیوی میں ذہنی ہم آہنگی نہ ہو تو یہی دنگا فساد اور مار پیٹ روز کا معمول بن جاتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اللہ تعالیٰ میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیتے ہیں اور انسان اپنے لباس کو ہی نوچنے کھسوٹنے لگ جائے تو لباس اگر اُترے گا نہیں تو تار تار تو ضرور ہو جائے گا اور لوگوں کو مفت کا تماشہ ہاتھ آتا رہے گا۔ وہ تیار ہو کر بیوی کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

ایک بچہ دوڑتا ہوا آیا۔ ''آپ کو آنٹی بلا رہی ہیں۔ وہاں وہ انکل اپنی بیوی کو مار رہے ہیں۔ آپ جلدی چلیں۔ آنٹی نے کہا ہے کہ آپ آئیں اور انہیں بچائیں۔''

''میں ۔۔ میں بھلا پرائے پھڈے میں کیوں پڑوں؟ اب یہ میاں بیوی کا معاملہ ہے۔ کہیں اُس کی مداخلت سے بات اور ہی نہ بگڑ جائے۔'' اُس کا جی چاہا کہ وہ کہہ دے کہ نہیں بھئی، میں اس معاملے میں نہیں پڑ سکتا۔ لیکن پھر انسانی ہمدردی آڑے آئی۔ وہ پڑوسن اُن کے گھر کئی بار آچکی تھی۔ وہ بہت خوش مزاج اور ہنس مکھ خاتون تھیں۔ ایسی خومزاج عورت کے ساتھ مار پیٹ۔۔ اُس کا ذہن اس بات کو تسلیم نہیں کر رہا تھا۔

اُس نے پڑوسی کے گھر جا کر بچے سے کہا کہ وہاندر جا کر انکل سے کہے کہ باہر کوئی اُن سے ملنے ایا ہے اور خود زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ اُس کی یہ حکمت اور تدبیر کار گر رہی۔ پڑوسی اُسی طرح غصے کی حالت میں باہر اگیا۔

اُس نے اُس کا ہاتھ تھاما اور اُسے لے کر چل پڑا۔ اُس کا پڑوسی پہلے تو جز بز ہوتا رہا لیکن پھر رفتہ رفتہ ٹھنڈا شروع ہو گیا۔ گھر سے تیس چالیس قدم دور جا کر اُس نے اپنے پروسی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑی رسانیت سے کہا ''آپ تو بہت سمجھدار اور قابل انسان ہیں۔ آپ کے گھریلو معاملے میں مجھے مداخلت بھی نہیں کرنی چاہیے لیکن مجھے میری بیوی نے بلا لیا تھا۔ بہر حال آپ کچھ دیر میرے ساتھ بیٹھیں۔ جب غصہ اتر جائے گا تب گھر جایئے گا اور وہ اپنے پڑوسی کو لے کر اپنے گھر آگیا۔

وہ کچھ دیر بیٹھے۔ پڑوسی بولتا رہا۔ ''یہ عورت میری بات نہیں مانتی۔ جو میں کہتا ہوں وہی نہیں مانتی۔ میں اُس کو کہہ کہہ کر تھک گیا ہوں اُس کو سمجھ ہی نہیں اتی۔ اب اُس کو ہاں میں ہاں ملانا پڑی۔ بات تو واقعی درست ہے۔ بیویوں کو چاہیے کہ وہ شوہروں کی بات مانیں۔ لیکن آخر وہ کہتی کیا ہیں؟ آپ کی کون سی بات نہیں مانتیں؟ اب وہ اُس

کو وجہ بتانے کی بجائے اُس کو ادھر اُدھر کی سنانے لگے۔ ''میں اُس کا مجازی خدا ہوں۔ اللہ نے طلاق کا حق مجھے دیا ہے۔ میں جب چاہوں اُس کو چھوڑ دوں۔ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے اپنی بیویوں کو مارنے کی اجازت دی ہے۔ عورت ہوتی کیا ہے۔ پیر کی جوتی جب چاہے دوسری لے آؤ۔'' وہ چپ کر کے سنتا رہا۔ اب اگر اللہ نے بیویوں کو مارنے پیٹنے کی اجازت دہ ہوئی ہے تو بھلا کون ہوتا ہے اُس کو منع کرنے والا۔ اب جس بات پر اللہ نے اپنی بیویوں کو مارنے کی اجازت دی ہے، وہ واقعی کوئی ناپسندیدہ حرکت ہی رہی ہوگی۔ تو کیا اِن صاحب کی بیوی ایسے جرم کی مرتکب ہوگئی ہیں؟ لگتا تو نہیں کہ وہ کوئی ایسی خاتون ہوں گی۔۔ پھر بھی کیا پتہ؟ اب اُس کو کھوج ہوئی کہ آخر لڑائی اور مار پیٹ کس بات پر ہوئی۔ اُس نے اُن صاحب کو بولنے دیا۔

کچھ دیر بعد وہ صاحب کچھ ٹھنڈے سے پڑ گئے تو انہوں نے بتایا کہ اُن کا اپنی بیوی سے جھگڑا اس بات پر ہوا تھا کہ وہ اپنی بھانجی کی شادی میں شرکت کرنا چاہتی تھیں۔ جب کہ اُن کا خیال تھا کہ چونکہ اُس بچی کے باپ نے ایک بار اُن سے بدتمیزی سے گفتگو کی تھی لہذا اُس کو اپنے شوہر کی عزت کروانے کے لئے شادی میں شرکت سے انکار کر دینا چاہیے۔ اُس کو حیرت ہوئی۔ اتنی سی بات پر مار پیٹ۔۔ یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ اُس سے رہا نہ گیا۔ اُس نے کہہ ہی دیا۔ آپ دل بڑا کریں۔ یہ اتنی بڑی بات تو نہیں جس کی خاطر بیوی کو مار اپیٹا جائے اور پھر وہ محض آپ کی بیوی ہی تو نہیں آپ کے بچوں کی ماں بھی تو ہے۔ اُس کو ضرور یہی خیال رہا ہوگا کہ آج انہوں نے شادی میں شرکت نہیں کی تو کل کو جب اُن کے بچوں کی شادی ہوگی تو وہ لوگ نہیں آئیں گے۔ اب نہ جانے یہ اُس کے کہنے کا اثر تھا یا وہ صاحب خود بھی تھک چکے تھے۔ انہوں نے اقرار کیا کہ ٹھیک ہے وہ جاتی ہے تو جائے۔ میں تو نہیں جاؤں گا۔

وہ اس قضیے سے فارغ ہو کر دفتر کو چل دیا۔ ایک تو دفتر سے تاخیر ہونے پر اُس کو کوفت ہو رہی تھی اور اوپر سے اُن صاحب کی خود نمائی، خود ستائی اور ڈھٹائی آمیز باتوں کی کدورت اُس کو کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ دفتر میں اُس نے اپنے ساتھیوں سے تذکرہ کیا تو اُن کا ردِ عمل بھی اُس کو کچھ عجیب سا ہی لگا۔ ایک نے شرارت سے تبصرہ کیا۔ ''آپ کو اپنی پڑوسن کے معاملات میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ چند ایک نے کہا۔ ''اجی یہ عورتیں خدا ان کو سمجھے انہوں نے تو مردوں کا جینا حرام کیا ہوا ہے۔ کما کر بھیڑ و اور حساب بھی دو۔ ناز نخرے بھی ہمہی اُٹھائیں اور اس قبیل کے چند ایک تبصرے سُن کر اُس کی سوچ اس طرف مرکوز ہو گئی کہ انسانی رشتوں میں عورت کو جو مقام اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، کیا وہ اُس مقام سے کوئی مناسبت رکھتا ہے، جو خود انسانوں نے عورت کے لئے مختص کر دیا ہے یا پھر انسان کا اپنی سوچوں، مفادات اور مصلحتوں کا شکار ہونے کے بعد اُس میں کوئی تبدیلی آچکی ہے۔۔ اور اگر ان رشتوں ناتوں میں بھی وہی تحریف ہو گئی ہے جو آسمانی کتابوں کی تعلیمات میں ہوئی ہے۔ تو وہ بگاڑ کس قدر ہوا ہے؟ اور اُس کی حد اور مقدار کیا ہے؟

انہی سوچوں میں غلطاں وہ انسانی رشتوں کی کھوج میں چل نکلا۔ کہیں پڑھا ہوا ایک جملہ اُس کے حافظے کی اسکرین پر جھلملایا۔ انسانی رشتے کل تین قسم کے ہوتے ہیں۔ خونی، کاغذی اور زبانی۔ اس فقرے میں تینوں اقسام کے رشتے ذو معنی لفظوں کے آئینے میں اُبھر آئے تھے۔

ماں باپ، بیٹا بیٹی، بہن بھائی اور پھر بھانجے بھتیجے وغیرہ سب رشتے خون کے رشتے ہی تو ہیں اور جب ان میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو خون سفید ہونے سے لے کر خون خرابے تک سبھی خون آشامیاں انہی رشتوں سے منسوب ہو کر رہ جاتی ہیں اور خون کے رشتے جب خونی بن جائیں تو خونخواری پر اتر آتے ہین۔

میاں بیوی، مالک ملازم اور کاروباری تعلق داریاں سب کاغذی رشتوں کے ذیل میں آتے ہیں۔ ہر رشتہ ایک کاغذ ہی کا مرہونِ منت ہونے کے سبب ایک کاغذ پیرا ہن میں ملبوس نظر آتا ہے۔ اُستاد شاگرد، پیر و مرید، منہ بولے ماں باپ، بیٹا بیٹی، بہن بھائی یاری دوستی، عشق دعاشقی تک سبھی تعلق زبان کے سبب استوار ہوتے ہیں اور اگر خلوص اور مردانہ پن کے جذبے سے بات کہی گئی ہو یہ تعلق موت کے بعد بھی قائم رہتا ہے ورنہ محض زباندانی کا ایک انداز اور ایک پیرایہ بیان سے زیادہ کچھ نہیں۔

بعض رشتے زبانی تعلق سے بڑھ کر کاغذی بن جاتے ہیں اور پھر ان کاغذی ناتوں سے خونی رشتے جنم لیتے چلے جاتے ہیں اور یہی خونی رشتے مبہم ہو کر محض زبانی رشتے بن کر رہ جاتے ہیں۔ یہ سب انسان ہونے ہی کے سبب ہوتا ہے۔ سماجی اور معاشرتی تقاضوں نے ہی انسان کو ان رشتوں ناتوں کی زنجیروں میں جکڑ کر ایک طاقتور اکائی یعنی خاندان بنادیا ہے ورنہ اور کتنی انواع میں یہ رشتے اور رشتے داریاں وجود رکھتی ہیں۔ شاید صرف جنات میں!

عورت اپنی پیدائش کے بعد بیٹی کہلاتی ہے اور پہلے سے موجود بہن بھائیوں کے ساتھ اُس کا رشتہ بہن کا ہوتا ہے یا اپنے سے بعد آنے والے بچوں کی آپی اور باجی۔ اس کے بعد وہ بیوی بن کر الگ گھر بساتی ہے اور پھر ماں کہلاتی ہے۔ اس کے برعکس ایک لڑکا جنم لینے کے بعد سب سے پہلا رشتہ جس سے متعارف ہوتا ہے، ماں کا رشتہ پوتا۔ اس کے بعد وہ عورت کے اُس روپ سے آشنا ہوتا ہے جسے وہ بہن کہتا ہے۔ بہن اُس کو وہ پیار فیتی ہے جو ایک مرد کی شخصیت کی تکمیل کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں کو بہن کا پیار نہیں ملتا، وہ صنف نازک کے بارے میں اکثر غیر متوازن رویوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ عورت کے اُس روپ سے ملتا ہے جس کو اپنی زوجہ، بیوی یا نصف بہتر کہہ کر متعارف کراتا ہے۔

اُس رشتے کی بابت قرآن حکیم کا یہ ارشاد انتہائی توجہ طلب ہے کہ تمہاری عورتیں تمہارے لئے اور تم اپنی عورتوں کے لئے لباس ہو۔ بطور لباس وہ ایک دوسرے کی زیب و زینت کا سبب بھی ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے عیبوں اور خامیوں کی پردہ پوشی اور ایکدوسرے کے تحفظ کے ضامن بھی ہوتے ہیں۔ اگر میاں بیوی کے رشتے میں یہ تینوں اوصاف یعنی زینت و سجاوٹ، پردہ داری اور تحفظ موجود نہیں تو یہ ایک دوسرے کا لباس بننے میں ناکام رہنے کی دلیل ہوئی۔

اس کے بعد مرد، عورت کا جس روپ سے تعارف ہوتا ہے، وہ بیٹی کا روپ ہے۔ بیٹی کے روپ میں وہ باپ کے لئے نعمت اور رحمت بن جاتی ہے۔ باپ کے اندر پیار کے وہ سوتے پھوٹ نکلتے ہیں، جس سے وہ اس سے پیشتر کبھی آشنا نہیں ہوتا۔ ایک ننھی سی بچی اُس کی توجہ اور سوچوں کا مرکز اور محور بن کر اُس کی شفقتوں اور محبتوں کی طلبگار بن کر اُس کی طرف مسکراتی آنکھوں اور کھلکھلاتے چہرے سے کچھ اس طرح سے دیکھتی ہے کہ وہ کچھ بھی لٹائے بغیر مسرتوں کے جھولے میں ہلکورے لیتا چلا جاتا ہے۔

دوسری طرف یہ مرد ایک عورت کے لئے سب سے پہلے باپ کا وہ روپ بن کر سامنے آتا ہے جو اُس کو پالنے پوسنے سے لے کر تحفظ اور سکون فراہم کرنے میں اتنا بڑھ جاتا ہے کہ ایک عورت مرتے دم تک اُس کو فخریہ یاد کرنا اپنی سعادت سمجھتی ہے۔ ایک بیٹی کے لئے دنیا کا سب سے عظیم انسان اُس کا باپ ہوتا ہے۔ وہ اُس کو بابل کہہ کر اُس کا مان بڑھاتی ہے اور سکھیوں پہ اپنے باپ کے چھوٹے چھوٹے سچے واقعات کا رعب ڈالتی ہے۔ اس لئے جو شوہر اپنی بیوی کے والد کو قابلِ احترام نہیں گردانتے وہ بیوی کی نظروں میں اپنا مقام کم کر بیٹھتے ہیں اور اپنا اعتبار کھو دیتے ہیں۔

عورت کے لئے مرد کا دوسرا روپ بھائی ہوتا ہے۔ بھائی ہونے کے ناتے ، وہ بہن کو اعتماد اور تحفظ کے ساتھ ساتھ ایک دوست اور ساتھی کا ساتھ فراہم کرتا ۔ اُس کے ساتھ کھیلتا ہے ، اُس کا خیال رکھتا ہے۔ اُس کو چھیڑتا اور چڑاتا ہے اور کوئی اُس کی بہن کو میلی نظر سے دیکھتا ہے تو وہ مرنے مارنے پر تل جاتا ہے۔

عورت کے لئے مرد کا تیسرا روپ ، اُس کے شوہر اور خاوند کا ہوتا ہے۔ اس روپ میں وہ اُس کو نان و نفقہ فراہم کرنے کی ذمہ داری نبھاتے ہوئے اُس کو حفاظت اور آسودگی مہیا کرتا ہے ، اُس سے عزت اور دل بستگی کا طلبگار رہتا ہے۔

لیکن یہی مرد ایک عورت کے لئے ایک بیٹا بن کر اُس کی تمام تر توجہ جذب کر لیتا ہے۔ ماں اُس سے ہزاروں توقعات وابستہ کر لیتی ہے اور سینکڑوں امیدوں اور خواہشوں کے چراغ روشن کر لیتی ہے۔ وہ اسی آس پر شامِ زندگی کا انتظار کرتی ہے کہ اُس کا بیٹا جوان ہو گا وہ اُس کے سہرے کے پھول دیکھے گی ۔۔ اُس کے بچوں کی دادی بنے گی ۔۔ اُس کا بیٹا اُس کا سہارا بنے گا۔ عورت ایسے سہاروں کی آس میں زندگی بھر رہتی ہے۔

اُس کو ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ایک عورت کی شادی ہوئی ۔ شوہر سے ذرا بن ہوتی تو دھمکی دیتی۔ اللہ رکھے میرے ماں باپ کو ۔۔۔ میں چلی میکے ، تم سنبھالو اپنا گھر ۔۔ جب ماں باپ گزر گئے اور کبھی شوہر کی مزاج پرسی کرنا ضروری ہو جاتا تو کہتی ۔۔ اللہ میرے بھائیوں کو زندگی دے ۔۔ میں چلی اُن کے گھر ، تم سنبھالو اپنا گھر ۔۔ پھر جب بھائی اپنے اپنے گھروں میں مصروف ہو گئے اور اولاد جوان ہو گئی تو خاوند کو دھمکانے کو کہا کرتیں ، خیر سے میرے جوان بیٹے ہیں اب مجھے کسی کی کیا پرواہ اور جب بیٹوں کی شادیاں ہو گئیں اور گھر میں بہو بیٹوں سے لڑاتی ہوتی تو یوں دھمکی دی جاتی۔ اللہ سلامت رکھے میرے سرتاج کو ۔۔۔ میں تم سب کو ٹھیک کر دوں گی۔

انسانی رشتوں کے اس تانے بانے پر غور کرتے کرتے اُس کے ذہن میں اپنے مرشد کریم کا کہا ہوا ایک جملہ عود کر گیا۔انہوں نے ایک بار اپنے مخصوص انداز میں دھیرے سے کہا تھا "ہر لڑکا اٹھارہ بیس سال کی عمر تک ہر عورت کو ماں یا بہن دیکھتا ہے۔ لیکن پھر نہ جانے کیوں وہ ہر عورت کو محض عورت ہی دیکھتا ہے؟

اُس نے اس بات کی تہہ تک پہنچنے کو کیوں کی تکرار کی۔ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ تبدیلی کیوں آجاتی ہے؟ اُس کے اندر ایک بگولہ سا اُٹھا۔اُس بگولے کی گردش نے اُس کے اندر سب کچھ تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ ہمارے ہاں تمام فلموں، ڈراموں اور ناولوں کا مرکز اور محور عورت کا پانچواں روپ ہے جو ہر رشتے سے بالا ہو کر محض ایک عورت کا روپ ہے جو جذبات کی عینک سے دیکھنے کی وجہ سے محض ہیر، لیلیٰ، سوہنی کا رنگ دھار لیتی ہے۔ جذبات کی آندھی زلفوں کو سیاہ رنگ، گالوں کو سیب، آنکھوں کو تیر برساتی جھیل اور بھنوؤں کو کمان کا روپ تو دے دیتی ہے، لیکن اُس کے اندر تخلیقی صلاحیتوں، آگہی اور وجدان کی قوت کو بالکل بھی دیکھنے نہیں دیتی۔

عورت اور مرد کے مابین اس پانچویں رشتے کا نام رکھنے کو اُس نے محبوب اور محبوبہ، عاشق اور معشوقہ کے الفاظ کا جائزہ لیا۔اُس کے اندر ایک سوال یہ ابھرا کہ کیا کسی اور رشتے میں بھی باہمی ربط، محبت، عشق بلاخیز کی کسی بھی طغیانی سے کم ہوتا ہے؟ کیا بیٹی اپنے بابل سے جو ربط اور تعلق رکھتی ہے، کیا وہ پیار کا خالص ترین روپ نہیں؟ کیا ایک بہن جب اپنے بھائی سے اور ایک بھائی اپنی بہن سے ملتے ہیں تو کیا ان کے دلوں کی دھڑکن کا سبب محبت نہیں بنتی تو پھر ہم سب من حیث القوم ہی نہیں بلکہ من حیث النوع کیوں صرف اسی پانچویں رشتے پر فلمیں بنا رہے ہیں، ڈرامے لکھ رہے ہیں، گیت اور غزلیں گا رہے ہیں۔ افسانے اور ناول تحریر کر رہے ہیں۔اس بے نام رشتے کو اتنی اہمیت ہی تو دی جانی چاہیے جتنی دیر کا یہ دور ہوتا ہے یعنی مرد عورت کے لئے یہ دور ایک جیون ساتھی چننے کا دور ہوتا ہے۔ بیوی یا

شوہر کی تلاش کا یہ دور ہمارے ذہنوں اور دلوں پر ہی نہیں بلکہ اعصاب تک پر مسلط ہو جاتا ہے اور ۔۔ان کے اعصاب پر ہے عورت سوار تو اُن اعصاب پر ہے مرد سوار ۔۔کی عملی تصویر پورے معاشرے میں بکھرتی چلی جاتی ہے۔

یہ بات تو امرِ واقعہ ہے کہ ایسا ہو رہا ہے۔اب اس کی وجہ کیا ہے ایسا کیوں ہے؟ اُس نے سوچا کہ یہ تو گھمبیر معاملہ ہے۔ایسا تو صدیوں سے ہوتا چلا آرہا ہے۔اس کیوں کا جواب تو کوئی سماجیات اور معاشرتی علوم کا ماہر ہی دے سکتا ہوگا۔یہ اُس کے بس کی بات کہا؟ انسانی رشتوں کے اس تانے بانے سے بنتی بگڑتی صورت کا اس تلاشِ زوج کے دوران جنم لینے والے جذبات سے کتنا رشتہ ہے؟ اور ہم نے اُن کو اتنی زیادہ اہمیت دے کر اُس کو ہر دوسرے رشتے سے زیادہ معتبر کیوں کر دیا ہے؟

سڑکوں، بازاروں اور گلیوں محلوں میں گزرتے ہوئے عورتیں جس اذیت اور کوفت کا شکار ہو رہی ہوتی ہیں، کیا وہ اس بگاڑ کا عملی چہرہ نہیں ۔۔جو جذبات کی حکمرانی کے سبب پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔

اُس نے بہت سر مارا اُس کے ذہن میں بہت سی باتیں دور کرتی رہیں۔یہ سب بیرونی کلچر کی یلغار کے باعث ہے۔اگر یہ سب بیرونی کلچر ہے تو آپ کا اپنا کلچر کہاں گیا؟ آپ اپنا کلچر خود نہ چھوڑتے اور دوسروں کا کلچر اپنانے کو تیار نہ ہوتے تو کوئی زبردستی تو کر نہیں رہا تھا۔آپ نے خود اپنی پسند سے ایک چیز چھوڑ دی اور دوسری چیز اپنی پسند سے اپنا لی تو پھر اب شکوہ کیسا؟ اُس نے اپنے اندر ابھرتے سوال کا جواب سوچتے ہوئے طے کیا۔

لیکن وہ اصل مسئلہ تو اپنی جگہ ہی رہ گیا۔پانچویں رشتے کی حکمرانی کی وجہ کا تعین ہوگا تو یہ پانچواں رشتہ اپنی اصل قامت میں واپس پلٹ سکے گا ورنہ یہ ایک بلائے بے درماں کی طرح ہر رشتے کو نگلتا ہی چلا جائے گا۔اُس نے بڑی رونی سی صورت بنا کر سوچا۔یکلخت اُس کے اندر خاموشی اور سناٹا پھیل گیا۔اُس کے ذہن میں اب کوئی خیال

گردش نہیں کر رہا تھا۔ اُس سناٹے سے وہ لطف لینے لگا۔ اُس کو اس خاموشی کے لمحات میں ایک سکوں سا محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک کوئی چیز چھن سے ابھری اور ایک چھناکے کی صدا بنتی گئی۔ یہ سب تربیت میں سقم رہ جانے کا چکر ہے۔

تربیت میں سقم؟ ہاں اور کیا۔ اگر بچے کو اُس کی تربیت کے دور میں، اُسے عورت اور مرد کے مابین ان چاروں رشتوں سے بھرپور انداز میں متعارف کروا دیا جائے تو کسی اور رشتے میں الجھنے کی گنجائش کہاں رہی۔ ان بنیادی رشتوں کا تانا بانا درست ہو جانے سے باقی تمام رشتوں کی الجھتی ڈوریں خود بخود ہی سلجھتی چلی جائیں گی۔ ساس بہو، بھابھی نند اور دیورانی جیٹھانی سب ہی رشتوں کی گرہوں کا تناؤ تبھی کم ہو سکتا ہے جب تربیت میں سقم نہ رہا ہو۔ اُس نے سوچا۔

اُس کے ذہن میں خیال کا ایک اور کوندا لپکا۔ اُس نے اُس کا جائزہ لیا اور پھر بہت سنبھل کر اُس خیال کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہوئے سوچا۔ اگر ہر لڑکے اور ہر لڑکی کو یہ بات تعلیم کی جائے کہ جب وہ ایک خاندان اور کنبے کی بنیاد بننے والے میاں بیوی بنیں اور وہ اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی میں انہماک پیدا کریں تو ہر مسئلہ حل ہوتا چلا جائے گا

اور اضافی رشتے کی ناتے کا بکھیڑا بھی سمٹ جائے گا۔ اپنے اس خیال پہ خود ہی جھوم اُٹھا۔ یہ تو سامنے کی بات ہے کہ ہر شوہر اپنے فرائض ادا کرے اور اپنی بیوی کو اُس کے فرائض کی بجا آوری میں مدد دے اور ہر بیوی اپنے فرائض کی ادائیگی میں جتی رہے اور شوہر کو اُس کے فرائض کے پورا کرنے میں مدد دے تو پھر اُن کے مابین کوئی مسئلہ کیسے اور کیونکر اُٹھ سکتا ہے۔ جب وہ اپنے اپنے فرائض ادا کر رہے ہوں گے تو دراصل وہ دوسرے کے حقوق ہی تو ادا کر رہے ہوں گے اس طرح حقوق و فرائض کی جنگ بھی ختم ہو جائے گی اور ہر رشتہ اپنے اپنے مقام پہ بلندی اور سرفرازی کا شاہکار بنتا چلا جائے گا۔ اُس نے سوچا اور اُس کے اندر اتنا سکون بھر گیا کہ اُس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔

رخشِ خیال

اپنے مرشد حضور بابا جی سے مل کرانے کے بعد وہ غیر محسوس طور پر تصوف اور صوفیانہ افکار کی طرف متوجہ رہنے لگا۔ اُس کو ایسے اشعار جن میں دنیا کی بے ثباتی، قربِ الٰہی ۔۔ عرفانِ خداوندی اور وجدانی کیفیات کو نظم کیا گیا ہوتا وہ کچھ زیادہ ہی بھانے لگے تھے۔ صوفیانہ شاعری پر اس کے اعتراضات کی تیز دھار کند سی ہو چکی تھی۔ وہ تصوف کو رہبانیت اور فراڈ سمجھا کرتا تھا۔ پیروں فقیروں کی بابت اس کے نظریات میں بے رحمی کی حد تک کاٹ محسوس ہوا کرتی تھی وہ ان کو ڈھکوسلہ، دولت کمانے کے ہتھکنڈے، لوگوں پہ حکم رانی کی خواہش کو پورا کرنے اور مریدوں سے ناجائز احکامات کی تعمیل کروانے کے فن سے آشنا لوگ قرار دینے سے کم ہی ہچکچاتا تھا۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ اس موضوع پر بات کرتے وہ پیر ہندی کا نعرہ بلند نہ کرتا اور اقبال کا یہ شعر نہ دہراتا۔

ے ہے تیرا گھر تو بجلی کے چراغوں سے روشن

اور مجھ کو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی

لیکن اب اگر کبھی کوئی دوست پیروں فقیروں کی بابت کوئی تیز و تند تبصرہ کرتا تو وہ اس کا ساتھ نہ دے پاتا۔ پیروں فقیروں کا تذکرہ ہوتا تو اس کے ذہن میں ایک من موہنی صورت ابھرتی۔۔ حکمت و دانائی کی چمک لیے ۔۔ بے نیازی اور استغنا سے جڑی گہری مسکان سے سجی تصویر ۔۔ اُس کو اُن کے قرب کی یاد دلاتی اور وہ بھیج کر رہ جاتا۔ کبھی وہ سوچتا کہ پیروں فقیروں کی بابت اس کے پہلے خیالات غلط تھے۔ یا وہ اب غلط ہو رہا ہے۔ کبھی وہ خود کو مطمئن کرنے کی خاطر یہ دلیل دیتا کہ اُس کے غلط تصورات تو غلط قسم کے لوگوں کی بابت تھے اچھے لوگوں کی بابت اسکو برے خیالات نہیں رکھنے چاہیئں۔

ایک روز کچھ ایسی ہی باتوں کے دوران اس نے کہا کہ آج کل تو اکثر لوگوں نے اچھے اور کامل لوگوں کی بنائی ہوئی شہرت کو بیچنا شروع کیا ہوا ہے۔ اچھے لوگوں کی Good will کی آڑ لے کر سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنانے والوں نے پیری فقیری کو ایک فن اور کاروبار بنا دیا ہے۔ ورنہ تو یہ ایک مشن ہے۔ لوگوں کو عرفان اور آگہی سے مالا مال کر دینے کا مشن۔ اس مشن کو پورا کرنے اور لوگوں سے اپنے ہاتھ چومنے کی خواہش رکھنے کی بجائے لوگوں کا ہاتھ

تھام کر انہیں راہ پر گامزن کر دینے والے ہوا کرتے ہیں۔ وہ مریدوں سے نذرانے لینے کے بجائے انہیں علم و دانش کے موتیوں سے مالا مال کرتے ہیں۔ ایسے لوگ تو اپنی اس ذمہ داری کو نبھانے میں روز و شب منہمک رہتے ہیں جو انہوں نے اپنی روحانی اولاد کی تربیت کی صورت قبول کی ہوتی ہے۔ وہ مریدین کو ان کی تربیت کی خاطر اپنے قریب کرتے ہیں۔ نہ کہ اُن سے اپنے پیر دبوانے کو۔ وہ تو ایک باپ کی طرح اپنی اولاد کی ضرورتوں کو پورا کرتے اور ان کو اپنے مسائل سے خود عہدہ برآ ہونا سکھاتے ہیں۔ ان کے سکھائے اور سدھائے ہوئے شاگرد تو تمام زندگی یہ بات ثابت کرتے رہتے ہیں کہ اُن کے استاد نے ان کی تربیت میں کوئی کمی نہیں رہنے دی۔

اس کے دوستوں نے اُس کی اس کایا کلپ پر حیرت کا اظہار کیا بلکہ ایک صاحب نے کہا اب تم کہو گے کہ تصوف بھی وہ کچھ نہیں ہے جیسا کہ ہم اور آپ سمجھتے رہتے ہیں۔ اس نے لہجے میں چھپے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''حقیقت تو کچھ ایسی ہی ہے۔ تم سننا چاہو تو میں عرض کیے دیتا ہوں۔''اور جب دوستوں نے دلچسپی کا اظہار کیا تو اس نے بتایا کہ تصوف کا لفظ صوف سے مشتق ہے۔ اکثر لوگ اس کا مطلب کچھ اور لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ صوفی سے مراد وہ شخص ہے جو اون کے موٹے کپڑے پہنتا ہے۔ چہرے پر شرعی داڑھی سے مختلف داڑھی رکھتا ہے۔ جبکہ کچھ

لوگ یہ بتاتے ہیں کہ اس لفظ کا تعلق صفہ سے جڑتا ہے اور اصحاب صفہ وہ غریب نادار اور لاچار لوگ ہوا کرتے تھے۔ جو دورِ رسالت میں مسجد نبوی ﷺ کے قریب ایک چبوترے پر پڑے رہا کرتے تھے۔ اس بات سے قطع نظر کہ تصوف کو کوئی علاقہ اصحاب صفہ سے ہے یا نہیں اصحاب صفہ کو غریب نادار اور لاچار اور کسمپرسی کی زندگی کے حوالے سے یاد کیا جانا بہت ہی غلط بات ہے۔

اصحاب صفہ تو وہ جلیل القدر صحابہ کرام تھے جنہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے براہ راست حصول علم کے لیے ان کی قربت ، صحبت اور معیت کی خاطر صفہ میں قیام کیا۔ حصول علم کی لگن اور حضور نبی کریم ﷺ کی صورت و سیرت میں وہ اتنے مگن رہتے کہ انہیں نہ کھانے پینے کا ہوش رہتا تھا اور نہ پہننے سنورنے کا۔ ان کی لگن اور جستجو کو مثالی بنانے کی بجائے ہم نے ان کی کسمپرسی ، ناداری اور بھوک اور پیاس کے قصے سُنا سُنا کر ان کے تربیتی مراحل کو نظر انداز کیا ہوا ہے۔ ان باتوں کو سن کر اور ان پر بلا سوچے سمجھے یقین کر لینے والے نہ جانے کس قسم کی تبلیغ اور رشد وہدایت کے مقاصد کو پورا کر رہے ہیں۔ بہر حال ان دونوں باتوں سے قطع نظر ایک تیسری بات یہ ہے کہ صوف کا لفظ لاطینی اور یونانی زبانوں میں حکمت اور دانائی کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ نہایت ذہین اور فطین لوگوں کو Sophist یعنی صوفی کہا جاتا تھا۔ مکالاتِ افلاطون میں سقراط کی بابت یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

دلچسپ بات تو یہ ہے کہ فلسفہ جس کو انگریزی میں فلاسفی Philosophy کہا جاتا ہے۔ اسی لفظ سے مرکب و مشتق ہے جو کہ قدیم فرانسیسی لاطینی اور یونانی زبانوں میں علم دوستی اور حبِ دانائی کے لئے مستعمل رہا ہے۔ جب اسلام پھیلا اور مسلمان علماء نے یونانی اور لاطینی علوم کو عربی میں منتقل کیا تو حکمت اور دانائی کی باتیں کرنے والوں کو صوفی کہا جانے لگا۔ امتدادِ زمانہ نے اس معنی خیزی کا جو حشر کیا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔

ہمارے یہاں صوفی کا مفہوم بے خبری، لا علمی اور داڑھی سے جوڑ کر اس کو جس قدر رسوا کیا گیا ہے۔ اسے دیکھ کر تو یوں لگتا ہے کہ یہ کوئی سوچی سمجھی سازش ہے کہ غور و فکر کرنے اور حکمت اور دانائی کی باتیں کرنے والوں کو Misfits دیوانے اور مجذوب کہہ کر ان کی تحقیر کی جائے اور ظاہری شباہتوں یا مماثلتوں کی مضحکہ خیز صورتوں کو صوفی کہہ کر ذہنوں میں موجود عالی شان مفاہیم کی صورت ہی مسخ کر دی جائے۔

یہ بات بہت ہی غور طلب ہے کہ ہم سُنی ہوئی، پڑھی جانے والی یا کہی بات پہ غور ہی کتنا کرتے ہیں۔ بلا سوچے سمجھے بولتے ہیں اور بلا غور و فکر سنتے ہیں اور پڑھتے ہوئے تو اپنی تمام تر سوچ ذہنی صلاحیتوں کو مصنفین اور صحافیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں۔ جس نے جو کچھ لکھ دیا۔ اس کو ہم اپنا علم مان لیتے ہیں اور بڑے فخر سے بتاتے ہیں کہ ہم نے یہ پڑھا ہے۔ ہم نے وہ پڑھا ہے۔ خود غور نہیں کرتے کہ ہم نے کیا سُنا یا کیا پڑھا ہے۔ نہ لکھنے والے سوچ اور تفکر کے تقاضے پورا کرنے کی زحمت کرتے ہیں نہ پڑھنے والوں کو اس سے کوئی علاقہ ۔۔ جو چند ایک لوگ کبھی کبھار پتے کی کوئی بات کہہ دیں تو ضمنی اور فروعی باتوں کے خاردار میدانوں میں گھسیٹ گھسیٹ کر ان کا ناطقہ بند کرنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔

لگتا ہے تم پر بابا جی کا کچھ زیادہ ہی رنگ چڑھ رہا ہے۔ اس کے ایک دوست نے اس کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ تُم اُن سے کچھ زیادہ ہی مرعوب ہو گئے ہو۔

اُس نے اپنے دوست کی اس بات کا جائزہ لیا اور کہا تم ٹھیک کہتے ہو لیکن تم نے یہ غور نہیں کیا کہ اس طرح کا تبصرہ کر کے تم نے میری کہی ہوئی بات کو کس بے دردی سے پسِ پشت ڈالتے ہوئے موضوع سے ہٹ کر بالکل ہی ایک دوسری اور مختلف بات کر کے ذہن اور سوچ کا سارا دھارا ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کسی بھی

بات کو اس کے منطقی انجام تک نہیں پہنچا پاتے۔ کیونکہ ہم خود ہی اپنی راہ کھوٹی کر بیٹھتے ہیں۔ ہم خود ہی سدِ راہ ہو جائیں تو حصول منزل کی آرزو کس طرح پوری ہو گی؟ خیر تو میں عرض کر رہا تھا کہ تصوف دراصل حکمت و دانائی سے ایک ایسا گہرا تعلق رکھتا ہے کہ اگر یہ اجزاء اس سے نکل جائیں تو جو بے جان جسم باقی رہ جاتا ہے۔ آپ اُس کو کسی مقام سے نسبت کے حوالے سے، کسی بھی نام سے پکار لیں وہ رہے گا تو وہی بے جان اور مردار جسم۔

اس پر اُس دوست نے کہا۔ آپ نے درست کہا ہے۔ مجھے حضرت علیؓ کا ایک قول دھیان میں آرہا ہے۔ ''حق کو لوگوں کے ذریعے نہ پہچانو بلکہ حق کی معرفت حاصل کرو اہلِ حق تمہیں خود بخود ہی نظر آجائیں گے۔ اس بات کا بھی یہی مفہوم ہے کہ خود میں حکمت اور دانائی پیدا کر کے حقیقت کو سمجھو یہ مت دیکھو کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ بلکہ اس بات پر زیادہ دھیان دو کہ کیا کہا جارہا ہے۔ اگر کوئی بُرا آدمی اچھی بات کہہ رہا ہو تو کان بند کر لینے اور منہ موڑ لینے کا جواز اس آدمی کی بُرائی کو نہیں ہونا چاہیے اور اسی طرح اگر کوئی اچھا انسان کوئی بُری بات کہہ بیٹھے تو اُس کی تقلید اور تائید میں یہ دلیل دے کر آپ سزا سے نہیں بچ سکتے کہ یہ بات تو میں نے فلاں صاحب سے سُنی تھی اور چونکہ وہ بہت ہی اچھے انسان ہیں اس لئے میں نے سمجھا کہ ان کی کہی ہوئی یہ بات بھی اچھی ہی ہو گی۔ اصل بات یہی ہے کہ کسی بھی بات کو خود کو سمجھنا اور سمجھنے کے لیے خود ہی غور و فکر کرنا شرط اولین ہے۔ اگر ہم غور و فکر اور تفکر سے کام نہیں لیتے تو اس میں خرابی کا سبب ہم خود ہی تو ہیں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول آپ ذہن میں رکھ کر دیکھیں کہ جو شخص کسی ظالم کی مدد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس ظالم کو اسی پر مسلط کر دیتا ہے، کے مصداق ہم عیار لوگوں کا بھانڈا نہ پھوڑنے کے لیے ان کی باتوں کا اچھی طرح جائزہ نہ لے کر در حقیقت اُن کے اس ظلم میں ان کا ساتھ ہی تو دے رہے ہوتے ہیں۔ جو وہ ہم پر جہالت مسلط کر کے

ہم پر ظلم توڑ رہے ہوتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول فیصل کے عین مطابق اللہ تعالیٰ ہم پر ان ہی لوگوں کو مسلط کر دیتے ہیں۔ جو ہم پر ظلم کر رہے ہوتے ہیں۔ ظلم صرف یہ ہی نہیں ہے کہ کوئی میرا پانی بند کر دے یا مجھے مارے پیٹے۔ یہ تو ظلم کی سب سے ادنیٰ قسم ہو گی۔ کیونکہ اس قسم کے مظالم کا تعلق تو جسم اور جسم کے مادی تقاضوں سے ہوتا ہے۔ ظلم کی دوسری قسم وہ ہے جس میں ہمارے ذہنی تقاضوں کو پامال کیا جاتا ہے اور ہمیں ذہنی کوفت اور اذیت سے گزارا جاتا ہے اور تھرڈ ڈگری کا ظلم وہ ہوتا ہے۔ جب ہمارے روحانی تقاضوں کی تکمیل میں رکاوٹ ڈال دی جائے ہمیں اپنے روحانی تقاضوں کو پورا کرنے سے روک دیا جائے۔ اس روکنے کے لئے جو بھی ہتھکنڈے ایجاد کئے جائیں وہ سب اس ظلم میں شمار ہونے ضروری ہیں۔

روح کا سب سے عظیم الشان تقاضا حق آشنائی ہونے کے سبب حقیقت کی کھوج میں لگا رہنا اس کا سب سے بڑا مشغلہ قرار پاتا ہے۔ اب جو لوگ غور و فکر سے تہی ہونے کے سبب اس راہ پہ چلنے سے روکنے والوں کو نہیں پہچانتے، اُن کو اپنی راہ کاٹنے سے منع کرنے کی بجائے، اُن کی بات پر عمل پیرا ہو کر حقیقت کو خود اپنے دین کی مدد سے تلاش کرنے کی بجائے دوسروں کی ذہنی اختراعات کو قبول کر لیتے ہیں۔۔ اور نہ صرف خود قبول کر لیتے ہیں بلکہ اُن کا پرچار کر کے اس ظلم میں اُن کی امداد اور معاونت کے گنہگار تو ہوتے ہی ہیں۔۔ سزا کے طور پر وہ ظالم پیر تسمہ پا کی طرح ان پر ہمیشہ کے لئے مسلط بھی کر دیئے جاتے ہیں۔

اس نے اپنے دوست کی بات سُن کر ایک عجیب سے طمانیت اپنے اندر دور کرتی محسوس کی۔ اس نے سوچا کہ وہ کس قدر خوش قسمت ہے کہ اللہ نے اُس کو ایسے اچھے دوستوں سے نوازا ہے۔ اُس نے کس قدر پتے کی بات کہی ہے۔ اس نے کہیں سنی ہوئی ایک بات کو اپنے شعور کی سطح پر نمودار ہوتے دیکھا کہ ظالم کو اس کے ظلم کی ایک سزا ملے گی کہ

اس نے ظلم کیا لیکن مظلوم کو دوہری سزا ملتی ہے ایک سزا تو یہ ہوئی کہ اُس نے ظلم سہا اور دوسری سزا اُس کو اس بات کی ملے گی کہ اُس نے ظلم برداشت کر کے ایک ظالم کو جنم دینے کا نا قابلِ معافی جرم کیا۔ اس نے سوچا کہ وہ یہ بات دوستوں کو سنائے لیکن اس کا دوست اپنی بات کو جاری رکھے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اگر ہم گہرائی میں غور کریں تو یہ بات ہمارے لیے اطمینان قلب کا باعث ہونی چاہیے کہ اصل حقیقت کی تلاش کی کوئی بھی ذی شعور مخالفت نہیں کرتا اور نہ ہی اُس کو کرنا چاہیے۔ اس لیے اس راہ کا سفر اب اتنا دشوار نہیں کہ آدمی محض مخالفت کے خوف سے ہی دبک کر رہ جائے۔

تلاش حق کے دوران اختلافات کا وجود، حقیقت سامنے آنے پر خود ہی تحلیل ہو جاتا ہے چونکہ کسی بھی بارے میں حقیقت صرف ایک ہی ہوا کرتی ہے دو تین یا زیادہ نہیں ہو سکتیں۔ اگر حکمت و دانائی کا پرچار ہوا اور حقیقت تک رسائی حاصل وہ جائے تو ظاہر سی بات ہے کہ حقیقت یا اصلیت ہر باطل اور غیر حقیقی بات پر چھا جائے گی اس نہج پر سوچتے چلے جائیں تو یہ عقدہ بھی خود بخود کھل جاتا ہے کہ اسلام میں تفرقہ بازی سے کیوں منع کیا گیا ہے اور حضور کریم ﷺ کے اس بات کا اصل مفہوم کیا ہے کہ میری اُمت بہتر فرقوں میں بٹ جائے گی لیکن صرف ایک فرقہ ایسا ہوگا جو راہ راست پر ہوگا اور وہی نجات پانے والا ہے۔

اس کے دوست نے اتنا کہہ کر اپنی بات ختم کر دی لیکن جو بات محفل میں ختم ہو گئی وہ اس کے اندر جا کر ایک آغاز بن گئی۔ اس کی سوچوں کے دائرے پھیلتے چلے جا رہے تھے۔ خیال کی لہریں بیان کی گئی حدیثِ مبارکہ کے انوار سے روشن تر ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ اس کے شعور میں یہ بات ایک سوال بن کر ابھری کہ جب حقیقت ایک ہی ہوتی

ہے تو اُس میں اختلاف اور تفرقہ کیسے اور کیونکر پیدا ہو سکتا ہے اور اگر اختلاف پیدا ہو ہی جائے تو کیا کوئی ایسا طریقہ ہے کہ اس اختلاف کو ختم کیا جا سکے؟ اس اختلاف الرائے کی بناید پر قائم ہو جانے والے فرق کو مٹایا جا سکے؟

وہ سوچتا رہا۔۔۔ غور کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اُس نے اس بات کا کئی زاویوں سے جائزہ لیا۔ ذہن میں مختلف مثالیں قائم کر کے اس پر غور کیا۔ بظاہر تو یہ سامنے کی بات تھی کہ ایک واحد حقیقت کا ادراک مختلف اور متفرق کیونکر ہو سکتا ہے یعنی ایسا ہونا تو نہیں چاہیے۔ لیکن امت مسلمہ میں افتراق و انتشار رر، گونا گوں مسالک اور فرقوں کا وجود بھی تو ایک بدیہی حقیقت اور سچائی ہے اور پھر یہ امر بھی اپنی جگہ ایک اٹل بات ہے کہ ہر فریق یہی سمجھتا ہے کہ وہی راہ حق پر ہے اور نجات اسی کا مقدر ہے۔ باقی سب نار جہنم کا ایندھن بنیں گے اور ہر ایک اپنے اپنے مفروضہ عقیدے پر خوش بھی ہے کہ میرے علاوہ باقی سب آگ میں جلیں گے۔ حالانکہ کسی دوسرے کی تکلیف پہ خوش ہونا اور دوسروں کے لئے پرے انجام کی خواہش رکھنا ہی اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہے۔

آج سے ہزار سال قبل حضرت امام غزالیؒ کو بھی اسی سوال نے سرگرداں کئے رکھا تھا۔ انہوں نے سال ہا سال کی محنت اور جستجو سے، ہر فرقے کے عقائد کی چھان پھٹک کرنے، ہر گروہ کے مذہب و مسلک کے اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کر لینے کے بعد یہ طے کیا تھا کہ اس تمام تر مسئلے کا حل علم حقیقی ہے اور علم حقیقی پر براہ راست مشاہدے اور قرب الٰہی کے بغیر حاصل ہونا ناممکن ہے اور یہ کہ صرف صوفیائے کرام کے گروہ میں کچھ ایسے افراد ہیں جو علم حقیقی سے سرفراز ہیں کیونکہ ان کا طریقہ علم اور عمل دونوں سے تکمیل پذیر ہوتا ہے۔

آج سے ایک ہزار سال قبل اُن کی اس دریافت سے کسی نے کیا فائدہ اُٹھایا؟ یہ سوال ایک ناگ کی طرح اُس کے شعور کو ڈس گیا۔ آج ایک ہزار سال گزرنے کے باوجود صوفیائے کرام سے استفادے کے لئے امت نے کیا کیا؟

اُس وقت سے لے کر آج تک خود صوفیائے کرام نے خود کو کتنا اُستوار کیا اور اُن کے حقیقی علوم سے مستفیض ہونے سے فرقوں اور مسالک کی تعداد کچھ کم ہو گئی یا کچھ مزید بڑھ گئی۔ سوال کی زہر ناکی اور تلخی نے اُس کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس نے سوچوں میں در آنے والی اسی تلخی اور کڑواہٹ کے زیر اثر ایک اور سوال کو کوڑے کا روپ دھارتے دیکھا۔ تم امام غزالیؒ کی دریافت سے حاصل ہونے والے فوائد کا رونا روتے ہوئے یہ کیوں بھول رہے ہو کہ حضور ﷺ نے جو علم حقیقی دیا تھا اس اُمتِ محرومہ نے اُس کا کیسا حشر کیا؟ یہ سمجھ بوجھ حاصل کر لیتے تو اس سے بہتر اور کون سا علم حقیقی درکار ہوتا۔ اس قوم نے خود کو جہالت کے اندھیروں کا خوگر بنا لیا۔ یہ ظلم انہوں نے خود پر ہی تو مسلط کیا ہے۔

لیکن اب اس کا کیا حل ہو سکتا ہے؟ اس کے شعور نے ایک ایسے ڈرے اور سہمے ہوئے بچے کی مانند خود سے سوال کیا جو ماں کی غیر موجودگی میں گھر کے کسی کمرے میں داخل ہو اور دیکھے کہ سامنے فرش پر اس کی والدہ کا پسندیدہ گلدان بہتر تہتر ٹکڑوں میں ٹوٹا اور بکھرا ہوا پڑا ہے اور اُس کو سمجھ نہ آئے کہ جب اُس کی والدہ اس صورتِ حال سے باخبر ہو گئی تو اُس پہ کیا گزرے گی۔ وہ اپنی والدہ کو پہنچنے والے صدمے کا خیال کر کے ہی ہراساں ہو کر خود سے پوچھ رہا ہو۔۔اب کیا ہو گا؟ اب کیا ہونا چاہیے؟ اب کیا کرنا چاہیے؟ اب کیا ہو سکتا ہے؟ اور جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آئے تو وہ بیٹھ کر رونے لگ جائے۔

وہ دل گرفتگی سے سوچتا رہا۔ اس کے اندر سوالوں کے بھنور گرداب بنتے رہے وہ ان کی زد میں چکر پھیریاں لیتا رہا۔

ہو بُرا تو کر بھلا

امام غزالیؒ کی بابت یہ بات مشہور ہے کہ وہ اپنی افتادِ طبع کے ہاتھوں ہر طرح کے علم پر حاوی ہونا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے نوجوانی میں ہی مروجہ علوم میں اتنی دسترس بہم پہنچائی تھی کہ ان کے پایے کا عالم اُن کے دور میں شاید ہی کوئی اور بھی ہو۔ امور کی حقیقت اور کنہ تک رسائی کی پیاس اُن کی سرشت اور جبلت میں داخل تھی۔ ذوق جستجو سے سرفراز بندے میں بے قراری نے انہیں فقہ سے لے کر فلسفہ اور ریاضیات سے لے کر منطق اور علم الکلام وغیرہ تمام ہی علوم میں طاق کر دیا اور انہوں نے تدریس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔

بغداد میں سنہ 488ھ میں جب ان کی عمر محض 38 سال کی تھی۔ وہ مسند علم پر اتنے نمایاں تھے کہ اُس دور میں جب کسی استاد کے درس میں بیس تیس افراد شامل ہو جاتے تو اس کو عالم گردانا جاتا۔ اس وقت ان کے درس میں 300 تین سو کے قریب شاگرد اُن سے اکتساب علم کو حاضر ہوا کرتے تھے۔

ایک روز کسی شاگرد نے ان سے دریافت کیا کہ یقینی اور حقیقی علم کی پہچان کیا ہوتی ہے؟ اس پر انہوں نے جواب میں فرمایا کہ جو علم غلطی سے محفوظ رہنے کی ضمانت نہ دے سکے وہ یقینی اور حقیقی علم نہیں گردانا جا سکتا۔ ان کا شاگرد اُن کی یہ بات سن کر اپنے محفوظ ہونے کی اطلاع دینے کو مسکرا دیا۔ لیکن اُس کی مسکراہٹ نے حجتہ الاسلام حضرت محمد بن الغزالی طوسی المعروف امام غزالی کو چونکا دیا۔ انہوں نے اپنے علوم کا جائزہ لینا شروع کیا۔

ایک کے بعد ایک اُن کا ہر وہ علم جو انہوں نے اس وقت تک سیکھا تھا، کہیں نہ کہیں آ کر خود اُن کی اپنی بیان کردہ کسوٹی کے معیار پر پورا اُترنے سے عاجز ہوتا رہا۔ اس پر ان کا خلفشار اتنا بڑھا کہ انہوں نے درس و تدریس سے ہاتھ کھینچ لیا۔ رفتہ رفتہ اُن کی یہ حالت ہوگئی کہ انہوں نے لوگوں سے بات چیت ہی بند کر دی وہ اندر ہی اندر اس

حیرت کا شکار تھے کہ انہوں نے جو اتنا علم حاصل کیا وہ انہیں اس قابل کیوں نہیں بنا سکا کہ وہ غلطی اور لغزش سے محفوظ و ماموں ہو جاتے۔

انہوں نے اپنے دوستوں سے اس بابت بات کی۔ کچھ نے تجویز کیا کہ علم کی زیادتی سے ان کے قویٰ جواب دے رہے ہیں۔ اس لیے انہیں اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہیے۔ کچھ نے یہ رائے دی کہ یہ یونہی کوئی شیطانی وسوسہ ہے، آپ فکر نہ کریں خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ چند ایک نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ کسی ولی کامل یا صوفی سے رابطہ کریں۔ اس پر ان کا دھیان اُس طرف ہو گیا۔ وہ کئی صوفیائے کرام سے ملے لیکن اُن کے اندر کی خلش کو کہیں قرار نہ مل سکا۔ انہوں نے صوفیائے کرام کی کتب کا مطالعہ کیا۔ ایک بات جو اُن سب بزرگوں کی تحریروں میں تھی وہ یہ کہ عرفان و آگہی سیکھنے سکھانے کی بجائے ذاتی تجربے کی دین ہے اور یہ تجربہ کسی تجربہ کار مرشد کی نگرانی ہی میں ہو سکتا ہے اور اس کے لئے انہیں کسی مردِ کامل حق آگاہ کی تلاش کرنا ہو گی۔

اس تلاش میں سرگردانی کے دوران وہ حضرت ابو طالب مکیؒ، حضرت حارث محاسیؒ۔ حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت بایزید بسطامیؒ، حضرت ابو بکر شبلیؒ اور دیگر مشائخ کی کتب کے مطالعے میں منہمک رہے۔ اس سے یہ ہوا کہ وہ صوفیائے کرام کے علمی مقاصد سے تو اژنا ہو گئے لیکن ساتھ میں یہ بات بھی ان پر عیاں ہو گئی کہ تصوف کی حقیقت تک رسائی تبھی ممکن ہے جب ان کے ذوق وجدان اور صفات میں تبدیلی پیدا ہو جائے۔ انہوں نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ پیٹ بھرنے کے طریقے جاننا ایک بات ہے اور سچ مچ پیٹ بھر لینا بالکل دوسری بات ہیں۔ بالکل جیسے نشے کی حالت کے بارے میں کسی کا علم کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو جائے، اُس کو مکمل نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ وہ خود نشے کی حالت کے تجربے سے نہ گزر چکا ہو۔ نشے کی بابت جاننا اور بتانا ایک بات ہے اور نشے کی حالت اور نشے کے تجربے سے

عملی طور پر گزرنا ایک بالکل ہی الگ بات ہے۔ یہی بات زہد و تقویٰ پر بھی صادق آتی ہے۔ زہد و تقویٰ کی بابت جان لینا ایک بات ہے اور تقویٰ کی حالت میں رہنا بالکل ہی مختلف صورت ہے۔ عرفان و آگہی کی بابت باتیں کرنا اور عرفان و آگہی کی کیفیات سے دوچار ہونے میں اتنا ہی فرق ہے جتنا شادی اور اولاد کی بابت علمی طور پر جاننے اور سچ مچ شادی شدہ ہونے اور صاحب اولاد ہو کر اولاد کو پروان چڑھا کر اُن سے حاصل ہونے والی خوشیوں سے بہرہ مند ہونے میں ہو سکتا ہے۔

اس سب کے لیے انہیں ایک مردانا اور استاد کامل کی ضرورت تھی۔ اس لیے وہ بغداد سے نکل کھڑے ہوئے۔ کئی نامور صوفیاء کرام سے ملے لیکن گوہر کہیں ہاتھ نہ آیا۔ اسی دوران کسی نے ان کے اظہار مایوسی پر ان سے دریافت کیا۔ ''آپ حضرت ابو شبلیؒ سے ملے؟''

انہوں نے سوچا جہاں اتنے بہت سے لوگوں سے مل لیا اُن کو بھی دیکھ لینا چاہیے اور وہ ان سے ملنے روانہ ہو گئے۔

جب وہ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے بیٹھا ایک فقیر اپنی گدڑی سی رہا ہے۔ انہوں نے قصد کیا کہ اُس فقیر سے حضرت شبلیؒ کی بابت دریافت کرنا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ آگے بڑھے۔ فقیر کی پشت ان کی طرف تھی۔ قریب پہنچ کر پیشتر اس کے کہ یہ کچھ بولتے وہ فقیر گویا ہوا۔

''تم آ گئے غزالی! تم نے آنے میں بہت دیر کر دی۔ لیکن چلو پہنچ تو گئے۔ دیکھو میاں! ہمارے یہاں عمل پہلے ہے اور علم بعد میں اگر تمہیں یہ بات منظور ہے تو ٹھیک ہے تم یہاں رُک سکتے ہو ورنہ میرا اور اپنا وقت ضائع مت کرو اور واپس چلے جاؤ۔

اس گفتگو کو سن کر امام غزالیؒ کے شعور کو جو جھٹکا لگا ہو گا اس کا اندازہ ہر ذی فہم با آسانی لگا سکتا ہے انہوں نے اپنی حیرتیں قابو پا کر کچھ توقف کیا اور کہا۔ ''جی ہاں۔ مجھے منظور ہے!'' اس پر حضرت شبلیؒ گویا ہوئے۔ ''ٹھیک ہے۔ تمہیں منظور ہے تو چلو وہاں جا کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔ جب میں فارغ ہو جاؤں گا تو تم سے بات ہو گی۔''

جس وقت امام غزالیؒ حضرت ابو بکر شبلیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو عالمانہ کروفر کا یہ عالم تھا کہ ان کا چغہ، جبہ و دستارِ فضیلت اور گھوڑے کی سجاوٹ وغیرہ اس زمانے میں بیس ہزار اشرفیوں کی قیمت کی حامل تھیں۔ امام غزالیؒ ادب سے پیچھے ہٹے اور جا کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔

جب حضرت ابو بکر شبلیؒ کچھ دیر بعد فارغ ہو گئے تو انہوں نے امام غزالیؒ کو اپنے پاس بلا کر بٹھایا۔ دو تین دن خوب خاطر مدارت کی۔ ایک روز فرمایا۔ اب کام کی بات ہو جائے۔ کام یہ ہے کہ یہ ایک بوری کھجوریں ہیں۔ انہیں لے کر بازار چلے جاؤ اور فروخت کر دو۔

غزالیؒ نے پوچھا۔ کس بھاؤ فروخت کرنا ہوں گی؟

انہوں نے فرمایا ''ایک چپت فی کھجور۔۔ یعنی اُن کھجوروں کو بازار لے جاؤ اور صدا لگاؤ کہ کھجوریں لے لو اور جب کوئی کھجوریں لینا چاہے تو اس کو بتاؤ کہ جتنی کھجوریں وہ لینا چاہتا ہے وہ تم کو اتنے ہی چانٹے رسید کرے!۔

امام غزالیؒ یہ سن کر چکرا کر رہ گئے۔۔ لیکن دُھن کے پکے تھے۔ دل کڑا کر کے پوچھا۔ ''یہ کام کتنا عرصہ کرنا ہے؟''

ابو بکر شبلیؒ نے انہیں نظر بھر کر دیکھا اور کہا۔ ''ایک سال!'' اور وہاں سے ہٹ گئے۔

اما غزالیؒ نے کچھ توقف کیا پھر بوری کندھے پر لادی اور بازار کا رخ کیا۔ شام تک لوگوں سے چپتیں اور چانٹے کھاتے کھاتے اُن کا سر گھوم گیا۔ لیکن انہوں نے جیسے تیسے یہ کام پورا کر کے ہی دم لیا۔ اگلے روز بھی یہی ہوا۔ اور پھر ہر روز یہی ہوتا رہا۔ صبح انہیں کھجوروں کی ایک بوری اپنے حجرے کے باہر تیار ملتی اور وہ اسے لے کر بازار چلے جاتے۔ لوگوں کو مفت کا تماشہ ہاتھ لگا ہوا تھا۔ لوگ آتے ان کو چانٹے مارتے اور کھجوریں کھاتے۔ طرح طرح کی باتیں کرتے۔ کچھ اُن پر رحم بھی اتا اور کچھ کو مزا۔۔ کرتے کراتے ایک سا پورا ہو گیا۔۔ یہ صبح اُٹھے۔ باہر آئے۔ دیکھا کہ مقررہ جگہ پر بوری پڑی ہے۔ انہوں نے بوری کو نظر انداز کیا اور جا کر ابو بکر شبلیؒ سے قدرے فخریہ انداز میں کہا۔ '' آپ کے حکم کے مطابق میں نے ایک سال پورا کر لیا ہے۔''

ابو بکر شبلیؒ نے اُن کو دیکھا، قدرے توقف کیا اور فرمایا۔ ''بھئی یہ کام ایک سال مزید کرنا ہے!''

امام غزالی منہ ٹکائے باہر آئے اور بوری اُٹھا کر عازمِ بازار ہو گئے۔ جب دوسرا سال بھی مکمل ہو گیا۔ تو یہ حجرے سے باہر آئے اور دیکھا کہ کھجوروں کی بوری موجود ہے۔ آپ گڑ بڑا گئے۔ ڈرتے ڈرتے ابو بکر شبلیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہمت مجتمع کی اور عرض کی۔ ''حضور آج دوسرا سال بھی مکمل ہو گیا ہے۔''

شبلیؒ نے ایک شانِ بے نیازی اور عالم استغنا سے ارشاد فرمایا۔

''اچھا۔۔ ٹھیک ہے۔۔ لیکن ابھی کام پورا نہیں ہوا۔ آپ کو ایک سال مزید یہی کام کرنا ہو گا۔''

غزالیؒ پہ جو کچھ بھی گزری وہ تو وہی جانتے ہوں گے لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری اور تیسرا سال بھی اسی معمول کے مطابق گزار دیا۔ جب تیسرا سال بھی مکمل ہو گیا۔ غزالیؒ حجرے سے باہر آئے اور دیکھا کہ کھجوروں کی بھری ہوئی بوری اپنی جگہ پڑی اُن کی منتظر ہے۔ انہوں نے اُس بوری کو دیکھا۔ کچھ دیر کھڑے رہے پھر بوری اُٹھائی اور بازار کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں حضرت شبلیؒ نے آواز دی۔ ''کیوں بھئی۔۔ تمہارا سال پورا نہیں ہوا ہے؟''

امام غزالیؒ نے عرض کی۔ ''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ آپ کو بہتر علم ہے۔''

اس پر حضرت شبلیؒ بولے۔ ''بس ٹھیک ہے! کام ہو گیا ہے اب یہ کام مزید نہیں کرنا۔ تم میرے پاس آ کر بیٹھا کرو اور اُنہوں نے چند ہی روز میں وہ علم غزالی کو منتقل کر دیا جس کی تلاش میں غزالیؒ اُن کے پاس آئے تھے۔ ایک ایسا علم سیکھنے سکھانے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ استاد اپنے شاگردوں کو براہ راست منتقل کرتا ہے۔

امام غزالیؒ جب واپس بغداد پہنچے تو اُن کی فقیرانہ ہیت کذائی دیکھ کر لوگ دنگ رہ گئے۔ کہاں وہ عالمانہ کروفر اور کہاں یہ فقیری کا رنگ۔ اُن کے شاگردوں اور دوستوں نے اظہارِ ہمدردی کیا تو انہوں نے کہا۔

''مجھے قسم ہے اُس ذات کی۔۔۔ جس کے قبضے قدرت میں میری جان ہے۔ اگر مجھ پر یہ وقت نہ آتا تو میری ساری زندگی ہی اکارت چلی جاتی۔''

اُس کے شعور نے اس واقعے سے آگاہ ہو کر دریائے حیرت میں غوطہ لگایا۔ علم و آگہی کی طلب میں کوئی اس قدر ثابت قدم بھی رہ سکتا ہے۔ اس مقامِ حیرت سے گزرنے کے بعد جو بات غور طلب بنی وہ یہ تھی کہ یہ امر تو بہرحال طے تھا کہ حضرت ابو بکر شبلیؒ نے امام غزالیؒ سے جو کچھ بھی کروایا وہ اُن کی روحانی تربیت کی خاطر کروایا گیا

تھا لیکن انہوں نے تربیت کے لئے یہ چپتیں کھانے والا پروگرام ہی کیوں ترتیب دیا؟ اس تربیتی پروگرام کا اصل مقصد کیا تھا؟ اس تربیتی پروگرام سے گزار کر غزالی کی شخصیت اور ذہن میں کیا تبدیلیاں پیدا فرمائی گئی تھیں؟

اس پروگرام پہ عمل پیرا ہونے امام غزالی کو ایسی کیا بات حاصل ہوگئی کہ انہوں نے قسم کھا کر یہ کہا کہ اس پروگرام سے گزر کر انہوں نے خود کو خسارے سے بچا لیا اور یہ بات اس لئے بھی قابلِ یقین ہے کہ سنہ 505ء میں وفات پانے والے اس نابغہ روزگار بندے کا نام ایک ہزار سال یعنی پورا ایک قرن گزرنے کے بعد بھی زندہ و جاوید ہے۔ لوگوں کے دلوں میں اُن کے لئے عقیدت و احترام موجود ہے۔ باوجود اس بات کے کہ کسی نے اُن کی تصنیف کردہ کتب کا مطالعہ کیا ہے یا نہیں اور اگر کیا ہے تو اُس کو اُن کی کتنی باتوں کی سمجھ آئی ہے ۔۔۔ اور آئی بھی ہے یا نہیں؟

خانقاہی نظامِ تدریس و تربیت میں ایسے کسی پروگرام کی کوئی نظیر نہ اس سے پیشتر کہیں ملتی ہے اور نہ ہی اس کے بعد کبھی کوئی ایسی تربیت سے گزارا گیا۔ آخر ایسی کون سی بات تھی جو اس مشق کے بغیر امام غزالیؒ کے اندر راسخ نہیں ہو سکتی تھی۔ مار کھانے سے روحانی ترقی اور وجدان اور عرفان کا رشتہ بھلا کیسے جڑتا ہے؟ مار مار کر چوروں، ڈاکوؤں اور مجرموں کو سدھارنے کی بات تو سب جانتے ہیں لیکن امام غزالیؒ جیسے عالم بتحر کو اتنی مار کیوں ماری گئی؟ اور پھر اُنہیں دیکھو۔۔ روزانہ بلا ناغہ تین سال تک، خود اپنی مرضی سے خود آوازیں لگا لگا کر لوگوں سے پٹتے رہے۔ ایسی مار اور پٹائی سے گزر کر آخر اُنہیں کیا ملا ہوگا؟ آخر وہ کیا بات تھی جس کے لئے وہ اتنے کڑے مراحل سے بلا کسی چوں چراں کے گزر گئے۔

سوچ سوچ کر وہ عاجز آ گیا لیکن کچھ بن نہ پڑا۔ ایک خیال یہ آیا کہ آج کی نفسیات کے مطابق اس کا تجزیہ کیا جائے تو کہا جائے گا کہ اُن کے اندر اذیت پسندی کے کسی پوشیدہ جذبے کی تسکین کے لئے یہ پروگرام مرتب کیا گیا۔ لیکن اُن کی باقی زندگی میں اس سے پہلے یا بعد میں کبھی کسی سے یہ فرمائش کیوں نہیں کی کہ بھائی ذرا آنا۔۔ مجھے چند تھپڑ مار دو۔۔ نہیں یہ کوئی اور ہی بات ہے۔۔ وہ اور بات کیا تھی۔ اُس کا ذہن اس گتھی کو کسی طور سلجھا ہی نہیں پا رہا تھا۔ کاش کسی طرح وہ اس قابل ہو جاتا کہ وہ خود امام غزالیؒ سے یہ پوچھ سکتا کہ جناب آخر یہ کیا راز تھا؟

ایک روز اپنے مرشد کریم کی ایک تحریر کے مطالعے کے دوران اسی واقعے کے حوالے سے اُس نے پڑھا کہ جب غزالیؒ نے اتنا عرصہ مار کھائی اور اُن کی انا کی خول کے چھلکے اتر گئے تو وہ اس قابل ہو گئے کہ انہیں روحانی علوم منتقل کئے جا سکیں۔۔۔ تو اس کا لگا کہ اُس کے سوال کا جواب اُس کو مل گیا۔ اُس نے اس پر غور کرنا شروع کر دیا کہ انا کے خول کے چھلکے اترنے سے کیا مراد ہو سکتی ہے؟ بادی النظر میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ امام غزالیؒ میں اپنی علمیت کے حوالے سے انانیت بہت زیادہ تھی۔ اُس کے اندر سے اس انانیت کو ختم کرنے کے لئے حضرت شبلیؒ نے یہ مشق تجویز کی۔ قریب تھا کہ وہ اس نتیجے پر پہنچ کر مطمئن ہو جاتا لیکن اُس کے شعور میں ایک سوال ابھرا کہ اگر امام غزالیؒ میں انانیت ہوتی تو وہ پہلے ہی روز، پہلے ہی ہلے میں دیوار سے جا کر لگ کر کھڑے کیوں ہوتے؟ اگر وہاں کھڑے ہونا وقتی اثر پزیری کے سبب تھا تو جھک کر بوری اُٹھا لینا اور نہ صرف اُٹھا لینا بلکہ اُس کو بازار تک بھی لے جانا اور پھر وہاں خود یہ صدا لگانا کہ آؤ مجھے مارو۔۔ اور مارنے والوں میں کھجوریں بھی تقسیم کرنا۔۔ چلیں مار کھائی تو کھائی یہ مارنے والوں کا منہ میٹھا کروانے کی کیا ضرورت پڑی تھی؟ یہ بات انانیت سے کچھ بڑھ کر تھی۔ اُس نے سوچا کہ مرشدِ کریم نے بھی تو انانیت نہیں کہا بلکہ انہوں نے انا کے خول کے چھلکے اترنے کا استعارہ برتا ہے۔ اُس نے اپنی توجہ انا کے خول کے چھلکے اترنے پہ سوچنے میں لگائی۔

اب اگر اس بات کا مفہوم یہ لیا جائے کہ روحانی علوم کی تدریس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ مرید یعنی شاگرد میں چوں وچراں تو نہیں۔ اگر اُس مین چوں وچراں ہو تو علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس بات کو مان کر اس موضوع پہ غور و فکر ختم کر دے۔ لیکن یہ فیصلہ صادر کرنے سے پیشتر ہی اُس کے اندر سے یہ سوال ابھرا کہ اگر غزالی میں چوں و چراں ہوتی تو چپ چاپ بات ماننے کھرے ہی کیوں ہو جاتے؟ انہوں نے تو سیدھے سیدھے مجھے منظور ہے کہہ کر سرِ تسلیم خم کر ہی دیا تھا پھر مزید چوں وچراں کو آزمانے کے لئے تو یہ مار کا پروگرام کچھ زیادہ ہی سخت نہیں ہو گیا؟ اور شبلیؒ نے تو پہلے ہی جملے میں اس چوں وچراں کی ہوا ہی نکال دی تھی کہ ۔۔ ہمارے یہاں عمل پہلے ہے علم بعد میں اور اگر تمہیں یہ بات سمجھ آتی ہے اور تم اس پر آمادہ ہو تو ٹھیک ہے تم رک جاؤ ورنہ واپس جا سکتے ہو۔ اگر غزالیؒ میں چوں وچراں ہوتی تو وہ بحث کرتے۔ وہ وہاں رکنے پر مجبور تو تھے نہیں۔ وہاں سے چلے آتے۔ کہہ دیتے کہ کیسا عجیب شخص ہے؟ کیسی الٹی فرمائش کر رہا ہے؟ میں اتنا بڑا عالم ہوں، میں ایسا کام کیوں کروں؟ وہ بھی ایک دن نہیں دو دن نہیں پورے ایک ہزار دن سے زائد وہ وہی کام کرتے رہے۔ جو کسی طرح عقل کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا تھا۔ یہ معاملہ صرف چوں وچراں کی پرکھ کا معاملہ نہیں تھا بلکہ یہ ضرور کوئی اور ہی بات تھی اور وہ۔۔۔ اُساور۔۔ ہی بات کی کھوج میں لگے رہنے پر خود کو مجبور پا رہا تھا۔

ایک روز وہ اپنے دفتر میں بیٹھا، کسی صاحب کی اپنے ساتھ کی جانے والی زیادتی کا شکوہ کر رہا تھا کہ میں نے اُس کے ساتھ یہ کیا، میں نے اُس کی خاطر وہ کیا، لیکن اُس نے اُلٹا مجھے بُرا کہا، میرے ساتھ بُرا کیا۔ آج کل تو نیکی کا زمانہ ہی نہیں۔۔ جس سے بھلا کرو وہی جوتے مارتا ہے۔۔۔ کہ اچانک اُس کے اندر ایک جھماکہ سا ہوا۔۔۔ وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ اُس نے سوچا بھلا کرنے پر جوتے پڑنا تو واقعی عجیب سی بات ہے! کہیں حضرت امام غزالی کو یہی سبق تو نہیں دیا گیا تھا۔۔۔ کر بھلا اور کھا جوتے۔۔۔ کھا چپتیں اور کر بھلا!

اُس کی ذہنی رو لاشعور سے آئے ہوئے پیغام کا جائزہ لینے لگی۔ حضور ﷺ کی پوری زندگی بھی تو اس پیغام کا عملی نمونہ ہی تو تھی۔ آپ ﷺ سے بڑھ کر بنی نوع انسان کی بھلائی اور خیر خواہی بھلا اور کس نے چاہی ہو گی؟ لیکن آپ ﷺ کے قبیلے اور قوم نے آپ ﷺ کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ آپ ﷺ کی بھلائی کا جواب تو نہیں تھا؟ آپ کو ڈانٹا ڈپٹا جاتا رہا۔۔۔ پھر مار پیٹ شروع ہوگئی۔۔ پھر معاشی مقاطعہ۔۔ پھر انہیں گھیر کر شعب ابی طالب میں تین سال تک گزر بسر پر مجبور کیا جانا۔۔ وہاں سے نجات ملی تو آپ کی زندگی پر پے در پے حملے ہونا اور پھر ہجرت کی رات تمام قبائل کے نوجوانوں کا مل کر آپ ﷺ کی زندگی کے درپے ہونا۔۔ یہ سب کیا تھا؟ آپ ﷺ کا لوگوں سے بھلا کرنے کا جواب ہی تو تھا اور پھر ہجرت کے بعد غزوہ کے بعد غزوہ۔۔ ساری زندگی بھلا کرنے پر مار ہی تو کھاتے رہے اور وہ بھی اپنوں ہی کے ہاتھوں۔

اُس کو لگا کہ اُس کے اندر ہونے والے جھماکے نے اُس کے اندر اتنی روشنی بھر دی ہے کہ وہ فضا میں تحلیل ہونے کو ہے۔ بات سمجھ آ رہی ہو تو انسان لذتِ آگہی سے سرشار ہو جاتا ہے۔۔۔ اور یہ اچانک ہو جائے۔۔ ایک طویل عرصے کے بعد۔۔۔ وقت کی ایک چھوٹی سی اکائی میں لاشعور کا بند دریچہ وا ہو کر کسی بندے کو اچانک نواز دے تو بندہ متضاد کیفیات میں گھر کر رہ جاتا ہے۔ اُس کا جی چاہتا ہے کہ وہ رو دے۔۔ ہنس دے۔۔ سجدے میں گر جائے یا خوشی کے مارے سر کے بل اُلٹا کھڑا ہو جائے اور جب وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا تو وہ گم سم ساکت و صامت اور خاموش ہو کر اس وجدانی آگہی کا لطف لینا شروع کر دیتا ہے۔

اُس کو اس بات کی سمجھ آ رہی تھی کہ انا کے خول کے چھلکے اترنے سے کیا مراد ہے؟ جب انسان کی انا کے خول کے چھلکے اتر جاتے ہیں تو اُس میں وہ صفت رحمانی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ بھلائی کے جواب میں کی جانے والی بُرائی کا

برا ماننے سے کئی قدم آگے بڑھ کر برائی کرنے والوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی پہ ایسا قائم ہو جاتا ہے کہ اُس کو جان سے جانا تو گوارا ہوتا ہے لیکن بھلائی سے باز آنا نہیں۔ وہ یہ جان لیتا ہے کہ بھلائی کے عوض بُرا ہونے کا بُرا نہ منانا ایک اچھی بات اور خوبی سہی لیکن اصل خوبی تو یہ ہے کہ انسان بُرا کرنے والوں کے ساتھ بھلائی اور اچھا کرتا ہی رہے۔

خیال کی چوٹ

ہمارے روّیے ہماری طرز فکر سے جنم لیتے ہیں۔۔۔۔ یا یوں کہہ لیجیئے کہ ہماری طرزِ فکر ہمارے روّیوں کی اصل بنیاد ہے۔ اگر طرزِ فکر میں کوئی کمی یا خامی ہو تو اُس کا اظہار ہمارے روّیوں میں ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنے کسی روّیے کو درست کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی طرزِ فکر میں مناسب تبدیلی لانا ناگزیر ہوتا ہے۔

ہم جو کچھ کہتے، سنتے یا کرتے ہیں وہ سب کا سب ہمارے اُس ذہنی سانچے میں ڈھلا ہوتا ہے جو ہماری طرزِ فکر سے بنتا ہے۔ ہمارا سونا، جاگنا، اُٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا، لوگوں سے ملنا جلنا، رہنا سہنا۔۔ سب ہماری سوچ اور طرزِ فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔ اندازِ نشست و برخاست، نظم و ضبط کی تربیت ہمیں مہذب، شائستہ، سلیقہ مند اور تمیز دار بناتی ہے اور اگر ان باتوں پہ مناسب توجہ نہ دی جائے تو ہم غیر مہذب، ناشائستہ، بے سلیقہ اور بد تمیز کہلاتے ہیں۔

ہمارے روّیے درست ہوں تو ہمیں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ہمیں سراہا جاتا ہے۔ لیکن جب یہ روّیے درست نہ ہوں تو لوگ ہمیں سراہنے کی بجائے ناپسندیدگی سے دیکھتے ہیں۔ اب یہ بات بھی ہمارا ایک رویہ ہی تو ہے کہ ہم اس بارے میں کس قدر حساس ہیں، اُس کا کتنا اثر لیتے ہیں یا بالکل نہیں لیتے۔

عام طور پر لوگ اپنے ظاہری روّیوں کی اصلاح اور درستی پر تو کچھ نہ کچھ توجہ دیتے ہیں لیکن اپنے باطنی رویّوں کی بابت کم ہی توجہ دیتے حالانکہ ہمارے باطنی روّیے اور رجحانات ہی سارے ظاہری رویّوں کی بنیاد ہوتے ہیں۔

اس کی ایک نہایت عام سی مثال غصہ کرنا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ غصہ کرنا اچھی بات نہیں۔ ہمارا دین و مذہب بھی اس کی ممانعت کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں تو اللہ تعالیٰ نے یہاں تک فرمادیا ہے کہ اللہ غصہ کرنے والوں کو

پسند نہیں کرتا بلکہ غصہ پی جانے اور معاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہم قرآن کو اپنے سینوں سے لگانے کے باوجود ،اللہ تعالیٰ کے اُس حکم اور فرمان کی سرتابی کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ ہر انسان غصہ کرتا ہے تو اپنے سے کمزور پر۔ شوہر گھر آتا ہے تو بیوی بچوں پر غصہ کرتا ہے، باہر اپنے افسر یا باس کو پیٹھ پیچھے بُرا کہے گا لیکن اُس کے سامنے بھیگی بلی بنا، اُس کا غصہ سہتا رہے گا۔ اساتذہ بچوں پہ اتنا غصہ کریں گے کہ بچے علم و تعلیم سے ہی نفرت کرنے لگ جاتے یں لیکن یہی اساتذہ پرنسپل اور ہیڈ ماسٹر کے سامنے اپنے غصہ کرنے کے عمل کو درست ثابت کرنے کی توجیہات کا انبار اُس کے سامنے رکھ دیں گے۔

جب کسی سے یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کو غصہ نہیں کرنا چاہیے تو اس کا پہلا جواب تو یہی ہوتا ہے کہ اُس نے مجھے غصہ دلا دیا ۔۔اُس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا یا یہ کہا جاتا ہے کہ ہاں آپ درست کہتے ہیں۔ مجھے غصہ آگیا تھا۔ گویا ہمارے ذہنوں میں یہ بات کچھ اس طرح سے راسخ ہے کہ غصہ آنا ایک فطری عمل ہے۔ اب یہ بات کوئی نہیں سوچتا کہ اگر یہ بھوک پیاس کی مانند کوئی فطری عمل ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس سے منع ہی کیوں فرماتا ؟ اگر اللہ نے اس سے منع کیا ہے تو اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ یہ کوئی فطری عمل ہی نہیں ہے بلکہ درحقیقت یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کی فطری صلاحیتوں کو دھندلا کر کے رکھ دیتا ہے، اُن کو گہنا دیتا ہے۔

اسی طرح گفتگو کے دوران کسی کی بات سننے کے بعد اپنی بات کا آغاز ۔۔۔''جی نہیں''۔۔کے الفاظ سے کرنا ایسا روّیہ ہے جس کی طرف شاذ و نادر ہی کسی نے توجہ کی ہو۔۔۔ وہ لوگ جو ''نہیں'' یا ''جی نہیں'' کو بطور تکیہ کلام اپنائے ہوتے ہیں، وہ دوسرے کی بات کو بلا سوچے سمجھے رد کر رہے ہوتے ہیں اس کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ خود کو دوسروں سے اتنا بڑا اور برتر سمجھتے ہیں کہ کسی کی کہی ہوئی بات کو ماننا اُن کے لیے بہت دشوار

ہوتا ہے۔ وہ ہر بات کو اس لئے رد نہیں کرتے کہ وہ غلط ہوتی ہے بلکہ وہ اُس کو اس لئے رد کرتے ہیں کہ اُن کے اندر تردید کرنے کی عادت پختہ ہو چکی ہوتی ہے۔ اس رویے کا شکار انسان اکثر اپنے شوقِ تردید میں درست اور صحیح باتوں کی بھی تردید کرتا چلا جاتا ہے۔

ایک دوسرا روّیہ اس سے بھی عجیب سا ہے۔ کسی کی بات سُن کر اپنی بات کا آغاز ۔۔۔ ''آپ درست کہہ رہے ہیں لیکن ۔۔۔'' یا ''جی ہاں ۔۔ ٹھیک ہے ۔۔۔ لیکن ۔۔۔'' کے الفاظ سے کیا جاتا ہے۔ یعنی ''لیکن'' کہہ کر پہلے دوسرے کی پوری بات کو مشتبہ بناتے ہوئے اُس کی تردید کی جاتی ہے اور پھر اپنی بات کہی جاتی ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ''لیکن'' کہنے سے پہلے ۔۔ ''آپ درست فرما رہے ہیں'' کہنا کیوں ضروری سمجھا جاتا ہے؟ اگر اخلاقاً ایسا کہا گیا اور وہ بات درحقیقت درست نہ تھی تو کیا یہ جھوٹ نہ ہوا اور اگر واقعتاً درست تھی تو پھر اُس میں ''لیکن'' کی اضافت کا کیا مفہوم ہوا؟

سوچتے سوچتے اُس کی ذہنی رو اس بات پر مرکوز ہو گئی کہ ہمارے رویوں میں الجھاؤ اور پیچیدگی کیوں جنم لیتی اور پروان چڑھتی ہے؟ اُس نے اس بات کو مختلف زاویوں سے سوچا۔ اُس کو اس کی مختلف وجوہات خیال میں آتی رہیں۔ اُس نے اپنے ذہن میں ابھرنے والی ان مختلف توجیہات کا جائزہ لیا لیکن کوئی بھی توجیہہ اور جواب اُس کو مطمئن نہ کر سکا۔ جب اطمینان میں کمی واقع ہونے لگتی ہے تو تلاش و جستجو کو مہمیز لگتی ہے اور انسان اس کھوج میں لگ جاتا ہے کہ کسی طرح وہ اُس چیز کو حاصل کر لے جو اُس کو طمانیت کا احساس دے سکے۔ ذہن اور روح کی بیشتر کاوشیں بنیادی طور پر طمانیت قلب ہی کے لیے تو ہوتی ہیں۔

ذہن کی تمام تر تگ ودو کا ایک ہی مقصد و مدعا ہوتا ہے کہ چین نصیب ہو جائے۔ کچھ لوگ چین کی بانسری بجانے کے لئے مادی وسائل کا سہارا لیتے اور کچھ مادی وسائل سے صرف کرتے ہوئے غیر مادی وسائل پہ تکیہ کئے رہتے ہیں۔ جب کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو مادی اور غیر مادی دونوں ہی قسم کے وسائل سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔ مقصد ہر ایک کا ایک ہی ہوتا ہے کہ کسی صورت اطمینان اور چین ملے۔

مادی وسائل اپنی کوتاہ عمری کے سبب غیر قیام پذیر اور بے ثبات ہونے کے باعث جو سہولتیں مہیا کرتے ہیں وہ سہولتیں بھی بے ثبات اور غیر قیام پذیر ہوتی ہیں اور اس ہی لئے اُس سے حاصل ہونے والا اطمینان اور چین بھی بے ثبات اور ناپائیدار ہی ثابت ہوتا ہے۔ اس ہی لئے حقیقت شناس لوگ اُن جہتوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں جو لافانی اور ابدی ہونے کے سبب ایک مستحکم اور پائیدار اطمینان، سکون اور چین کی ضمانت دیتے ہیں۔

مذاہب عالم کی گناہ اور ثواب کے ضمن میں تعلیمات کا سرسری سا جائزہ بھی اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ طمانیت قلب کی ان دو حالتوں کو ہی گناہ اور ثواب کے الفاظ سے واضح کیا جاتا ہے۔ جب اطمینان وقتی اور لمحاتی ہو تو وہ روح کی تشنگی کو اور بھڑکاتا اور طلبِ طمانیت میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ پھر یہ ایک ایسا چکر بن جاتا ہے جس سے باہر نکلنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

لاشعوری طور پر ہر فرد اس بات سے واقف اور آگاہ ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کے اطمینان سے دوچار ہے۔ فانی یا لافانی، لمحاتی یا ابدی، غیر مستحکم اور ناپائیدار یا قیام پذیر اور پائیدار۔۔ اُس کا شعور اس فرق کو محسوس کرتا ہے یا نہیں، یہ بات فرد کا اپنا معاملہ ہے کہ وہ اپنے شعور کی تربیت میں اس بات کا کتنا اہتمام کرتا ہے کہ وہ اس فرق کو جان لے اور اُس کو ہمہ وقت ملحوظ خاطر بھی رکھے۔

لاشعور بہر حال اس بات کو ضمیر کے ذریعے انسانی شعور میں داخل کرنے میں مصروف رہتا ہے کہ وہ اطمینان اور چین کے لئے جو راہ انتخاب کرنے جارہا ہے وہ قیام پذیر ہے بھی یا نہیں؟ جب شعور اپنے اندر اس بات کا ادراک کر لیتا ہے کہ وہ ایک ایسا سودا کر رہا ہے جس کا اجر و ماحاصل پائیدار نہیں ہے تو وہ فرسٹریشن کا شکار ہو جاتا ہے۔

اب بجائے اس کے کہ وہ اپنی غلطی کی اصلاح کی طرف متوجہ ہو، اپنی راہ کو درست کرے، وہ غلطی کا اعادہ کرنے لگ جاتا ہے۔ اب ایک ایسے فساد کا آغاز ہوتا ہے جو قلب و نظر کو ہی نہیں ذہن و جسم کو بھی مبتلائے غم کرتا چلا جاتا ہے۔ گناہ کے اثرات فرد کے اندر سے ابھر کر اُس کے چہرے پر نمودار ہوتے ہیں۔ اُس کے جسم و جاں کو اپنی گرفت میں لیتے ہیں اور پھر ایک فرد کی تکلیف کی لہریں، چھوت کی بیماری کی طرح پورے معاشرے میں نفوذ کرتی چلی جاتی ہیں۔

اسی طرح اگر شعور یہ جان لیتا ہے کہ جس کام کو وہ کر رہا ہے، اُس کا اجر و مال پائیدار اور قائم رہنے والا ہے تو خوشی اور مسرت کی لہریں اُس کے اندر سے ابھرتی، اُس کے چہرے بشرے سے منعکس ہوتی، اُس فرد کے ارد گرد پھیلتی چلی جاتی ہیں۔

اسلام میں اصل راہ کی طرف مراجعت اور واپس پلٹ آنے کے عمل کا اصطلاحی نام توبہ ہے۔ اس کا عام طور پر یہی مفہوم لیا جاتا ہے کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ لیکن کیا یہ مفہوم توبہ کی اصل روح سے کوئی مناسبت بھی رکھتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ توبہ کرنے سے انسان پاک و صاف ہو جاتا ہے۔ یعنی اُس کے گناہ کے اثرات مٹ جاتے ہیں۔ اب اگر اس مفہوم کو درست مان لیا جائے کہ میں یہ غلطی آئندہ نہیں کروں تو اس سے کی گئی غلطی یا گناہ

کے مٹنے کا کون سا قرینہ نکلتا ہے؟اس خیال پہ آ کر اس کے ذہن نے یہ طے کیا کہ توبہ کے اصل مفہوم کا کھوج لگانا چاہیے۔ وہ توبہ کے اصل مفہوم کی کھوج میں چل پڑا۔

اُس کو سب سے پہلی کی جانے والی توبہ کا خیال آیا۔ حضرت آدمؑ سے غلطی ہوئی۔ اُس ارتکابِ گناہ سے اُن کے اندر خوشی اور اطمینان کا پائیدار اور مستحکم پیٹرن بگڑ گیا۔ جب خوشی اور اطمینان کا پیٹرن بگڑا تو خوشی غم میں اور اطمینان خوف میں ڈھل گیا۔ طمانیت کی جگہ بے سکونی چھا گئی۔ جب جنت نے اُن کو بے سکونی، خوف اور غم کی لہریں نشر کرتے دیکھا تو جنت کے ماحول نے انہیں رد کر دیا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے سیکھے ہوئے کلمات کی مدد سے توبہ کی۔

حضرت آدمؑ کا شجر ممنوعہ کے قریب جانا، خود کو ننگا محسوس کرنا، اللہ کا اُن سے باز پرس کرنا، اُن کا اپنی غلطی تسلیم کرنا، اُن کا توبہ کرنا۔۔۔ یہ سب باتیں تقریباً ہر مذہب کے ماننے والے جانتے ہیں اور اُن سے اپنے اپنے مزاج اور مصلحتوں کے مطابق مفہوم اخذ کرتے ہیں۔ توبہ کا تصور بھی ہر مذہب میں ملتا ہے۔

وہ اس بات پہ غور کرنے لگا کہ توبہ کرنے سے جو کیفیت اصل میں پیدا ہونی چاہیے، وہ کیا ہے؟ اپنے بچپن، لڑکپن اور جوانی میں خود اُس سے جب بھی کوئی غلطی ہوتی تو اُس کی ماں اُس سے یہی کہتی کہ توبہ کرو۔ اُس وقت اُس کے ذہن میں یہی ہوتا کہ جو ہوا سو ہوا، اب آئندہ وہ اُس کام کو نہیں کرے گا۔

اس نے بہت غور سے اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی کہ توبہ کا میکانزم کیا ہے؟ اُس کے سبب کئے ہوئے غلط کام کیسے مٹ جاتے ہیں۔ اب اگر کوئی کسی کے گھر کو آگ لگا دے اور کہے کہ میری توبہ۔ تو اس سے آگ میں جل مرنے والوں اور اشیائے سوختہ سے ہونے والے نقصان اور پچھتاوے کا کیسے اور کیوں کر خاتمہ ہو سکتا ہے؟ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ اُس کے خلفشار میں اضافہ ہونے سے اُس کے چہرے پر فکر و تردد کی لکیریں بنتی بگڑتی رہیں۔

وہ انہی سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ اُس کی بیوی نے اُس سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ آپ کچھ الجھے ہوئے سے ہیں۔'' اُس نے بغیر تمہید کے کہا۔ ''میں سوچ رہا ہوں کہ اگر میں توبہ کروں تو مجھے یہ کیسے معلوم ہو گا کہ میری توبہ قبول ہوئی کہ نہیں؟''

اُس کی بیوی نے پہلے تو کچھ دیر اُس کو جانچا کہ وہ ایسا کیوں سوچ رہا ہے؟ اُس کے شوہر سے آخر ایسا کیا گناہ ہو گیا ہے جس سے توبہ کرنے کی بات وہ سوچ رہا ہے؟ اپنی معلومات کی روشنی میں جب وہ اپنے شوہر کے کسی ایسے گناہ کی نشاندہی نہ کر سکی جو اُس سے ماضی قریب میں سرزد ہوا ہو تو اُس نے اندازہ لگایا کہ یہ ضروری کوئی ''شوہرانہ'' غلطی رہی ہو گی تبھی تو وہ اُس کے علم میں نہیں اور اُس کا اعتراف وہ اپنے خاوند کو توبہ پر مزید مائل کر کے ہی سُن سکے گی۔

اس سوچ کے تحت اُس نے کہا۔

''توبہ کرنے سے اگر سکون اور اطمینان کا احساس ہو جائے تو مان لینا چاہیے کہ توبہ قبول ہو گئی ہے اور مزید یہ کہ اُس غلطی کا اعادہ نہیں ہونا چاہیے۔ یعنی توبہ کرنے کے بعد دوبارہ اُس کام کو کرنے کا خیال تک بھی نہیں آنا چاہیے۔ لیکن میں بھی تو سنوں کہ آپ یہ سب کیوں سوچ رہے ہیں؟''

اُس نے بیوی کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا کہ یہی بات تو میں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ توبہ کرنے سے اطمینان اور سکون کیوں حاصل ہوتا ہے؟ یہ ایک علمی مسئلہ ہے۔

اس پر اُس کی بیوی نے اپنی توقع کے غلط ہونے کے صدمے اور شوہر کے پاک صاف ہونے کی خوشی کو چھپاتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''بس اتنی سی بات ہے۔ بھئی جب بندہ توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس بندے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں تو اُس بندے کو اطمینان اور سکون نہیں ملے گا تو اور کیا ہو گا؟''

اس نے روایتی سے جواب کو سُنا اور اُس کے اندر اترتا چلا گیا۔ اچانک اُس کو ایک بات سمجھ آگئی۔ اُس نے حیرت آمیز مسرت سے کہا۔

''ارے نہیں بھئی۔ مجھے تو یہ سمجھ آئی ہے کہ جب بندہ توبہ کرتا ہے تو وہ دراصل اللہ کی موجودگی کا اقرار کرتا ہے۔ اللہ تو ہمہ وقت مخلوق کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ اللہ کو متوجہ ہونا نہیں پڑتا۔ دراصل توبہ کا میکانزم کچھ یوں بنتا ہے کہ توبہ کرنے سے بندے کے اندر وہ نظر متحرک ہو جاتی ہے، جس کی مدد سے وہ اللہ کی اپنی جانب نگران اور نگہبان ہونے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ اس بات کا شعور حاصل ہونے، اس بات کا ادراک ہونے اور اس بات کا مشاہدہ ہونے سے کہ اللہ اُس کا نگران اور نگہبان ہے وہ گناہ کر ہی نہیں سکتا۔ یہ بات وہ بزرگ و برتر ذات اُس کی طرف متوجہ اور نگہبان ہے اُس کے اندر کیف و سرور بھر دیتی ہے اور اُس کے رگ و پے میں بالکل ویسا ہی اطمینان دور کرنے لگتا ہے جو ایک بچے میں اُس وقت موجزن ہوتا ہے جب اُس کی ماں اُس کی طرف متوجہ اور اُس کی ہر ہر حرکت سے محظوظ ہو رہی ہو۔ اس سے بچے کو یہ اطمینان بھی ہو جاتا ہے کہ ماں اُس کو غلطی کرنے ہی نہیں دے گی۔ لہذا یہ اطمینان کا دوسرا پہلو ہوا۔

اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ توبہ گناہ کو کھا جاتی ہے۔''

''چلیں اچھا ہے کہ آپ کا مسئلہ حل ہوا میں تو سمجھی تھی کہ نہ جانے کیا مسئلہ ہے جو آپ اتنے پریشان ہو رہے تھے۔'' اُس کی بیوی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

بیوی کی بات سُن کر اس توقع پر ایک چوٹ سی پڑی کہ وہ اُس کی خوشی کو محسوس کر کے خوش ہو گی جو اپنے افکار میں ایک نئی بات سوجھنے پر اُس نے محسوس کی تھی اور اُس وقت وہ اُس مسرور کن کیفیت کا مزہ خراب نہیں کرنا چاہ رہا تھا اس لئے نظر انداز کر دیا جائے۔ اُس خوشی کو اپنے اندر سمیٹتے ہوئے، اُس کا دھیان دوبارہ انسانی روّیوں کی طرف مبذول ہو گیا۔

اُس نے سوچا کہ یہ دیکھنا چاہیے کہ دنیا کی سب سے عظیم کتاب قرآنِ مجید فرقانِ حمید میں انسانی روّیوں کی بابت کن کن حقائق کو واشگاف کیا گیا ہے۔ اس تلاش کے جذبے اور خیال سے تلاوتِ کلام پاک کے دوران متوجہ رہنے لگا۔ ایک روز تلاوت کرتے کرتے وہ لفظ ''مومن'' کے مفہوم پر غور کرنے لگ گیا۔ مومن لفظ ''امن'' سے مشتق ہے تو اس کا اصل مفہوم تو امن میں رہنے والا یا امن سے رہنا والا ہونا چاہیے۔ اس کا ترجمہ، صاحبِ ایمان، ایمان رکھنے والے کیا جاتا ہے اس بات کو آپس میں کیا نسبت ہو سکتی ہے؟

رخشِ خیال آگہی اور سمجھ کی تلاش میں سرپٹ دوڑنے لگا۔ اس نے سوچا۔ قرآن میں انسانوں کے تین گروہوں کا تذکرہ خصوصی طور پر توجہ چاہتا ہے۔ کافر اور مشرک، منافق اور ریاکار اور مومن اور متقی۔

کافر اور مشرک وہ لوگ ہیں جو بات سُن کر اُس کو ماننے کی بجائے اپنی مصلحتوں یا ہٹ دھرمی کے باعث سیدھے سیدھے رد کر دیتے ہیں۔ اُن کا کسی حقیقت کو رد کرنا کفر ہوا۔ حقیقت کو رد کرنے کے ساتھ ساتھ بتائی گئی بات میں اضافہ یا کتر بیونت کر کے، اپنی طرف سے کوئی غیر حقیقی بات شامل کرنے والے لوگوں کو مشرک کہا گیا ہے۔

جب کہ بات سُن کر تسلیم کرنے والے لیکن اُس پر عمل پیرا نہ ہونے والے لوگوں کو منافق کہا گیا ہے۔ بات اگر محض دکھاوے کے لئے تسلیم کی گئی ہو یا اُس پہ محض دکھاوے کے عمل ہو یعنی عمل میں صدق نیت اور خلوص شامل نہ ہو تو ایسے لوگوں کو قرآن ریاکار کہتا ہے۔

وہ یہ سوچ کر خوش ہو ہی رہا تھا کہ اُس نے ایک واضح اور دو ٹوک بات سمجھ لی ہے کہ اُس کے ذہن میں اپنے مراد کا کہا ہوا جملہ بازگشت کرتا چلا گیا۔۔"تو پھر اس سے ہوا کیا؟"

وہ ایک مخمصے میں پڑ گیا۔اُس کو اُس وقت اس بات کا اپنے اندر گونجنا سمجھ نہیں آرہا تھا۔اس سے کیا ہونا چاہیے تھا۔جب بات سمجھ میں آجائے تو کیا ہونا چاہیے ؟ابھی وہ اس کا جواب تلاش کر کے اُس کو مفہوم اور الفاظ کے قالب میں ڈھالنے کی تگ و دو کر ہی رہا تھا کہ اچانک ایک خیال کوڑے کی مانند لہراتا ہوا اُس کے شعور پر چوٹ لگا گیا۔اُس نے خود سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"تم خود کو کس کیٹگری میں دیکھتے ہو؟"

اپنے خیال کی اس چوٹ سے اُس کا ذہن جھنجھنا اُٹھا۔اپنی تہی دامنی اور احساسِ زیاں پہ وہ بلبلا ہی تو اُٹھا۔اُس نے خود میں اتنی ہمت بھی نہ پائی کہ وہ خود سے آنکھیں چار کر سکتا۔وہ خود کو مومن کہتا تو کس منہ سے ؟اُس میں انکار اور رد کرنے کے لئے درکار ہمت اور جرات کا بھی فقدان تھا۔وہ تو محض دکھاوا ہی دکھاوا تھا۔بات ماننے کا دکھاوا۔بات سمجھنے کا دکھاوا۔بات پہ عمل کا دکھاوا۔

اگر وہ اپنی بدنصیبی پہ رو دیتا تو یہ محض ایک دکھاوا ہی ہوتا اس لئے وہ رو بھی نہ سکا۔

انگاروں کی کاشت

وہ ایک دکان پہ سودا لینے گیا۔ دکاندار نے اُس کو جانچنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے اُس کی بات سنی۔ مطلوبہ اشیاء اُس کی تحویل میں دیتے ہوئے دکاندار نے رقم بتائی۔ -/175 روپے۔

''یہ کچھ زیادہ نہیں بتا رہے ؟'' اُس نے کہہ دیا۔

دکاندار کو اُس کی یہ بات اچھی نہیں لگی اُس کے چہرے کی شکنیں گہری ہو گئیں۔ اُس نے ایک ایک چیز کے نرخ بتا کر کل میزان بتایا اور مصنوعی سی خوش اخلاقی سے کہا۔ ''اجی مہنگائی ہی اتنی ہے۔ کوئی کیا کرے۔ آپ بھی سچے ہیں۔''

اُس نے پانچ سو کا نوٹ دکاندار کو دیا۔ دکاندار نے نوٹ لے کر اُس کو اُونچا کر کے روشنی میں دیکھا پھر مسل کر اُس کے اصلی ہونے کی تسلی کی۔ کاؤنٹر کی دراز سے باقی رقم نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھی۔

دکان سے اترتے ہوئے اُس کی ذہنی رو نے اچانک ہی پلٹا کھایا۔ ''مجھے دکاندار سے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ اُس نے کچھ زیادہ رقم بتا دی ہے۔ میں نے اس پر ناجائز ہی شک کیا۔ اُس نے اُس تلخی کو کم کرنے کے خیال سے پلٹ کر دکاندار کو شکریہ کہا اور گھر کو چل دیا۔

گھر پہنچ کر سودے کا تھیلا بیوی کے حوالے کیا۔ بیوی نے تھیلا کھول کر ایک نظر سامان کو دیکھا اور پوچھا کہ وہ کس دکان سے لایا ہے۔ اُس کا جواب سُن کر تبصرہ کیا۔ ''وہ دکاندار تو ہے ہی چور۔ اُس سے تو سودا لینا ہی نہیں چاہیے۔''

''لیکن وہ تو مجھ ہی کو چور سمجھ رہا تھا۔ جبھی تو وہ مجھے تھانیداروں والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میرے دیئے ہوئے نوٹ کو بھی تو وہ کیسے مسل مسل کر جانچ رہا تھا۔'' اس نے سوچا لیکن منہ سے کہا کچھ نہیں کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ اُس کی بیوی اس پہ بھی خود اُسی کو الزام دینے کا کوئی نہ کوئی جواز نکال لے گی۔

اگلے روز وہ بچوں کے سکول گیا۔ وہاں سکول میں اساتذہ سے باتوں کے دوران بچوں کے بُرے روّیوں کا ذکر چل نکلا۔ ایک استاد نے کہا۔ ''وہ تو بچوں کو اچھی اچھی باتیں ہی تعلیم کرتے ہیں لیکن جب گھروں کا ماحول ہی ٹھیک نہیں ہوگا تو بچے کیا خاک سیکھیں گے۔'' پھر وہ بتانے لگے کہ بچے اُن کی باتوں پر دھیان نہیں دیتے۔ سبق یاد کر کے نہیں آتے۔ ہوم ورکوہ کر کے نہیں آتے۔ ہوم ورک نہ دیں تو ماں باپ شکایت کرتے ہیں کہ اُن کو ہوم ورک دیا ہی نہیں جاتا۔ یہ سب اس لیے ہے کہ ماں باپ بچوں کی تربیت میں دلچسپی نہیں لیتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے بچوں کو اسکول داخل کر دیا اب ان کی تربیت کرنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔ ٹھیک ہے کہ اساتذہ کا فرض ہی یہ ہے کہ وہ بچوں کی تربیت کریں لیکن بچے تو ہمارے پاس کل پانچ چھ گھنٹے ہی رہتے ہیں اُس میں بھی اُن کو آٹھ دس اساتذہ سے واسطہ پڑتا ہے۔ اٹھارہ گھنٹے تو بچے اپنے گھر میں اپنے ماں باپ کے ہمراہ ہوتے ہیں۔ اب اگر وہ اٹھارہ گھنٹوں میں اُن کو اور کچھ نہیں تو اتنا ہی کہہ دیں کہ تمہیں سکول میں جو کچھ بتایا گیا ہے، اُس کو مانو اور اُس پہ عمل کرو۔ اس سے ہمارا کیا بھلا ہوگا خود انہی کے بچے بہتر ہوں گے۔

ایک اور استاد نے تو صاف صاف ہی کہہ دیا آج کل کے بچے ہی ٹھیک نہیں ہیں۔ وہ نہ تو اپنے اساتذہ کی سنتے ہیں اور نہ ہی انہیں اپنے والدین کی کوئی پرواہ ہے۔ وہ تو اپنی ہی منواتے ہیں۔ اُن کو کوئی تمیز ہی نہیں سکھائی جاتی۔ پہلے

زمانے میں بچوں کا دم نکلتا تھا استاد کے نام سے۔ ماں باپ کا ادب لحاظ اتنا ہوتا تھا کہ باپ نے کہہ دیا وہ پتھر کی لکیر ہوتا تھا۔ اب تو کوئی سنتا ہی نہیں۔

گھر آکر اُس نے اپنے دونوں بیٹوں سے بات کی کہ آج میں تمہارے سکول گیا تھا۔ دونوں بچے جیسے اسی بات کا انتظار کر رہے تھے۔ دونوں نے بڑھ چڑھ کر بولنا شروع کر دیا۔

''اُنہوں نے ضرور ہماری شکایت کی ہو گی۔ وہ خود کچھ پڑھاتے وڑھاتے نہیں اور اوپر سے شکایتیں بھی کرتے ہیں۔'' اُس نے کہا۔ ''اگر تم لوگوں کا قصور نہ ہوتا تو وہ شکایت ہی کیوں کرتے؟ یہ بات تم لوگوں کو بالکل زیب نہیں دیتی کہ تم اپنے اساتذہ کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کرو۔''

بچوں نے اُس کی بات پہ بُرا سا منہ بنایا اور کہا۔ ''ابو ہمارا کیا قصور ہے؟ سارا قصور تو خود اُن کا ہے۔ انہیں بچوں کو قابو کرنا ہی نہیں آتا۔ وہ کلاس میں آتے ہیں تو لگتا ہے کہ گھر سے ہی لڑ کر آئے ہیں۔ کلاس میں آکر گپیں مارتے ہیں۔ کوئی سوال پوچھو تو کہہ دیتے ہیں گھر میں اپنے امی ابو سے پوچھو۔ ہوم ورک دیتے ہیں اگر کر کے جاؤ تو کوئی چیک نہیں کرتا لیکن نہ کیا ہو تو مارتے ہیں۔''

اُس نے اُس کی ساری باتیں سُن کر سر ہلایا اور اتنا کہا۔ ''بُری بات، اپنے ٹیچر کو کبھی بُرا نہیں کہتے۔ یہ بہت بُری بات ہے۔ اس نے بچوں کو وہاں سے ہٹا تو دیا لیکن وہ اُن کی باتیں سن کر سوچنے لگا۔ آخر اس کا کیا حل ہے؟

استاد بچوں کو، اُن کے ماں باپ کو مورد الزام قرار دیتے ہیں۔ ماں باپ بچوں کی فیس دیتے ہیں اور یہ توقع کرتے ہیں کہ اب بچوں کی تعلیم و تربیت کے فریضے سے وہ فارغ ہو گئے ہیں۔ بچے ہیں وہ اپنے اساتذہ کو بُرا سمجھتے ہی

نہیں، کہتے بھی ہیں اور اب تو اُن کی بُرائی کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ بچوں کو موقع دو تو وہ ماں باپ تک کو بُرا کہہ دیتے ہیں۔ یہ سب سوچتے ہوئے، اُس کا دم گھٹنے لگا۔

ابھی اُس کا ذہن بچوں، اساتذہ اور ماں باپ کی تکون کو ہی نہیں سلجھا پا رہا تھا کہ اُس کو گزشتہ روز کے دکاندار کا روّیہ یاد آگیا۔ اس نے سوچا۔ دکاندار گاہکوں کو بُرا کہہ رہے تھے۔ گاہک دکانداروں کو بُرا سمجھ رہے ہیں۔ پولیس والا ٹریفک والوں کو کوستا ہے کہ اُن کو سڑک پر چلنا تک نہیں آتا، کسی کو روڈ سینس ہی نہیں، جس کا جی چاہتا ہے گاڑی لے کر سڑک پر نکل آتا ہے۔ لوگ ہیں کہ پولیس والوں کو بُرا کہہ رہے ہیں۔ جہاں کہیں کوئی پولیس والا کھڑا ہو جاتا ہے وہیں ٹریفک جام ہو جاتا ہے۔ ان لوگوں کو ٹریفک تک کنڑول کرنا نہیں آتا۔ یہ تو صرف بھتے لے سکتے ہیں۔

افسر لوگ اپنے ماتحتوں کو بُرا بھلا کہتے بھی ہیں اور سمجھتے بھی ہیں۔ ہر افسر کے نزدیک اُس کے ماتحت کام چور اور سُست ہیں۔ ادھر ہر ماتحت اپنے افسر کو نالائق اور جاہل بتا رہا ہے۔ گھر میں میاں بیوی کو بُرا کہہ رہا ہے اور بیوی کو اپنے شوہر میں سوائے خامیوں اور کمزوریوں کے کچھ اور نظر ہی نہیں اتا۔ ایک ہمسایہ دوسرے کو بُرا سمجھتا جانتا ہے اور دوسرا پہلے کو اپنے نصیب میں لکھی ہوئی بُرائی جان کر رہ رہا ہے۔ ماں باپ بچوں کو کوس رہے ہیں اور بچے اپنے ماں باپ سے شاکی ہیں۔ اساتذہ نے بچوں کو بُرا جان کر اُن کی اصلاح سے ہاتھ کھینچ لیا ہے اور بچوں نے اساتذہ کو نااہل قرار دے کر اُن کی باتوں پہ توجہ دینا چھوڑ رکھا ہے۔

عوام اپنے لیڈروں کو بُرا کہہ رہے ہیں۔ مردہ باد کے نعرے لگ رہے ہیں۔ ادھر لیڈر عوام کو بے وقوف، جاہل اور غلط قرار دیتے ہوئے اُن کی مٹی پلید کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

اس نے بہت سر مارا۔ بہت سوچا لیکن اس کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس ساری صورت حال کو وہ کیوں

کر اور کس طرح ہضم کرے ؟اس کا بھلا کیا حل ہو سکتا تھا؟اس کا شعور اس بات کو سمجھنے کی ضد کر رہا ہے کہ معاشرے کا ہر جز ودوسرے کے خلاف ہو کر کتنی دیر قائم رہ سکتا ہے؟ معاشرے کا ہر جز ودوسرے جز و کے خلاف ہو کر کتنی دیر قائم رہ سکتا ہے؟ معاشرے کا ہر طبقہ دوسرے کے بر عکس اور خلاف چلنا ضروری قرار دے چکا ہے۔ غریب ، متوسط سے الجھ رہے ہیں متوسط طبقے کے لوگ امیروں سے ریاکاری کرتے ہوئے اُن کی عزت واحترام کا دکھاوا کرتے ہیں لیکن اندر ہی اندر نفرت اور حسد کی آگ میں جلتے ہیں۔ امیروں کے نزدیک یہ طبقے اُن کی دولت چھین لینے کے درپے ہیں۔ اس لئے وہ اُن دونوں سے ہی بیزار رہتے ہیں۔ اُن کے دلوں میں اُن کے لئے نفرت اور حقارت کے سوا اور کچھ نہیں۔

بارِ الہہ، یہ کیا مصیبت ہے۔ ہر طرف نفرت کی آگ کیوں بھڑک رہی ہے ؟اس کا انجام سمجھنا کچھ بھی تو دشوار نہیں۔ قدریں تبدیل ہونے کی بجائے ٹوٹ رہی ہیں اور ٹوٹ کر نئی بننے کی بجائے مٹ رہی ہیں۔ وحشت نے اُس کو دل گرفتہ کر دیا۔ اُس نے سوچا آج سے پیشتر یہ سب باتیں اس کے احساس میں ہوتے ہوئے بھی غیر محسوس کیوں تھیں؟ اُس کو اپنے دل میں اُٹھتی کسک کو دبانا دشوار ہوتا جا رہا تھا۔

رات کو سونے سے پیشتر مطالعہ کرنے کی عادت کے تحت اُس نے کتاب اُٹھائی۔ کتاب کا نام تھا ''کشکول''۔ ذہن میں ہونے والی اچھل کود اور الجھن کے باوجود نام دیکھ کر اس کے ذہن میں جملہ گونجا۔ دیکھیں فقیر کے کشکول میں کیا ہے؟ چند ہی صفحات کے بعد وہ کتاب کے مصنف کو داد دیتے ہوئے پڑھ رہا تھا۔

''ہم بحیثیت بزرگ بار بار اعلان کرتے ہیں کہ نوجوان نسل کے ذہنوں میں اُٹھ گیا ہے۔ ان کے اندر اخوت اور حیا نہیں رہی۔ جس کے اوپر مثالی معاشرہ تعمیر کیا جاتا ہے۔ خدارا اپنے گریبان میں منہ ڈالئے ۔ یہ بھی دیکھئے ہ

ہمارے قول و فعل میں کتنا تضاد ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود کہ ہم اپنا اختیار استعمال کر کے اس منافقانہ زندگی کو بدل سکتے ہیں۔ ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں۔ ہم جو خود نہیں کرتے، اُس کی توقع ہم اپنی اولاد سے کیوں کرتے ہیں۔ آج اگر ایک باپ جھوٹ کی ملع شدہ زندگی میں قید ہے، تو وہ اولاد سے کیوں کر توقع کر سکتا ہے کہ وہ سچی اور حق آشنا زندگی گزارے۔ بچے ماں کے پیٹ سے قاتل، چور، ذخیرہ اندوز، منافق، اسمگلر پیدا نہیں ہوتے۔ انہوں نے اپنے بزرگوں کو جو کچھ کرتے دیکھا ہے اسے ترقی دے کر فن بنا دیا ہے۔"

یہ سب پڑھ کر احساس کی شدت نے اس کے اندر ایک تحریک ابھار دی۔ اس نے آگے پڑھا:

"خالق کائنات نے اس دنیا کو محبت، خوشی، مسرت و شادمانی اور ایثار کا گہوارہ بنایا تھا۔ آج بھی دنیا کی ہر شے دیدہ بینا کو مسرت اور خوشی مہیا کرتی ہے۔ خوبصورت رنگ برنگ پرندے، چمکتی گاتی چڑیاں، فطرت کے شاہد منظر، پانی کے اتار چڑھاؤ، پہاڑوں کی بلندی، آسمان کی رفعت، پھولوں کا حسن، شاداب درختوں کی قطاریں۔ تاروں بھری رات، مدھر چاندنی کا اجالا، روشن روشن دن، ماں کی انکھوں میں محبت کی چمک، بچے کا مچلنا اور کلکاری بھرنا، بہن کے پیار کی پاکیزگی، بھائی کا اخلاص، بیٹی کا تقدس، باپ کی شفقت، یہ سب باتیں بلاشبہ نوع انسانی کے لئے خوشی اور شادمانی کا سامان ہیں۔ ایک ماں کی طرح زمین بھی یہی چاہتی ہے کہ اُس کی اولاد پر مسرت زندگی گزارے۔ زمین کو دوزخ نہ بنا دے، اس کے اوپر پھولوں کی بجائے انگاروں کی کاشت نہ کی جائے۔"

یہ پڑھ کر شدتِ احساس سے تپتے اعصاب پر جیسے شبنم کی ٹھنڈی پھوار پڑتی چلی گئی۔ ہر ہر لفظ میں خلوص اور آگہی کی دھڑکن اُس کو خود اپنے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ عبادت کے ظاہری حسن کے ساتھ ساتھ مفہوم کے موتی چنتا، اُس کی پر از حکمت معنویت سے محفوظ ہوتا چلا گیا۔ الفاظ کی تہہ میں چھپے علم و دانش کے جو

ہر پارے اُس کو بہت ہی نئے سے لگے۔۔ اُس نے اس کتاب کو پہلے بھی دو تین مرتبہ پڑھا تھا لیکن اُس وقت اُس کو جو مفہوم سمجھ آرہا تھا وہ اس سے پیشتر اُس کے تجربے میں نہ تھا۔

اُس نے لطف لیتے ہوئے سوچا کہ یہ تو اُس کا اپنا کشکول ہے جسے وہ ہاتھوں میں تھامے ذہن میں موجود گتھی کا حل طلب کر رہا ہے اور اُس کی جھولی میں گوہر مراد ڈالے جا رہے ہیں۔ شرط فقط اپنے کشکول کو پھیلائے رکھنے کی ہے۔ اُس نے کچھ اور ورق اُلٹائے۔ سامنے کی تحریر گویا خود اُس کے اپنے صدا اور بازگشت تھی۔

''اخبارات کے پورے پورے کالم اور کئی کئی سو صفحات کی کتابیں لکھی جا رہی ہیں کہ اس سے نوجوان نسل کی اصلاح مقصود ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ رشد و ہدایت کے ان طوفان خیز دعوؤں کے ساتھ اگر نوجوان نسل کے بڑوں نے اپنی اصلاح نہیں کی تو حالات نہیں سدھریں گے۔ ہم یہ بات کیوں بھول رہے ہیں کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اُس کا ذہن ایک سادہ ورق کی طرح ہوتا ہے۔ وہ وہی عادات واطوار اختیار کرتا ہے جو ماحول میں رائج ہیں ایک فرد واحد بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ بچہ وہی زبان بولتا ہے جو اُس کے ماں باپ بولتے ہیں۔ دراصل ہمارے نونہال من حیث القوم ہمارے کردار کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔''

'' قانونِ قدرت سے انحراف کی ہزاروں سزائیں ہمارے سامنے ہیں۔ نئے نئے موذی امراض کی یلغار ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ہر شخص افلاس کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ اولاد نالائق ہے یا والدین نالائق قرار دیئے جا رہے ہیں۔ دماغی عارضے آج جتنے عام ہیں، اتنے کبھی نہ تھے۔ ذرا زور سے دل دھڑکا اور آدمی لحد میں اتر گیا۔ عدم تحفظ کا یہ عالم ہے کہ پتہ بھی ہلے تو دل سینے سے باہر آجاتا ہے۔ گھر میں میاں بیوی کی تُو تکار سے نوجوان نسل شادی کے بندھن کو بوجھ سمجھنے لگی ہے۔ وسائل کے انبار ہونے کے باوجود روزی تنگ ہو گئی ہے۔ بے یقینی، درماندگی، پریشانی اور

عدمِ تحفظ کے اس دور میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہر شخص اپنے چھوٹوں اور احباب کو برائی سے بچنے کی تلقین کرتا ہے اور خود اُس پر عمل نہیں کرتا تو ہمارے سامنے یہ بات اجاتی ہے کہ نصیحت کا اثر اس لئے نہیں ہوتا کہ ہم خود بے عمل ہیں۔"

کسی نے اُس کے اندر صدا لاگئی۔" بے شک ہم خود بے عمل ہیں۔" اور پھر اس صدا کی تکرار ایک بازگشت بن گئی۔ رہ رہ کر اُس کے اندر سے ایک ہی بات ابھرنے لگی۔ سارا قصور ہمارا اپنا ہے۔ ہم خود بے عمل ہیں۔ اُس نے جانا کہ یہ اُس کے ضمیر کی آواز ہے جو اُس کی بے عملی کا احساس دلا رہا ہے۔ اُس کی بے عملی پہ نوحہ کناں ہے۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے اندر سے ابھرتی اُس صدا کو حافظے میں محفوظ کر لینے کو اُس کو دھیان سے سننے لگا۔ اُس کو لگا عورت بین کرنے کے انداز میں رو رو کر پکار رہی ہے۔۔" ہاں ہاں ہم ہیں ہی بے عمل۔"

جب ہم خود بے عمل ہوں گے تو نتائج کہاں سے آئیں گے؟ ہر نتیجہ کسی نہ کسی عمل کا انجام ہی تو ہوتا ہے اور بے عملی کا انجام انتشار اور درماندگی کے سوا اور کیا ہوگا؟ اُس نے انکھیں کھول کر، سوچ کی اس لہر کو الفاظ کے قالب میں ڈھال کر حافظے میں محفوظ کرتے ہوئے اپنے کشکول میں دوبارہ جھانکا۔ وہاں لکھا ہوا تھا۔

"ہر طرف یہ شور و غوغا برپا ہے کہ موجودہ نسل اسلام سے دور ہوگئی ہے، اسلاف کی پیروی نہیں کرتی۔ ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اسلاف میں ہمارا بھی شمار ہوتا ہے۔ موجودہ نسل اگر رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے دور ہو گئی ہے تو اُس میں اس کا قصور کم اور ہمارا زیادہ ہے۔ بچے جب یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے والدین اور اساتذہ زبان سے اللہ اور رسول ﷺ کی تعلیمات کا پرچار کرتے رہتے ہیں لیکن اُن کا عمل ان تعلیمات کے بالکل برعکس ہے تو اُن کے

ترقی یافتہ ذہنوں میں بجز اس کے کوئی بات نہیں آتی کہ مذہب اظہار و بیان کا ہی نام ہے۔ عمل سے اس کو کوئی ربط ضبط نہیں ہے۔"

مطالعہ میں یک سوئی اور انہماک حاصل ہو جائے تو ہر جملہ اپنے اندر گہرے سا گر جیسے مفہوم لئے ذہن کے افق پر طلوع ہوتا ہے۔ آج اُس کو ایک نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر ذہن میں کوئی سوال رکھ کر کشکول بلند کر لیا جائے تو ڈالنے والا، اُس میں طلب سے بڑھ کر نوازتا ہے۔ اُس نے اپنے ذہن کی الجھن کے تانے بانے کو ٹوٹ کر بکھرتے دیکھا۔ انہی سوچوں کو سمیٹتے وہ نیند کی وادی میں اتر گیا۔

صبح بیدار ہوا۔ ناشتے کی میز پر بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے اُس نے کہا۔" رات بھر میرے ذہن میں ایک بات چلتی رہی۔ کل آپ لوگوں نے اپنے ٹیچر کے حوالے سے جو کچھ کہا، میں اسی کی بابت سوچتا رہا۔ مجھے یہ خیال آتا رہا کہ آج آپ نے اپنے ٹیچر کو بُرا کہا ہے تو کل آپ مجھے اور اپنی امی کو بھی بُرا کہیں گے۔ آپ کی یہ سوچ مجھے بالکل بھی اچھی نہیں لگی۔"

"لیکن ابو۔۔" اس کے بڑے بیٹے نے کچھ کہنا چاہا۔ اُس نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔" نہیں، پہلے میری بات مکمل ہونے دو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پاس اپنی بات کے لئے ضرور کوئی دلیل ہو گی۔ لیکن جو کچھ میں کہنے والا ہوں، وہ سُن لو پھر اپنی کہہ لینا۔ میں بھی تمہاری بات دھیان سے سنوں گا۔" یہ کہہ کر اُس نے کچھ توقف کیا اور کہا۔

" بات دراصل کچھ یوں ہے کہ ہم ایک دوسرے کو الزام دینے کی عادت اپنا چکے ہیں۔ میں اپنا فرض پورا کرنے کی بجائے، اپنے فرائض سے آنکھیں چُرا کر اُس کو پورا نہ کرنے کے بہانے تراشتا ہوں اور اس بہانے کو اتنا جاندار

مان لیتا ہوں کہاُس کو اپنے ضمیر کو چپ کروانے کا ذریعہ بنالیتا ہوں۔ جب میں خود اپنے ضمیر کو لاجواب کر لیتا ہوں تو کسی دوسرے کو اسی دلیل سے خاموش کر لینا کون سی مشکل بات ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کو بُرا کہہ کر اپنی کوتاہی کا الزام دوسروں کو دینے کے آسان راستے پر گامزن ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے یہ نہیں سوچتے کہ اس طرح تو ہم اپنی برائی پہ مزید کاربند اور قائم ہو رہے ہیں۔ جب ہم دوسروں کو بُرا کہتے ہیں تو اس کے دوہرے اثرات ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس طرح ہم خود کو یہ دلیل دیتے ہیں کہ جب وہ اور دوسرا بُرا ہے تو میں کیوں پیچھے رہوں اور دوسرے یہ کہ دوسرے کی بُرائی کا تذکرہ کرتے ہوئے ہم اپنی بُرائی کو دور کرنے سے غافل ہو جاتے ہیں۔"

اُس نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔" اچھائی اور بُرائی کا یہ قانون ہے کہ اچھوں کو اچھے اور بُروں کو بُرے ہی ملتے ہیں۔ اگر آپ اچھے بچے بن جائیں گے تو آپ کے ٹیچر خود بخود اچھے ہو جائیں گے ۔ میں اگر اچھا باپ بن جاؤں

تو لامحالہ تم بھی اچھے بچے بن جاؤ گے۔ اگر تم اچھے بچے ہو گے تو تمہاری والدہ تمہارے لئے خود بخود اچھی ماں بن جائے گی۔ اچھا باپ ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اپنے بچوں کو ایک اچھا انسان بننے میں اُن کی مدد کروں۔ اسی طرح اگر تم اچھے بچے بن جاؤ گے تو محالہ اچھے بچوں کے ساتھ کوئی بھی، کسی طرح کی، بُرائی کر ہی نہیں سکتا۔ اگر تم اچھے طالب علم بن جاؤ تو تمہارا اچھا طالب ہونے کی وجہ سے استاد خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو، وہ تمہیں علم سے نوازنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اچھا طالب علم کہتے ہی اُس کو ہیں جس میں علم کی طلب ہو۔ اگر تم میں علم کی طلب نہیں تو کتنا ہی اچھا استاد کیوں نہ ہو، وہ تمہیں کچھ نہیں دے سکے گا۔"

بچوں نے یہ بات سُنی اور خاموش رہے۔ اُس نے بات آگے بڑھائی۔ اگر میں اچھا شوہر بن جاؤں تو لامحالہ میری بیوی ایک اچھی بیوی بننے پر مجبور ہو گی۔ کیوں کہ اچھا شوہر کہتے ہی اُس کو جو بیوی سے نہ صرف اچھی طرح نبھا کرے بلکہ اُس کو اپنے ساتھ سلوک رکھنے پر کاربند رکھ سکے۔ اسی طرح اگر تمہاری امی ایک اچھی بیوی بن جائے تو لامحالہ اُن کا شوہر یعنی کہ میں بھی ایک اچھا شوہر بننے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ یہ بہانہ تلاش کرتے ہیں کہ مخالف میں یہ بُرائی ہے اس لئے ہم بھی اُس کے بُرا کرنے میں حق بجانب ہیں۔ اسی طرح سوچا جائے تو جب ہم اچھے ہوں گے تو دوسرے کو یہ بہانہ نہیں ملے گا اور یوں بُرائی کا پنڈورا بکس بند ہو سکے گا۔"

"اگر میں اچھا گاہک بن کر کسی بھی دکاندار کے پاس جاؤں گا تو ہر دکاندار میرے ساتھ اچھے دکانداروں کی طرح بات کرنے کا پابند ہو گا۔ اسی طرح اگر میں ایک اچھا افسر بن جاؤں گا تو میرے ماتحت بھی میرے ساتھ بُرا رویّ رکھنے کی جسارت نہیں کر سکیں گے۔ مجھے صرف اتنا ہی تو کرنا ہے کہ میں خود اچھا بن جاؤں۔ دوسرے خود بخود اچھے ہو جائیں گے۔ اگر تم لوگ اچھے بن جاؤ گے تو تمہارے تمام دوست بھی تم سے اچھا برتاؤ کرنے کے پابند ہو جائیں گے۔"

"اگر وہ پھر بھی اچھے نہ بنیں تو۔۔؟" اُس کے بیٹے نے راہِ فرار کی تلاش میں سوال آنکڑا ڈالا۔

"تو وہ تمہارے دوست تھوڑے ہی رہیں گے۔ وہ تمہیں خود ہی چھوڑ دیں گے۔ وہ تمہارے قریب ہی نہیں آئیں گے۔ چوں کہ بُرے آدمی کو اچھے آدمی کے قریب رہنا کچھ زیادہ اچھا نہیں لگتا۔" اور پھر اُس نے ایک عجیب سے لہجے میں کہا۔ "یاد رکھو۔ اسی لیے فقیر کبھی کسی کی اصلاح نہیں کرتا وہ صرف خود کو ٹھیک کرنے میں لگا رہتا ہے۔ ہم کو بھی صرف یہ عہد کرنا ہے کہ ہم کسی کو ٹھیک نہیں کر سکتے۔۔ اس لیے ہمیں صرف خود کو ہی ٹھیک کرنا ہے۔ تم خود کو ٹھیک

کرو اور میں خود کو۔۔ تبھی سب ٹھیک ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔"

اگر تم مجھے ٹھیک کرنے کے چکر میں پڑ گئے ۔۔اپنے اساتذہ کو ٹھیک کرنے کے چکر میں پڑ گئے تو سامنے کی بات تو یہ ہے کہ وہ تم سے تو ٹھیک ہونے کے نہیں۔اس سے ہو گا کیا؟ یہی ہو گا نہ کہ تمہیں میری یا اُن کی بُرائی کرنے سے ہی فرصت نہیں ملے گی۔ یوں تم بُرائی کا تذکرہ کرتے رہو گے۔ بُرائی تمہارے اندر نفوذ کرتی رہے گی۔ تم اُس کے اثرات خود پہ طاری کئے رکھنا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔ لیکن اگر تم اس بات کو سمجھ لو کہ کسی کو درست کرنے کا اہل ہونے کے لئے پہلے خود درست ہونا لازم آتا ہے۔ تو اس کے سوا ہمارے پاس اور کیا راستہ رہ جاتا ہے کہ ہم خود کو ہی درست کر لیں۔"

یہ کہہ کر اُس نے بچوں سے کہا۔"آپ کے اسکول جانے کا وقت ہو رہا ہے۔ تم لوگ سکول جاؤ اور میری بات کو سمجھو اور اُس پہ عمل کرنا شروع کر دو۔اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں اگر کوئی دشواری ہو تو مجھ سے بات کر لیا کرنا۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ تم لوگوں کے اچھا بننے کی اس کوشش میں ، جو مجھ سے ہو سکتا ہو وہ میں ضرور کروں گا۔"

ادھورا پن

کتابوں میں لکھے حروف اور الفاظ بظاہر بے جان لکیریں معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن جب کوئی قاری کتاب کھول کر ان حروف کے مفہوم کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو ان بے جان لکیروں میں جیسے جان سی پڑ جاتی ہے۔ الفاظ اور حروف زندہاور متحرک ہو جاتے ہیں۔ ذہن کی اسکرین پر مناظر اُبھرتے اور متحرک ہو کر حواس کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ کتاب پڑھنے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ کوئی فل دیکھ رہا ہے۔ مصنف کے تخلیق کردہ کردار اتنے جاندار اور حقیقی معلوم ہوتے ہیں کہ انہیں با قاعدہ اُٹھتے بیٹھتے، حرکت کرتے، گفتگو کرتے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ان مناظر اور کرداروں کے روابط سے واقعات جنم لیتے چلے جاتے ہیں ان واقعات کا جائزہ لینے کے دوران قاری اپنے افکار و خیالات سے ان کی تصدیق اور تردید کرنے کے ساتھ ساتھ اُن سے متاثر ہوتا چلا جاتا ہے۔ کسی افراد تو مطالعے کے دوران بے ساختہ قہقہے لگانا شروع کر دیتے ہیں اور بعض افراد کہانی کے المیہ واقعات اور جذباتی اتار چڑھاؤ اتنا متاثر کرتے ہیں کہ بے اختیار اُن کی آنکھیں بھیگتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن جونہی کتاب بند کر دی جاتی ہے تو وہ تمام واقعات مناظر، کردار اور ان کے جذبات تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اب قاری کے دل و دماغ میں مطالعہ کی جانی والی تحریر کی یاد سی رہ جاتی ہے یا پھر وہی سیاہ لکیریں جو حروف اور الفاظ کا قالب اختیار کیے ہوئے تھیں۔

گویا دوران مطالعہ دیکھے گئے مناظر کرداروں کی حرکات و سکنات کا وجود قاری کے ذہن میں ہوتا ہے۔ الفاظ اور حروف کی سیاہ لکیریں ذہن کو ایسی مہمیز لگاتی ہیں کہ ان دیکھے مناظر نظروں میں سما جاتے ہیں۔ انجانی باتیں علم میں آتی چلی جاتی ہیں لیکن اگر توجہ بکھری ہوئی ہو، اُس میں ارتکاز نہ ہو تو نظر صفحات پر بکھری ہوئی سیاہ لکیروں کو مفہوم

سے عاری ہی دیکھتی ہے۔ ان لکیروں سے نہ تو قاری کے ذہن کی اسکرین پہ کوئی تصویر ابھرتی ہے، نہ کوئی معنویت ادراک کی گرفت میں آتی ہے اور کوئی مقصد نظر آتا ہے۔

کچھ ایسی ہی بے جان لکیروں پہ اُس کی نظریں جمی ہوئی تھیں اور اس کے ذہن کی اسکرین پہ قبل مسیح کا وہ دور متحرک ہو کر اپنے اندر سمٹے ہوئے واقعات دہرا رہا تھا جب ایک عالی شان محل میں ایک نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز پہلی مرتبہ اُبھرتی ہے۔ محل میں مبارک سلامت کے نعرے گونج اٹھتے ہیں، خوشیوں کے شادیانے بجنے لگتے ہیں، مٹھائیاں بانٹی جاتی ہیں۔۔۔ نقاروں پہ چوٹ پڑتی ہیں اور رعایا کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وارثِ تخت و تاج، جانشینِ سلطنت و حکومت دنیا میں تشریف لے آئے ہیں۔ محل میں گہما گہمی کا عالم ہے۔ دربار آراستہ ہے۔ بچے کے سر مونڈنے اور نام رکھنے کی رسمیں ادا ہونے کی تیاریاں ہیں۔ پنڈت و پجاری، ساحر اور نجومی اپنے اپنے حسابوں سے جنم پتری اور کنڈلی کا جائزہ لے رہے ہیں۔

ایک مہان پجاری کے قشقہ زدہ ماتھے پر فکر و پریشانی کی لکیریں ابھرتی ہیں اور وہ ساتھی پنڈت کو نومولود کی جنم کنڈلی کے کسی پہلو کی طرف خاص طور پر متوجہ کرتا ہے۔ سب چونک پڑتے ہیں۔ بات کھسر پھسر سے بڑھتے بڑھتے بحث و مباحثے کی صورت اختیار کر لیتی ہے حتیٰ کہ تجسسِ شاہی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور دستور کے راجہ کا استفہام سوال بن کر سب کو خاموش کرتا چلا جاتا ہے۔ سب پنڈت اور کاہن ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں اور ان کی نگاہیں بڑے پجاری کے چہرے پر آ کر قرار پکڑ لیتی ہیں۔

بڑا پجاری بہت احتیاط سے الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے راجہ سے کہنا شروع کرتا ہے۔ آپ کا اقبال بلند ہو۔ راجکمار بہت ہی نصیب والے ہیں۔ ان کا نام رہتی دنیا تک رہے گا۔ ان کو چاہنے اور ماننے والے ہر دور میں ان کے

نام کا جھنڈا بلند کرتے رہیں گے۔ ان کے بت بنیں گے اور دیوی دیوتاؤں کے بیچ رکھے جائیں گے۔ ہم راجکمار پہ دیوتاؤں کی خاص نظر دیکھ رہے ہیں لیکن۔۔۔ اگر۔۔! بڑے پجاری نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

راجہ جو بہت غور سے اپنے نومولود کے مستقبل کی بابت جاننے کو بڑے پجاری کی بات سن رہا تھا بول اُٹھا۔۔

"لیکن کیا؟ آپ مجھے پوری بات بتائیں۔ مجھ سے کچھ مت چھپائیں۔ کہیں! کیا بات ہے؟ پجاری نے اذن شاہی پر ہمت مجتمع کی اور کہا کہ یوں لگتا ہے کہ راجکمار کو امورِ سلطنت اور کاروبار حکومت سے دلچسپی نہیں ہوگی۔ وہ تخت و تاج چھوڑ کر خوش رہنا چاہیں گے۔ اُن کو سروں پر نہیں دلوں پر حکومت حاصل ہوگی۔

راجہ یہ سن کر بپھر گیا۔ آپ کیا انٹ شنٹ بول رہے ہیں۔ راجکمار میرا ولی عہد ہو کر بھلا تخت و تاج چھوڑے گا۔ اس بات کا کیا مطلب ہوا؟ اس پر پجاری نے ڈرتے ہوئے لہجے میں کہا۔" آپ کا اقبال بلند ہو۔۔ یہ ہم نہیں کہہ رہے۔۔ یہ تو ستاروں کا حساب بتا رہا ہے کہ اگر احتیاط نہ کی گئی تو راجکمار تخت و تاج چھوڑ کر جنگلوں میں نکل جائیں گے۔

کپل دستو کے راجہ نے نہایت پریشانی اور کبیدگی سے پوچھا۔۔ احتیاط؟ کیسی احتیاط؟ پجاری نے جو کچھ راجہ سے کہا اس کا ماحاصل یہ تھا کہ راجکمار خوشیوں کے لئے پیدا ہوا ہے اگر اُس نے کبھی غم، تکلیف، پریشانی اور دُکھ دیکھ لیا تو وہ اسے برداشت نہیں کر سکے گا۔ اس پر شاہی فرمان جاری ہوا کہ ایسا انتظام و اہتمام کیا جائے کہ شہزادہ کبھی کسی دکھ و پریشانی اور غم کی صورت بھی نہ دیکھ سکے۔

فرمان شاہی کے موجب ایسے انتظامات ہونے کیا دشوار تھے۔ راجکمار سدھارتھ پالنے سے اتر کر گھٹنوں چلتے اور پھر کھیلتے کودتے بڑے ہو گئے۔ لڑکپن سے نوجوانی کی حدوں میں داخل ہوئے تو راجہ نے اُن کا بیاہ رچا دیا۔ سلطنت

میں رعایا کو جو بھی حال رہا ہو۔ راجکمار خوشیوں کے جھولے میں جھولتا رہا پھر ایک روز وہ باپ بھی بن گیا۔ محل میں خوشیوں کے رنگ اور بھی گہرے ہو گئے۔

ایک دن راجکمار عبادت گاہ سے نکل کر محل کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اُس نے ایک بوڑھی عورت کو دیکھا۔ بیماری نے اس کو ناتواں اور نڈھال کر رکھا تھا۔ غم و آلام اور بڑھاپے نے اپنے پنجوں کے نشان اتنے گہرے گاڑے ہوئے تھے کہ اس عورت کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا۔ کپل دستو کے شہزادے نے ایسا چہرہ اس سے پیشتر کہاں دیکھا تھا۔ وہ تو اپنے ارد گرد خوش و خرم تندرست و توانا لوگوں کو دیکھنے کا عادی تھا۔ پہلے تو وہ ایسا کریہہ چہرہ دیکھ کر گھبرا گیا لیکن تجسس نے اُس کو نئے تجربے کی طرف متوجہ کیا۔

اُس کے ذہن میں پے در پے سوال اٹھنے لگے۔۔ یہ عورت ایسی کیوں ہے؟ اس کا یہ حال کیوں ہوا؟ اُس کا چہرہ اتنا بُرا کیوں ہے؟ اُس نے ان سوالوں کے جواب چاہے۔ لیکن کوئی بھی اُس کو ایسا جواب نہ دے سکا جس سے اُس کی تسلی ہو جاتی۔ راجہ کے کئے گئے انتظامات میں دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ قدرت اسے اپنے راستے پر گامزن کرنے کے انتظامات کر رہی تھی۔ شہزادے نے اپنے ذہن میں اُٹھتے سوالوں کو اپنے اتالیق کے بتائے گئے جوابوں سے شانت کرنے کی کوشش کی اُس عورت کا مسخ شدہ چہرہ۔۔ حواس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جس کو دیکھنے کی اس کو عادت ہی نہیں تھی۔ ہر جواب کا مذاق ہی اڑاتا رہا۔

ایک روز اُس نے محل سے باہر جانے کی کوشش کی تو درباریوں میں ہلچل مچ گئی۔ بات راجہ تک پہنچائی گئی۔ راجہ نے پہلے تو راجکمار کو بہلانے کی کوشش کی پھر اجازت دے دی لیکن ساتھ میں یہ فرمان بھی جاری کر دیا کہ جب راجکمار شہر کا دورہ کریں تو اس امر کا پورا خیال رکھا جائے کہ کوئی فریادی اپنی رونی صورت لے کر شہزادے کے سامنے

نہ آنے پائے۔ شہزادہ شہر کی سیر کر رہا تھا کہ لوگوں کا ایک گروہ ایک جنازہ لئے جاتا نظر آیا۔ شہزادے نے پوچھا یہ لوگ کون ہیں؟ جب معلوم ہوا کہ کوئی مر گیا ہے اور اس کی میّت کو شمشان کی طرف لے جایا جا رہا ہے تو وہ اس منظر کو قریب سے دیکھنے پر مصر ہوا۔ اس نے جنازے کے ساتھ متوفی کے لواحقین کو روتے پیٹتے دیکھا۔ جانے والے کا دکھ پیچھے رہ جانے والوں کو کھا رہا تھا۔ اُن کے دکھ اور آہ و فغاں نے راجکمار کے اندر کایا کلپ کا کام شروع کر دیا تھا۔

اس روز کے بعد سے راجکمار سدھارتھ افسردہ سا رہنے لگا۔ یہ بیماری، موت، دکھ، غم اور پریشانیاں کیا ہیں؟ وہ راتوں کو دیر دیر تک جاگتا اور خود کو ان سوچوں کے حوالے کئے رہتا۔ کبھی کبھی تو وہ سوتے سوتے اُٹھ بیٹھتا۔ اس کی بیوی اس کی دل جوئی کرنے کی کوشش کرتی تو وہ اُس سے طرح طرح کے سوال پوچھتا۔ اس کی بیوی اس کو اپنے علم کے مطابق جواب دیتی۔ وہ اس کی نسبت باہر کی دنیا کا بہتر شعور رکھتی تھی۔ وہ اس کو بتاتی کہ لوگوں کے اپنے کرم اور کرتوت اُن کے دکھوں، مصائب اور پریشانیوں کا سبب بنتے ہیں۔ اس لئے راجکمار کو اُن کی بابت زیادہ متفکر نہیں ہونا چاہیے۔ شہزادہ لوگوں کو اُن کے مصائب و آلام سے نجات دینے کے منصوبے باندھتا۔ اس کی بیوی اس کی ہاں میں ہاں ملاتی کہ جب وہ خود راجہ بنے گا تو جیسا وہ چاہے گا ویسا کر لے۔

ایک روز دربار بادشاہی میں حکومتی انتظامات زیرِ غور تھے۔ لگان اور آبیانے کی شرح بڑھانے اور عوام پر کچھ مزید ٹیکس لگانے کی بات چل رہی تھی۔ سب وزیر اور مشیر اپنی آراء کا سلیقے اور قرینے سے اظہار کر رہے تھے۔ راجکمار سدھارتھ بھی وہاں موجود تھا۔ وہ سب کی باتیں سن رہا تھا۔ اُس نے اپنی سوچ کے تحت باندھے گئے منصوبے کی روشنی میں لوگوں کے دکھوں، پریشانیوں اور مصائب کو ختم کرنے کی بات کرتے ہوئے ٹیکس نہ لگانے کی بات کہہ دی۔ سب درباری ہکا بکا رہ گئے۔

راجہ نے راجکمار کی بات کو دخل در معقولات قرار دے کر اُسے بتایا کہ ابھی وہ امور حکمرانی سے واقف نہیں۔ اگر وہ رعایا سے لگان اور ٹیکس نہیں لیں گے تو خود اُن کا کیا بنے گا؟ اس پر شہزادے نے کہا۔ لیکن رعایا ان کو لگان دیتی ہی کیوں ہے وہ اپنی آمدن سے اپنے حالات خود کیوں ٹھیک نہیں کرتی؟

یہ بات مزاج شاہی سے کہاں مطابقت رکھتی تھی۔ راجہ نے بہت ضبط کیا لیکن جلال شاہی کی حدت پورے دربار کو اپنی موجودگی سے باخبر کر رہی تھی۔ راجہ کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے مہانتری نے بڑی ہوشیاری سے راجکمار کو وہاں سے ہٹانے کو اسے اندر محل میں جانے کو کہا۔

راجکمار اُٹھ کر وہاں سے چلا تو گیا لیکن اب وہ بُری طرح الجھ چکا تھا کہ اس کو سلجھنے کی کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ اُس کی بے قراریوں میں اب وحشتوں کا رنگ آنے لگا تھا۔

ایک دن اُس کی بیوی نے اپنے شوہر کی عدم التفاتی کا شکوہ کیا تو اُس نے اُس کو اپنی الجھن سے آگاہ کر دیا۔ اُس نے لوگوں کے دکھوں اور غم و آلام کا کوئی مناسب حل نہ کرنے سکنے پر اپنی پریشانی اور الجھاؤ کی بات کی۔ اس کی پتنی کے ایک جملے نے اس کو راہ کا تعین کرنے میں مدد دی۔ اس کو الجھتے خود سے لڑتے دیکھ کر اُس نے کہا۔ جو بات آپ کرنا چاہ رہے ہیں وہ تو بڑے بڑے دھیانی گیانی اوتار نہیں کر سکے جنہوں نے اپنی زندگیاں انسانوں سے دور گپھاؤں اور جنگلوں میں گزار دیں اس مسئلے کو وہ نہیں حل کر سکے تو آپ کیا کر لیں گے؟ جب تک لوگ ایسا رہنا چاہتے ہیں، وہ ایسے ہی رہیں گے۔ انہیں خود عقل نہیں آتی تو آپ کیا کر لیں گے؟ آپ ان لوگوں پر حکومت کرنے کے لیے آئے ہیں۔ آپ ان پر حکومت کریں۔ اُن کے مقدر میں آپ کی رعایا ہونا لکھا ہے۔ وہ آپ کی رعایا رہیں گے۔ آپ کو اُن پر حکومت کرنا ہے۔ یہ آپ کا مقدر ہے۔

وہ رات سدھارتھ پر بہت بھاری تھی۔ اُس نے سوچا یہ مقدر کیا ہے؟ اگر میں رعایا ہوتا تو کیا یہ سب مجھ میرے ساتھ بھی ہوتا جو عوام کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس کو مقدر کس نے بنایا؟ کیوں بنایا؟ یہ بڑے بڑے دھیانی گیانی گپھاؤں میں بیٹھ کر کیا کرتے رہے ہوں گے؟ وہ اس گتھی کو کیوں نہیں سلجھا سکے۔ آخر اس سمیا کا کوئی حل تو ضرور ہوگا؟ اُس کے اندر سے ایک آواز ابھری۔ ہاں حل تو ضرور ہوگا۔ اُس حل کو تم خود کیوں نہیں کھوج نکالتے؟ میں کھوج نکالوں؟ لیکن کیسے؟ اس نے سوچا اور یہ بات اُس کے اندر ایک پھانس کی طرح اُترتی چلی گئی۔

دن تو جیسے تیسے گزر جاتے لیکن راتوں کو پچھلے پہر اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ خود کو طرح طرح کے سوالوں کی زد میں پاتا۔ ایسے سوالوں کی زد میں جو بگولوں کی طرح اُس کے اندر طوفان اُٹھاتے اور اُس کو بے قرار کرتے۔ ایک رات اُس نے اپنی بے قراریوں سے نجات پانے کے لیے ایک فیصلہ کیا۔ ایک رات جب سب گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ وہ اُٹھا اور محل سے نکل کر گیا ایک جنگل میں۔ ایک برگد کے نیچے براجمان ہو گیا۔

بعض روایات کے مطابق بارہ اور بعض کے مطابق سات سال تک وہاں رہا اور پھر ایک روز بالآخر وہ اپنے اندر اُتر گیا۔ اس نے اپنے اندر وہ منزل تلاش کر ہی لی جس کو نروان کہتے ہیں۔ اس نے دریافت کیا کہ انسان کے مصائب و آلام اس کی خواہشوں اور توقعات سے جڑے ہوئے ہیں۔ اگر انسان اپنی خواہشات کی کنہ کو سمجھ لے اور دوسروں سے توقعات وابستہ کرنا ختم کر لے، تو وہ ابدی طور پر مکتی حاصل کر سکتا ہے اور اس بات کو سمجھنے کے لئے لازم ہے کہ انسان اپنے اندر کی دنای میں داخل ہو جائے۔ اس کے بعد ہی اُس کو نروان حاصل ہو سکتا ہے اور تب ہی آدمی مقدر بنانے والے کے ساتھ ہم رشتہ ہو کر اپنے مقدر کی تشکیل نو کر سکتا ہے۔

مطالعہ سے یہ سب باتیں اس کے شعور میں داخل ہوئیں اس کے ذہن میں واقعات کی ایک فلم سی چلتی رہی۔ اس نے کتاب بند کر دی لیکن واقعات کا تاثر اس کے ذہن کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھا۔

کپل دستو کے شہزادے سدھارتھ نے تخت و تاج چھوڑ کر لوگوں کو اپنے اندر اترنے کی جو راہ اور طریقہ سکھایا اُس کو بدھ مت کہا گیا اور اُس کے بانی کو لوگوں نے بدھا کہا۔ جس کا مطلب ہے جاننے والا۔ کپل دستو کے راجکمار سدھارتھ نے اپنے اندر اتر کر وہ سب جان لیا جس نے اُس کی ہر خلش اور بے قراری کو ختم کر دیا۔ وہ سکون اور خوشی کی ایک ایسی کیفیت سے سرشار ہو جو اُس کے باپ کی راجدھانی، کپل دستو کے شاہی محل میں تمام تر دنیاوی وسائل کے باوجود اُس کو حاصل نہیں تھی۔ اس نے جان لیا کہ یہ سب مادی چیزیں اُس طرح کی خوشی اور مسرت مہیا نہیں کر سکتیں جو انسان کو اپنے خالق اپنے رب سے تعلق استوار ہونے پر حاصل ہو سکتی ہے اسی ربط اور تعلق کو اس نے نروان حاصل ہونا کہا۔ پوری زندگی لوگوں کو یہی ترغیب دیتا رہا کہ جیسے بھی بن پڑے نروان حاصل کرو۔ اس کے لئے انہیں صرف اتنا ہی تو کرنا ہے کہ وہ خود اُس کی طرح اپنے اندر اُتر جائیں۔ اپنے اندر اترنے سے پیشتر لوگوں سے وابستہ توقعات کو، اُن سے جڑی امیدوں اور آشاؤں کو ترک کرنا ضروری قرار دیا۔

اُس کی تعلیمات کا جو حشر ہوا وہ آج سب کے سامنے ہے۔ توقعات کا ترجمہ اِچھا یعنی خواہشات اور تقاضے کر کے اُس کے دیئے ہوئے سیدھے سادھے نظام کو رہبانیت کی مثال تو بنایا جس نے پوری زندگی اس بات کا پرچار کیا کہ عبادت کے لائق صرف ایک واحد ذات ہے اور اُسی سے تعلق روا اور واجب ہے۔ خود اُسی بدھا کے اتنے بت بنا کر پوجے گئے کہ شاید ہی کسی اور دیوتا کے اتنے بت بنائے اور پوجے گئے ہوں۔ اُن باتوں کو سوچتے سوچتے اُس نے اس بات کا جائزہ لینا شروع کیا کہ جس بات کو بدھا نے نروان۔۔ آنحضرت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے معراج کہا۔۔۔

اِن میں کیا فرق ہے؟ اُس نے اس بات کو بھی خصوصی طور پر سمجھنے کی کوشش کی کہ پیغمبر اسلام نبی کریم ﷺ نے نماز کو مومنوں کی معراج کیوں قرار دیا؟

یہی باتیں سوچتے فکر کی ایک لہر اُس کے شعور میں داخل ہوئی۔ بدھا نے وہیں اپنے محل کے اندر رہ کر اپنے اندر اترنے کی کوشش کیوں نہ کی؟ اُس کے اس راہ پر چلنے میں ایسی کیا بات تھی کہ اُس نے اپنے تمام پیش رو دھیانی گیانی اوتاروں پر سبقت حاصل کر لی؟ اُس کو کس بات نے اس قابل بنا دیا کہ وہ ڈھائی ہزار سال سے عارف باللہ لوگوں میں ایک ممتاز اور منفرد مقام کا حامل بنا ہوا ہے۔

سوچ کی یہ لہریں شعور میں ایک تلاطم برپا کرتی چلی گئیں۔ اس کے اندر کئی سوال تہہ در تہہ ابھرتے چلے گئے۔

کیوں اور کیسے؟ کی تکرار اُس کی سوچوں میں بھنور بناتی۔ وہ ہر بھنور کی زد میں چکراتا اور پھر اُبر کر شعور کی سطح پر آجاتا۔ اُس نے اس کیفیت پر اب اتنا خلفجان محسوس نہیں کیا جس طرح وہ پہلے کبھی محسوس کیا کرتا تھا۔ اب اُس کو ایک ڈھارس سی تھی کہ اُس کا کامل مرشد موجود ہے۔ اگر کسی مقام پر وہ اٹک بھی گیا تو وہ اُس کو وہاں سے نکال دیں گے۔ اس لیے وہ اس بات کو بار بار شعوری طور پر ذہن میں دہراتا رہا۔ اس سے یہ ہوتا کہ پورا واقعہ اپنی جزئیات کے ساتھ اس کے ذہن کی اسکرین پر ابھرتا اور تازہ ہوتا رہا۔ وہ ڈوب ڈوب کر اس بات کو سوچتا کہ غور و فکر کے لئے بدھا نے آخر وہ کون سا طریقہ اختیار کیا کہ اس کا تعلق اس لافانی اور جاودانی ذات سے جڑ گیا جس نے پوری کائنات کو خلق کیا، آسمانوں کو بغیر ستونوں کے ایستادہ کیا اور زمین کو نہ اتنا سخت بنایا کہ لوگ ٹھوکریں کھاتے پھریں اور نہ اتنا نرم کہ وہ اس میں دھنس کر ہی رہ جائیں۔

اس کے ذہن میں بہت سے جواب آتے رہے۔ کبھی وہ خود سے کہتا کہ بدھا نے دراصل دھیان گیان کا وہ طریقہ الہامی طور پر اپنا لیا تھا جسے تصوف میں مراقبہ کہا جاتا ہے۔ لیکن اس جواب سے اس کی تشفی اس لئے نہیں ہو رہی تھی کہ وہ سوچتا کہ اگر بات محض مراقبہ کرنے تک ہی محدود ہوئی تو اس وقت بھی لاکھوں افراد مراقبہ کرتے ہیں۔

دیگر مذاہب میں دھیان گیان کی مشقیں کرتے ہیں لیکن کتنے لوگ ہیں جو عرفان و آگہی کی اُس سطح تک پہنچ سکتے ہیں جہاں بدھا پہنچا۔ پھر وہ سوچتا کہ مراقبہ کے ساتھ ساتھ اس میں طرز فکر کا بھی عمل دخل رہا ہوگا۔ طرزِ فکر کی درستی پر خود اس کے مرشد کریم کس قدر اصرار کرتے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ اس جواب پر بھی خود کو مطمئن محسوس نہیں کر پا رہا تھا۔

بالآخر ایک روز اُس سے نہ رہا گیا۔ اُس نے اپنے مرشد کریم سے فون پر بات کی۔ اُن کی آواز سنتے ہی وہ بے خود سا ہو گیا۔ اس کے ذہن میں جو کچھ تھا۔۔ وہ سب محو ہو گیا۔ انہوں نے اُس کا حال پوچھا، اُس کی اور اُس کے متعلقین کی خیر و عافیت دریافت کی۔ اِن رسمی سی باتوں میں بھی وہ محبت اور اخلاص کی لہریں محسوس کر رہا تھا۔ وہ اُس کو مسرت و انسباط کا ایک جانفزا احساس عطا کر رہی تھیں۔ اُس نے اُن کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''فلاں صاحب سے ملاقات ہوئی تھی تو انہوں نے اپنا ایک مسئلہ آپ سے عرض کرنے کو کہا تھا۔'' مسئلہ سن کر اُس کے مرشد نے کہا۔ ''وہ صاحب جزئیات میں پڑ جاتے ہیں۔ ان سے کہیے کہ وہ پوری بات پر بطور ایک اکائی غور کریں تو اُن کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ فروعی اور جزوی باتیں انسان کو الجھاتی بہت ہیں۔''

اُس نے اُن کی بات سنی اور پھر چند ایک مزید باتوں کے بعد فون بند ہو گیا تو اس نے تحیر آمیز مسرت کے سوچا کہ انہوں نے باتوں ہی باتوں میں کس خوبصورتی سے اُس کے اندر کی گرہ کھول دی تھی۔ اس کی الجھن جس کا

بظاہر کوئی تذکرہ گفتگو کے دوران نہیں ہوا تھا۔ وہ الجھن انہوں نے باتوں ہی باتوں میں سلجھادی تھی۔ اُس نے کنایتاً بھی اُن سے اپنے اندر اچھلتے کودتے سوالوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے کس قدر سلیقے سے اُس کو جواب سے نواز دیا تھا۔

اُس نے سوچا کہ بدھا نے دراصل یہ راز جان لیا تھا کہ وہ جس قسم کی خوشیوں سے روشناس ہے وہ اصل خوشی اور مسرت کا محض ایک عکس اور جزو ہیں۔ وہ خوشیوں سے محض جزوی طور پر روشناس ہے۔ ازل سے لے کر ابد تک روح کے سفر میں کتنی ہی منزلیں اور پڑاؤ آتے ہیں۔ یہ دنیا بھی محض ایک پڑاؤ ہے۔

اس وقتی قیام گاہ میں انسان کو اتنا بھی محو نہیں ہونا چاہیے کہ وہ گزری ہوئی منزلوں اور آنے والی مسافتوں کو ہی بھول جائے۔ اِس بھول جانے کی وجہ بھی یہی بنتی ہے کہ انسان اس عارضی قیام گاہ کو۔۔ جو مادی زندگی کی مسافت کا محض ایک جزو ہے۔۔ کو ہی مستقل اور پائیدار پڑاؤ قرار دے دیتا ہے اور پھر مزید ستم یہ ہوتا ہے کہ وہ اس قیام کے ہر دن اور ہر لمحے کو جو محض ایک جزو کے اجزاء ہیں۔۔ میں ہی گرفتار ہوتا چلا جاتا ہے۔

اگر ہم اپنے رویوں کو اس نظریئے سے دیکھیں، اپنی سوچوں کا اس زاویے سے جائزہ لیں تو بھی بات واضح ہوتی ہے کہ ہم کل سے صرف نظر کئے جزوی باتوں میں الجھے رہتے ہیں۔ اگر ہم کسی سے ملاقات کرتے ہیں تو اس شخصیت، جو مختلف اجزاء کا مرکب ہوتی ہے، کے محض کسی ایک آدھ رُخ کی بناء پر اپنایت یا بے رُخی کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔

اب ایک آدمی کی زندگی میں کتنے ہی پہلو ہوتے ہیں۔ وہ کتنی ہی کیفیات اور جذبوں سے مل کر اپنے رویے متعین کرتا ہے۔ کتنے ہی رشتوں کی ڈور میں بندھا ہوتا ہے۔ کہیں وہ باپ ہوتا ہے، کہیں بیٹا، کہیں شوہر، کہیں بھائی،

کہیں دوست ہوتا ہے تو کہیں محض ایک کارکن ۔۔ لیکن جب ہم کسی سے ملتے ہیں تو کیا ہم صرف یہ نہیں دیکھتے کہ اس نے ہم سے کیسا رویہ اختیار کیا یعنی ہم محض اپنی ذات کے حوالے سے اُس آدمی کے محض کسی ایک جزو کو دیکھ رہے ہوتے ہیں اور ہماری وابستگی اور اپنائیت اسی ایک جزو کے حوالے سے وجود میں آتی ہے اور اسی لئے کوئی دوسرا رخ یا کوئی دوسرا جزو آنے پر معدوم ہو جاتی ہے یا بڑھ جاتی ہے۔ مٹ جاتی ہے یا دوگنی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ہم جب کسی سے بات، کسی مسئلے یا کسی معاملے پر غور کر رہے ہوتے ہیں تب بھی ہمارا رویہ یہی ہوتا ہے۔ ہم اس کو جزوی طور پر ہی تو سمجھتے ہیں۔

پوری طرح سے پوری بات ہمارے محدود شعور میں کم ہی داخل ہو پاتی ہے۔ اس ہی لئے تو ہماری ہر بات، ہر نظریہ اور ہر فلسفہ کسی نہ کسی اسٹیج پر جا کر رد ہو جاتا ہے۔ اس میں قطع و برید کرنا پڑ جاتی ہے یا اس میں تبدیلی لازم ہو جاتی ہے کیونکہ ہم نے بات کو پورے اور مکمل طور پر نہیں جانچا اور جانا جاتا۔ یہ بات ہمارے روز مرہ واقعات، ذاتی و انفرادی طور پر کئے گئے کاموں سے لے کر اجتماعی رویوں تک سب پر ہی برابر لاگو ہوتی ہے۔

اس ہی لئے تو ہم ادھورے لوگ ہیں کہ ہم ہر طرح سے ادھوری بات سنتے، ادھوری بات سمجھتے ادھوری باتیں کہتے اور ادھورے کام کرتے ہیں۔ ہم ادھورے پن کا شکار رہتے ہیں۔ کبھی ہماری سوچ یہ نہیں بنتی کہ ہمیں ادھورا پن چھوڑ کر کاملیت اور اکملیت کی طرف گامزن ہونا چاہیے۔ جب ہم اپنی تکمیل کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے تو ہم مکمل کیسے ہو سکتے ہیں۔

سوچ اور فکر کی ان روشن لہروں نے اُس کے شعور میں آگہی کا ایک اجالا سا پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے مرشد کریم کی سجھائی ہوئی راہ پر قدم بڑھائے تو وہ یہ بات سمجھ گیا کہ بدھا نے درحقیقت یہ راز جان لیا تھا کہ اس کو

حاصل خوشیاں، اس کی زندگی ادھوری ہے۔ اُس نے اسی بات کو جاننے کے بعد پورے طور پر، خوشیوں اور زندگی کی تکمیل کی طرف قدم بڑھایا تھا۔ وہ جزو کو چھوڑ کر کل کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

اُس اجالے میں اچانک ایک خیال روشن سورج کی مانند اس کے شعور میں طلوع ہوا۔ قرآن حکیم میں حضور نبی کریم سے فرماتے ہوئے کہا گیا ہے کہ آج کے دن ہم نے آپ پر اپنا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمتیں تمام کر دی ہیں۔ اچھا تو اسی لیے ہر نبی پیغمبر اور اوتار نے حضور نبی اکرم ﷺ کے بارے میں یہ پیشین گوئی کرنا اپنا فرض جانا تھا۔ کیونکہ وہ سب اپنی اپنی جگہ یہ جانتے تھے کہ وہ خود تکمیل ے کس مرحلے پر ہیں۔ اس ہی لیے انہوں نے بتا دیا تھا کہ ایک بندہ ایسا ضرور آئے گا جو پوری بات کو پوری طرح جانتا ہو گا اور جان لے گا۔

کاملیت اور اکملیت کی شان والے نبی کی امت میں سے جس بھی فرد کو یہ سمجھ آگئی تو وہ ادھورے پن سے نکل کر اپنی تکمیل کے سفر پر گامزن ہو جاتا ہے۔ کامل اور مکمل ترین ذات سے ربط تبھی تو ممکن ہو گا جب بندہ اپنے ادھورے پن کو مان کر اس سے آگاہ ہونے کے بعد اس سے پیچھا چھڑانے کے سامان کرنے لگے۔ اب جب بات اس کی سمجھ میں آگئی تو اس نے سوچا کہ اس کے بعد تو اس پر عمل پیرا ہونا ہی باقی رہ گیا ہے۔

عیدِ صبحِ بہاراں

شام کو گھر پہنچ کر اُس کو ہر روز کی طرح ایک سکون اور طمانیت کا احساس ہوا۔ بچوں نے آگے بڑھ کر اُس کا استقبال کیا۔ سب اُسے باری باری سلام کرنے لپکے۔ سب کے سلام کے جواب میں وہ ہلکی سی مسکراہٹ کی اُوٹ سے وعلیکم السلام کہتا، سب سے باری باری ہاتھ ملاتا اپنے کمرے تک پہنچا۔ بیوی نے اس کی خیریت دریافت کرتے ہوئے اسے نہا کر تازہ دم ہونے کا مشورہ دیا۔ وہ اکثر اس بات پر ناز کیا کرتا کہ اُس کی بیوی اُس کی ضرورتوں سے اس کے بتائے بنا ہی آگاہ رہتی تھی۔ اُس کو کس وقت چائے کی طلب ہوتی ہے، کس وقت وہ اکیلا رہنا چاہتا ہے، اُس کو کس موضوع پہ اس کی رائے چاہیے ۔۔ اس کو یہ سب وجدانی طور پر معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو اسے محسوس ہوتا کہ اُس کی بیوی اُس کا ذہن پڑھتی رہتی ہے۔ وہ کیا سوچ رہا ہے، اُس کی اطلاع اُس کو کیسے اور کیونکر ہو جاتی ہے ۔۔ یہ بات اُس کی بیوی کے لئے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ وہ تو اُس کا خیال رکھتی تھی اور خیال رکھنے کا ہنر اُس کو فطرتاً ودیعت ہوا تھا۔ جو بیویاں شوہروں کا خیال رکھتی ہیں انہیں اپنے شوہر کی مزاج شناسی انعام کے طور پر ملی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ اپنے شریکِ حیات کی ہر بات سے آگاہ رہتی ہیں۔

گرمیوں میں نہا کر تازہ دم ہونے کا جو پر لُطف کا احساس ہوتا ہے اُسے جانفزا بنانے کو گرما گرم چائے کی پیالی سونے پہ سہاگے کا کام کر رہی تھی۔ چائے پینے کے دوران اِدھر اُدھر کی باتوں میں آج کون آیا ۔۔ کیا ہوا، کیسے ہوا، کے دوران شام کے بعد کے پروگرام طے ہو رہے تھے کہ ایک بچے نے کہا ''ابو! کل پکنک پر چلیں۔''

''کل تو عیدِ میلاد النبی ﷺ ہے۔ پکنک پہ جانے کا پروگرام کسی اور چھٹی کے دن بنالیں گے۔'' اس کے جواب دینے سے پیشتر اُس کی بیوی نے کہہ دیا۔

اُس کے چھوٹے بیٹے نے دلیل دی۔ ''لیکن عید پر تو ہم پکنک پر گئے تھے۔''

''وہ تو عید تھی اور یہ تو جشنِ ولادت ہے۔'' بڑے بیٹے نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''کیوں ٹھیک ہے نا ابو؟''

''ابو یہ جشنِ ولادت کیا ہوتا ہے؟'' چھوٹے نے سوال کیا۔

''حضور نبی کریم ﷺ کے دنیا میں تشریف لانے کا جشن مناتے ہیں، ولادت پیدا ہونے کو کہتے ہیں۔'' بڑے بیٹے نے اس بار بھی باپ کو بولنے کا موقع دینے کے بجائے اپنے علم کا اظہار کیا۔

اُس نے بچوں کی باتوں میں مداخلت کرنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے چائے پیتا رہا۔

''اور کل ہم کیا کریں گے؟'' چھوٹے نے سوال کیا۔

''ہم کیا کریں گے؟'' اس نے سوال کو ذہن میں دہرایا۔ ''ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟'' اُس نے دل ہی دل میں سوچا۔ سب بچے اُسی کو دیکھ رہے تھے۔ اُس کو جواب دینا تھا۔ مگر اُس معصوم سے سوال کا پتھر اُس کے شعور میں دراڑیں ڈالتا چلا جا رہا تھا۔ ''ہم چھٹی منائیں گے۔'' اُس نے کہنے سے پیشتر سوچا کہ اگر اُس نے یہ کہہ دیا تو بچے اُس کے غیر سنجیدہ جواب سے کوئی بُرا تاثر ہی نہ لے لیں۔ اُس نے جلدی سے دوسرا جواب تراشنے کی کوشش کی۔

''ہم چراغاں دیکھنے جائیں گے۔'' اونہہ! یہ کیا بات ہوئی اُس نے اس جواب کو بھی غیر مناسب جانا۔ حضور نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس کی عظمت کے حوالے سے یہ بات بھی اُس کو اپنے چھوٹے پن کی دلیل لگی۔

''ہم جلوس میں شامل ہوں گے ، جلسے میں شرکت کریں گے ، شیرنی بانٹیں گے اور چراغاں کریں گے !'' اُس نے بچوں کو خوش کرنے کو کہہ دیا۔

بچے واقعتاً اس جواب سے خوش ہو گئے ۔ اُن کو تو عملی طور پر کچھ کرنے ، کچھ دیکھنے اور کچھ دیر گھر سے باہر رہنے کا موقع ہی چاہیے تھا۔ سو وہ اُن کو مل رہا تھا۔ لیکن وہ خود کچھ زیادہ مطمئن نہیں تھا۔ نبی آخر الزماں ﷺ کی رفعت و عظمت کے حوالے سے یہ سب کچھ اُسے ناکافی سا محسوس ہوا۔ بچے آپس میں اپنے والد کے جواب کی روشنی میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ چائے ختم کر کے وہیں بیٹھا بظاہر اُن کی باتیں سُن رہا تھا لیکن اندر کہیں اور گم سوچوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ بچے اُٹھ کر وہاں سے کب ہٹ گئے ، اُس کو اس کی خبر ہی نہ ہوئی۔ جب بیوی نے ۔۔ ''کھانے میں کیا پکاؤں ؟'' کہا تو وہ چونکا۔

''جو مناسب سمجھو'' کہہ کر وہ وہاں سے اُٹھ گیا۔ اگلے روز اُس کو دفتر نہیں جانا تھا۔ ناشتے کے بعد اُس کے چھوٹے بیٹے نے اپنی ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''امی یہ کیسی عید ہے ؟ نہ ہم نے نئے کپڑے پہنے ہیں ، نہ ہی ہم نماز پڑھنے عید گاہ گئے ہیں ۔۔۔ نہ ہی آپ نے ہمیں عیدی دی ہے۔''

اُس نے بچے کی بات سُنی اور سوچنے لگا ''اب اس بچے کو وہ کیا سمجھائے کہ آج کی عید کو ہی اصل عید ہونا چاہیے لیکن اب ہمیں اتنا شعور کون دے۔''

بچے کی ماں نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔ ''بیٹے آج عید نہیں عیدِ میلاد النبی ﷺ ہے۔ اس میں بچوں کو عیدی نہیں دیتے۔ یہ اُس طرح کی عید نہیں۔''

''واہ یہ کیا بات ہوئی! کیا یہ بچوں کی عید نہیں؟'' بیٹا اپنی بات سمجھانے سے زیادہ بات کی گہرائی تک پہنچنا چاہ رہا تھا۔ ''چلیں عیدی نہ سہی، نئے کپڑے تو ہونا چاہیے تھے۔ پورے محلے میں کسی نے نئے کپڑے پہنے ہیں/ کسی کو پتہ ہی نہیں کہ آج عید کا دن ہے۔'' بچے نے منہ پھلا کر کہا۔۔اور وہ تڑپ کر رہ گیا۔

بچے نے کس بے رحمی سے لفظوں کے دھوکے کو بے نقاب کر دیا تھا۔ واقعی اگر یہ سچ مچ عید ہے تو خوشی کے اظہار کا کوئی قرینہ تو ہوتا۔ اُس نے سوچتے ہوئے خود سے مخاطب ہو کر کہا۔ بچوں کے سامنے منہ سے کچھ کہنے اور اپن کے جواب میں وہ اُن کی بے رحم سچائی پر مبنی باتوں کو سننے کی تاب کہاں رکھتا تھا۔ اگر وہ لاجواب ہو رہا تھا تو یہ اُس کی نالائقی اور بودے پن کی دلیل ہی تو تھی۔ بھلا بچوں سے بھی کبھی کوئی لاجواب ہوتا ہے، اُس کو غصہ آنے لگا۔ اُسے چاہیے تھا کہ وہ انہیں ڈانٹ کر چپ کروا دیتا۔ مگر اُن کے چپ ہو جانے سے کیا ہو گا۔ بات اُن کے ذہنوں میں گرہ بن جائے گی اور سوچ میں گرہ پڑنا نفسیاتی امراض اور پیچیدگیوں کا سبب بن سکتا ہے۔ وہ اسی بات سے ڈرتا تھا اور پھر کیا کسی کے چپ کر جانے سے مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

اُس نے بناوٹی سے غصے سے بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں خیال کیوں نہیں رہتا۔ تم نے اگر بچوں کے کپڑے نہیں بنائے تو چلو کوئی بات نہیں لیکن بھئی ان کو عیدی تو دے دو۔ ادھر آؤ میں تمہیں عیدی دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اُس نے بچوں کو پچاس پچاس روپے عیدی کے طور پر دیئے۔ بچے کھل ہی تو اٹھے۔

بیوی نے کہا۔ ''مجھے خیال نہیں رہتا تو آپ کون سا مجھے پیسے دیئے تھے۔ نئے کپڑے بنا دیتی۔ آپ نے بچوں کے سامنے کہہ دیا ہے اب یہ میری جان کھائیں گے کہ میں اُن کا خیال نہیں رکھتی، ابو ہمارا کتنا خیال رکھتے ہیں۔''

اُس نے بات کو سنبھالنے کے لیے شرارتاً کہا ''آپ بچوں سے کہہ دیجئے گا کہ تمہارے ابو میری ہی وجہ سے تو تمہارا خیال رکھتے ہیں۔''

''چلیں ہٹیں۔ اب آپ بات کو مذاق میں لے جا رہے ہیں۔ میں سب جانتی ہوں۔'' بیوی نے اُس کی شرارت بھانپتے ہوئے کہا۔

''آپ سب جانتی ہیں تو بتائیں کہ بچوں کو مطمئن کرنے کو کیا کیا جائے؟'' اُس نے اُسی سے مدد مانگ لی۔

''آپ شام کو انہیں باہر گھمانے لے جائیں گے تو یہ روشنیاں دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔'' بیوی نے تجویز دے کر بظاہر مسئلہ حل کر دیا مگر اُس کے اندر ایک چھناکا سا ہوا۔ ''ہم کب تک روشنیاں دکھا دکھا کر بچوں کو بہلاتے رہیں گے؟ ہم اُن کی کھری کھری اور سچی باتوں کے حامل معصوم سے شعور کو کب تک یونہی دھوکہ دیتے رہیں گے؟ ہم اُن میں حقیقت شناسی کی صلاحیت کو پروان چڑھانے کے لئے پہلو تہی کیوں کرتے ہیں؟ کہیں اس لئے تو نہیں کہ ہمارا بھرم خود ہماری نظروں میں بنا رہے؟۔۔ وہ اپنی سوچوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

شام کو وہ اپنے تینوں بچوں کو لے کر شہر کی بڑی مسجد میں منعقد ہونے والی محفلِ میلاد میں شامل ہوا۔ نعت خوانی اور درود و سلام کے بعد مقررین نے جوشِ خطابت کے مظاہروں سے حاضرین کو گرمانے کی پوری کوشش کی۔ نعرہ ہائے تکبیر و رسالت میں وہ بھی شریک آواز ہوتا رہا۔ موسم کی گرمی کے باوجود لوگوں کی اچھی خاصی تعداد وہاں موجود تھی۔ پوری مسجد بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ مقررین نے حاضر اور غیر حاضر ساعتوں کو اپنی قادر الکلامی کے جوہروں سے نوازنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اظہارِ عقیدت میں تراکیب الفاظ کے انبار بڑھتے رہے۔۔ قرینے اور سلیقے کی دھجیاں اور چیتھڑے اُڑتے رہے۔ اُس کے اندر اک سناٹا پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ اُس سناٹے میں وہ گم ہوتا چلا گیا۔ باہر

اتنی رونق۔۔اتنی چہل پہل اور اندر اُسی قدر سناٹے کا راج۔۔اُس کو یہ سب رسمی سا لگ رہا تھا۔کسی کی آواز میں خوشی کی کوئی رمق تک نہ تھی، مسرت کا کوئی رنگ اصلی نہ تھا لیکن سب جشنِ ولادت ﷺ منا رہے تھے۔

اُس نے اپنے اندر بڑھتے پھیلتے سناٹے سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا۔قریب بیٹھے باریش لوگوں کی پیشانیوں پر پڑے بل عید کی خوشی کے بجائے وہاں اپنی موجودگی کا احسان جتاتے محسوس ہوئے تو اُس نے اُدھر سے

نظریں ہٹا کر دور بیٹھے بچوں کی طرف نگاہ کی۔اُن کے چہرے خوشی سے دمکنے کی بجائے اک مصنوعی سنجیدگی اور اک اصلی سی کوفت کے ائینہ دار نظر آئے۔ایک بچے کی آنکھوں میں اُسے حیرت و استعجاب لہراتا نظر آیا۔اُس نے سر جھٹکا اور تقریر کی طرف متوجہ ہونے کی کوشش کی۔

مقرر نے حضور ﷺ کے رحمۃ اللعالمین ہونے کے حوالے سے بات اُٹھائی ہوئی تھی۔وہ حضور ﷺ کو آپ ﷺ کے عفو و درگزر، انسانوں اور جانوروں پہ رحم کھانے، اقربا اور اغیار پہ مہربانیوں اور شفقتوں، شفیعِ مذنبین ہونے اور ساقیِ کوثر ہونے کے ناتے رحمۃ اللعالمین قرار دے رہا تھا۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بابت اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد گرامی۔۔اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو سوائے اس کے کہ آپ ﷺ کو رحمت بنا دیا تمام جہانوں کے لئے ۔۔کی شرح کرتے ہوئے جب اُس نے فتح مکہ کے موقعے پر عام معافی کی دلیل دی اور بتایا کہ اللہ نے چونکہ آپ ﷺ کو مجسم رحمت بنایا اس لئے آپ ﷺ نے ترس کھاتے ہوئے اُن سب کفار اور مشرک لوگوں کو معاف کر دیا جو آپ ﷺ کے خون کے پیاسے تھے اور اسی طرح وہ ﷺ روزِ قیامت سب گنہگاروں پہ ترس کھاتے ہوئے انہیں اللہ سے معاف کروائیں گے۔۔تو اُس کے اندر اتھل پتھل شروع ہو کر ایک سوال کی صورت اُس کے ذہن میں چکرانے لگی۔

مجرموں اور گنہگاروں کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے سزائیں مقرر فرمائی ہیں۔ رحم اور قطع ید سے لے کر کوڑوں اور قصاص میں قتل تک کر دینے کے احکام اس دنیا کے لئے اور آخرت میں جہنم اور جہنم میں زقوم اور کھولتا پانی اکل و شرب کے لئے۔۔۔ اور حضور نبی مکرم ﷺ جو اللہ تعالیٰ کے نظام اور قوانین کو ہم سب سے بہتر سمجھتے اور جانتے ہیں۔ جن کی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کے قوانین اور نظام کے نفاذ کی جد وجہد اور تگ و دو میں گزری۔ کیا وہ خود اللہ تعالیٰ سے اُن تمام قوانین اور نظامِ کائنات کو پسِ پشت ڈالنے کا کہہ دیں گے؟ وہ بھی کسی ایسے مجرم اور گنہگار کے لئے جس کو اُن ﷺ کے امتی ہونے کا فخر ہی فخر ہو لیکن وہ امتی ہونے کیذمہ داریوں سے کلی طور پر بے خبر ہی نہیں بلکہ اُس کی پوری زندگی آپ ﷺ کے دیئے ہوئے نظام کے اتباع کی بجائے عملی طور پر مخالفت میں گزری ہو۔

اُس کا جی چاہا کہ وہ کھڑا ہو کر اُس محترم بزرگ مقرر سے ذہن میں آنے والے سوال کی وضاحت مانگے لیکن محفل کا رنگ اُس کے حوصلے پست کر گیا۔ یہ موقع سوال جواب کا نہیں۔ یہ سوچ کر وہ چپ بیٹھا رہا۔ شاید آگے چل کر وہ خود ہی اس نکتے کی وضاحت میں کچھ کہہ دے۔ اُس نے اپنے اندر مچلتے اور طوفان اُٹھاتے سوال کو دبانے کا بہانا تراشا۔ اسی انتظار میں ایک کے بعد ایک مقرر آتا اور گفتار کے جوہر دکھاتا رہا۔ پھر اجتماعی سلام کے بعد اختتامِ مجلس کا علان ہوا اور وہ اپنے اندر ابھرتے سوال کو دبائے بچوں کو ہمراہ لئے گھر کو چل دیا۔

واپسی پر بچے چند ایک عمارات پر آرائشی روشنیاں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے لیکن اُس کا ذہن اپنی الجھن میں گھرا ہوا تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام رحمۃ اللعالمین ہیں تو آپ ﷺ کی رحمت عالمین کو کس طرح سے مستفیض کر رہی ہے؟ معلوم مثالوں سے صرف اہلِ مکہ پر ہی سایہ فگن ہے؟ اُس کو نہ عالمین کا پتہ تھا اور نہ ہی رحمت کی کسی عملی صورت سے آگاہی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ رحمت کا مفہوم ترس کھانے کے مترادف قرار دینے پہ آمادہ و تیار نہ تھا۔ اُس

نے اپنی لاعلمی کے اندھروں کی گھٹن سے گھبرا کر باہر نکلنے کی سر توڑ کوشش کی لیکن لے دے کر ایک ہی بات سامنے آتی رہی کہ اُس کا دھیان رحمت سے بارانِ رحمت کی طرف ہی جاتا رہا اور اُس کو جھٹک کر رحمت کو سمجھنے کی تگ و دو کرتا رہا۔

بچے اُس کے اندر کی اچھل کود سے بے نیاز اپنی دھن میں مگن تھے وہ اُن کے ہمراہ ہوتے ہوئے بھی اُن کے ساتھ نہ تھا۔ اُس کے شعور میں ایک ہی بات تکرار کر رہی تھی۔ اُس کو حضور ﷺ کے رحمۃ للعالمین ہونے کی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ الجھا ہوا نہیں ہے، صرف بات پہ مناسب توجہ اور دھیان نہ ہونے کے سبب وہ اُس کی تہہ تک نہیں پہنچ پا رہا تھا۔

عید کی خوشیوں کی تلاش میں نکلے بچوں کے ساتھ وہ بھی ایک بچے کی طرح فرمانِ خداوندی کے اصل مفہوم کی تلاش میں چل رہا تھا۔ اُس کو یہ بھی معلوم تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو اصرار کے ساتھ رحمۃ اللعالمین قرار دیا ہے تو وہ صرف ایک زمانے تک ہی محدود نہیں رہے اور نہ کسی ایک خاص مقام، قبیلے یا قوم کے لئے مخصوص رہے۔ اگر اللہ تعالیٰ خود کو رب العالمین کہہ کر متعارف کرواتا ہے تو حضور ﷺ کو رحمۃ اللعالمین کہنے کا ایک ہی مفہوم بنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ابدیت اور جاودانی کی نعمت سے بھی سرفراز فرمایا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ہر عالم کو محیط ہے اسی طرح حضور ﷺ کی رحمت بھی ہر ہر عالم کو سیراب کر رہی ہے۔

ابو! پارک! ہم پارک جائیں گے۔۔ ہمیں پارک لے جائیں نا! بچوں نے پارک کے قریب سے گزرتے ہوئے پارک میں جانے کی خواہش کی۔۔ تو وہ گاڑی پارک میں لیتا چلا گیا۔ بچوں نے پارک میں جا کر کھلی فضا میں آزاد

پرندوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ اُن کی آزادی اور اُس سے حاصل ہونے والی خوشی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ محفلِ میلاد میں چہروں پر تھکن، اکتاہٹ اور کوفت سے سجے بچوں کو دیکھنے کے بعد وہ انہیں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے، خوش ہوتے اور کلکاریاں مارتے دیکھتے ہوئے ایک طرف گھاس پر جا بیٹھا۔

''میں یہاں بیٹھتا ہوں۔ جاؤ تم کھیلو مگر زیادہ دور مت جانا۔'' اُس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی بچے اپنے اندر بھری توانائی خرچ کرنے میں مصروف ہو چکے تھے۔

وہ کھلی فضا کی آسودگی کو محسوس کرتا گھاس پہ بیٹھ گیا۔ وہاں ارد گرد ٹہلتے لوگ، بھاگتے دوڑتے بچے، غبارے اور کھانے پینے کی چیزیں بیچنے والوں کو دیکھتے دیکھتے اُس کا ذہن دوبارہ ''رحمت'' کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''بارش کو بارانِ رحمت کہتے۔ بارش سے ترحم اور ترس کا کیا رشتہ؟ بارش کو سیرابی اور نمو سے تو تعلق ہے لیکن اس میں ترس، رحم اور مہربانی کا عنصر کیسے فٹ ہو گا؟ اُس کے منطقی ذہن میں خیال کا ایک کوندا لپکا۔ بارش اس گھاس سے لے کر درختوں اور پودوں تک کو زندگی کے وسائل بہم پہنچانے کا ایک ذریعہ ہونے کی وجہ سے بارانِ رحمت کہلاتی ہے۔ تو اس کا مطلب ہوا کہ حضور ﷺ سے دلوں کو جو ایقان و ایمان ملتا ہے وہ بارش کی طرح اُن کی سیرابی اور نمود پر داخت کا سبب بن جاتا ہے۔ ضرور یہی بات رہی ہو گی جس کے سبب اللہ تعالیٰ نے انہیں رحمۃ اللعالمین قرار دیا ہے۔'' اُس نے سوچا۔

اس سوچ نے اُکو روشنی کی ایک کرن سجھائی اور وہ کرن بڑھتی اور پھیلتی گئی۔ اُس کو حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس ایک بادل کی طرح عالمین پر پھیلی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک ایسا بادل جس سے رحمت کی بوندیں برستی ہیں اور ہر ذی روح کو سیراب کرتی ہیں۔ وہ رحمت کا یہ مفہوم خود اپنے دل میں اترتے محسوس کر رہا تھا۔ رحمت کو مہربانی اور رحم

اس ہی لئے کہا گیا ہو گا کہ وہ زندگی ی نمو کے علاوہ اُس کی تخلیق اور قیام کی بھی ذمہ دار ہے۔ تخلیق کی لہروں کا کنٹرول رحمۃ اللعالمین ﷺ کے حوالے کر دینے کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے خود کو احسن الخالقین قرار دیا ہو گا اور پھر اس تخلیق کی پرورش کے لئے اپنی صفت ربوبیت کو پھیلا کر، خود کو رب العالمین فرما دیا۔

اچانک اُس کو اپنے مراد کی کہی ہوئی ایک بات سمجھ آتی چلی گئی۔ انہوں نے فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ وسائل پیدا کرنے والی ذات ہے اور حضور ﷺ وسائل تقسیم کرنے والی ہستی۔ وہ سوچنے کہ بجائے ذہن میں آنے والے اُن سب خیالات کو سمیٹنے میں مگن، اپنے اندر ایک لذت اور سرور کو پھیلتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ یہ لذتِ آگہی اور سرور اور اک اُس کی رگ رگ میں پھیلتا چلا جا رہا تھا۔

اُس نے بچوں کو آواز دی۔ ''آؤ آئس کریم کھلاؤں!'' آئس کریم کھاتے ہوئے وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا۔ بچے اپنے ابو کو خوش دیکھ کر اور بھی کھلے جا رہے تھے۔ اُس کے چھوٹے بیٹے سے رہا نہ گیا اور اُس نے کہہ دیا۔ ''آج ابو نے عید ہمارے ساتھ منائی ہے۔ ہم پکنک پر نہیں گئے لیکن عید منائی۔''

اُس نے بیٹے کو پیار کیا اور کہا۔۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔'' بچے نے باپ کی بات سُن کر فخر سے گردن اکڑا کر اپنے بھائیوں کو دیکھا اور بھولپنے سے پوچھا۔ ''میری وجہ سے؟ کیا ہوا ہے میری وجہ سے؟''

''تمہاری وجہ سے آج میں نے بھی عید میلاد النبی ﷺ منائی ہے۔'' بچے مسکرائے اور اُس نے دل ہی دل میں پکارا۔۔ یا رحمۃ اللعالمین! اور غیر شعوری طور پر عربی کے اُس گیت کا مصرع گنگنانے لگا جو حضور ﷺ کے ہجرت کے بعد مدینہ پہنچنے پر یثرب کی بچیوں نے گایا تھا۔ جس کا مفہوم کچھ یوں ہے۔

طلع البدر علینا (ہمارے لئے آج بدر کامل طلوع ہوا ہے)

یہ مصرع گنگناتے ، جب وہ گھر داخل ہوئے تو اُس نے بیوی نے کہا۔ ''آج بڑے چہک رہے ہیں۔ کیا بات ہے ؟''

''ہے ایک بات ۔۔ بھئی آج میں نے عید منائی ہے اور اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو گی ؟''

بیوی نے اس جواب پر اُس کو نظر بھر کر دیکھا۔۔ گویا اُس کو جانچ رہی ہو۔

اِقراء

وہ ذات اقدس اور سیرت مطہرہ ﷺ جس سے نسبت اور تعلق پر ہر مسلمان فخر کرتا ہے۔ اُن پر درود و سلام بھیجنا اپنی سعادت اور اعزاز سمجھتا ہے۔ کروڑوں مسلمان ہر روز دن میں کئی کئی بار اللہ کی بارگاہ میں یہ درخواست پیش کرتے نہیں تھکتے ہیں: ''اے بارِ الٰہ تو اپنے محبوب ﷺ سے ہمارا تعلق اور ربط قائم فرما دے۔'' لیکن قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ کتنے لوگ ہیں جو واقعی اُن ﷺ کی نسبت سے فیضیاب اور اُن ﷺ سے تعلق قائم کرنے کے اعزاز سے مشرف ہو سکے ہیں۔ عشقِ رسول ﷺ مذہبی اور روحانی حلقوں میں زیرِ گفتگو رہنے والے موضوعات میں سے ایک پسندیدہ اور مرغوب سمجھا جاتا ہے۔ اس حوالے سے کی جانے والی گفتگو ی تان بالآخر اس بات پر آکر ٹوٹتی ہے کہ این سعادت بزور بازو نیستتانہ بخشد خدائے بخشندہ اور ہر مسلمان عشقِ رسول کی آرزو رکھنے کے باوجود خود کو اس کا اہل نہ سمجھتے ہوئے دم سادھ لیتا ہے۔

لیکن دوسری طرف کچھ ایسے اصحاب کا تذکرہ بھی کچھ کم نہیں جو اس دولتِ عشق سے سرفراز ہوئے۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام سے اُن کو ایسی نسبت اور تعلق خاطر نصیب ہوا جو آنے والوں کے لئے ایک روشن مثال کا درجہ رکھتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لوگوں کی محبت اور عقیدت کے بے شمار رنگ عوام اور خواص کے سامنے آئے، آتے رہے اور آتے رہیں گے۔ ان میں کچھ رنگ اتنے تیز اور شوخ ہیں کہ شعور چندھیا کر رہ جاتا ہے۔ آپ ﷺ سے لوگوں کی محبت اور عقیدت کا ایک ادنیٰ سا انداز یہ تھا کہ جب لوگ آپ ﷺ سے مخاطب ہوتے تو اپنے ماں باپ کو آپ ﷺ کو آپ ﷺ پر فدا کرنے کا علان کرتے ہوئے آپ ﷺ سے شرفِ گفتگو حاصل کرتے۔ آپ ﷺ سے اُن کی محبت کا ایک انداز یہ بھی تھا جسے تاریخ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے کہ اُس محبت کے ہاتھوں آپ ﷺ

پر اُٹھتی تلواروں کی ضربات کو وہ اپنے ہاتھوں اور جسموں پر قبول کرنا اپنی سعادت سمجھتے۔ تعمیل ارشاد میں مال و دولت ہی نہیں، جسم و جاں کے نذرانے پیش کرنا اُن کے لئے مقصد حیات کا درجہ رکھتا تھا۔ آپ ﷺ کے دندانِ مبارک کی شہادت کا سُن کر خود اپنے دانتوں کو پتھر مار مار کر توڑنا فرض سمجھنے والوں نے عشق نبی ﷺ کی ایسی ایسی مثالیں قائم کیں جن کی نظیر کسی بھی دوسرے انسان کے لئے نہ ملتی ہے اور نہ ہی کبھی ملے گی۔

اس گروہ عشاق کے سرخیل حضرت اویس قرنی قرار پاتے ہیں جنہوں نے عشقِ رسول ﷺ میں وہ مقام حاصل کیا جو نوع انسانی میں آج تک کوئی فرد نہ حاصل کر سکا ہے اور نہ ہی کبھی کر سکے گا۔ اپنی ذات سے گزر کر، زمان و مکاں کی حد بندیوں سے بالا تر ہو کر اپنے نبی ﷺ کی ذات پہ جس طرح سے وہ پروانہ وار فدا ہوئے۔ اُس کی تقلید کی خواہش تو کی جا سکتی ہے لیکن اُس کے برابر آنا ناممکن ہی محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرت ابو طالب اپنے بھتیجے کی محبت میں شعب ابی طالب کی دشوار راہ میں کچھ اس انداز سے ہمراہ ہوئے کہ اپنی جان سے گزرنا انہیں گوارا ہوا لیکن ساتھ چھوڑنا نہیں۔

قدرت کا یہ ایک عجیب چلن ہے کہ ایک طرف جہاں کچھ لوگ آپ ﷺ پر پروانہ وار نثار ہونا سعادت اور اعزاز جانتے ہیں وہاں دوسری طرف ایسے افراد بھی ہوئے جو آپ ﷺ کی دشمنی میں اندھے ہو کر اتنی دور نکل گئے کہ آپ ﷺ کی جان و مال، عزت و آبرو، خیر و عافیت، سکھ چین سب کچھ ختم کر دینا انہوں نے خود پہ فرض کر لیا تھا۔

ہر چیز کے دو رخ ہوتے ہیں۔ اس قانون کے تحت جہاں ایک طرف ابی لہب، ابو جہل، ابو سفیان جیسے دشمن اپنی سعی ناپاک سے آپ ﷺ کا وجود مسعود محض اس وجہ سے مٹانے پر تلے ہوئے تھے کہ خانہ کعبہ کے طفیل اُن کو حاصل ہونے والی آمدنی میں رکاوٹ نہ آنے پائے۔ دوسری طرف آپ ﷺ کو ابو طالب اور حضرت خدیجہ ،

حضرت علی کرم اللہ وجہ اور ابو بکر جیسے جانثار ساتھی بھی عطا ہوئے۔ حضرت ابو طالب اور حضرت خدیجہ نے شعب ابی طالب کے انتہائی کڑے اور سخت امتحان میں جس طرح ساتھ دیتے ہوئے اپنی جانوں سے گزرنے کا عملی مظاہرہ کیا، وہ اُن کی بے لوث محبت اور خلوص آگیں جذبات کا ایک سیدھا سادہ اظہار ہی تو تھا۔ یہ دونوں آپ ﷺ سے محبت کرنے والی ہستیاں اُس معاشی اور معاشی اور معاشرتی بائیکاٹ کی قربان گاہ میں آپ ﷺ پر نچھاور ہو گئیں جو کفار مکہ نے آپ ﷺ کو راہِ حق سے ہٹانے کی موہوم امید پر تیار کی تھی۔

اُس نے چشمِ تصور سے صحرا کے انتہائی گرم تپتے دنوں اور سرد یخ بستہ راتوں میں، بستیوں سے دور، ریگزار میں ایک ویران سنگلاخ قہر بداماں گھاٹی میں گنتی کے چند لوگوں کو اس کسمپرسی کی حالت میں دیکھنے کی کوشش کی اور اُن مناظر کو جو اُس کے تصور نے اُس کے ذہن کی سکرین پر ابھارے، دیکھ کر کانپ کر رہ گیا۔ گرمی سے نڈھال لوگوں کے پاس پینے کا پانی نہیں، پانی کہیں دور سے لایا جاتا ہے تو پکانے کا سامان نہیں، نوبت اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ چمڑے کے جوتے ابال کر بعام کا بندوبست کرنا پڑتا ہے۔ بڑے تو بڑے بچوں کو بھی اسی تنور، وحشت میں جھونکا ہوا ہے۔ وہ معصوم بچے اپنے بڑوں کی ثابت قدمی کے امتحان کو مزید کڑا کرنے کا سامان بننے کی بجائے اُن کی دل جوئی اور حوصلے کا سبب بن رہے ہیں۔

اُس نے سوچا کہ یہ سب حضور الصلوٰۃ والسلام جیسی ہستی جو محبوب کبریا اور وجہ تخلیق کائنات ہیں، کے ساتھ ہی کیوں ہوا۔ اُن کے ساتھ تو ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اُن کی پوری زندگی اذیت، دشواریوں اور مصائب سے عبارت نظر آتی ہے۔ پیدا ہونے سے پہلے یتیمی، بچپنے میں ماں کا داغ مفارقت دے جانا، لڑکپن میں دادا کا سایہ سر سے اُٹھنا، جوانی میں کسب معاش کی جد وجہد، غارِ حرا میں مجاہدہ، نبوت سے سرفراز کیا جانا، ڈھلتی عمر کے ساتھ اپنوں کا دشمن بن

جانا، خدیجہ اور ابو طالب کا ساتھ چھوٹنا، ہجرتِ مدینہ کے دن تک کوئی دن، کوئی لمحہ ایسا نہیں جس میں جان کو خطرہ لاحق نہ رہا ہو، عزتِ نفس اور آبرو کو تار تار کرنے کا کون سا طریقہ تھا جو نہیں آزمایا گیا؟ بیٹیوں کو طلاق دے کر باپ کی رسوائی اور جگ ہنسائی کا سامان کیا جانا، سرِ عام گالیاں دی جانی، راستے میں کانٹے بچھائے جاتے، اوباش لوگوں سے سنگ زنی کروائی جاتی، حالتِ سجدہ میں پکڑ کر مارنا، اونٹ کی اوجھ میں سر اندر دے کر، گردن کے گرد رسی سے باندھ کر تڑپتا چھوڑ دینا، نفرتوں اور ملامتوں کا سامنا، تحقیر اور سرزنش کے سامان کرنا۔۔ اور یہ سب اُس ذی وقار ہستی اور بندے کے ساتھ ہوتا رہا جو افضل ترین مقام، مقامِ محمود کا راہی تھا۔

اُس کے شعور میں اس حوالے سے استعجاب پیدا ہوا، اور حیرت بنتا چلا گیا۔ کبھی اُس کا جی ترس اور ترحم کی طرف مائل ہوتا تو کبھی اُس کو نظامِ قدرت پہ غصہ آنے لگتا۔ کبھی وہ یہ سوچتا کہ اللہ نے اُن ﷺ کو ان مصائب اور دشواریوں سے بچانے کا کوئی انتظام کیوں نہ کیا؟ اُس کو خیال آتا کہ آخر وہ اتنی روحانی قوت کے حامل تھے تو انہوں نے اپنے مخالفین کو روکا کیوں نہیں؟ وہ سوچتا کہ لوگوں کو چاہیے تھا کہ وہ اس قدر ظلم و ستم نہ کرتے۔ آخر اُن پر ایسی کیا بپتا آن پڑی تھی کہ وہ اللہ کی دی ہوئی صلاحیتوں کو اللہ کے محبوب ترین بندے ﷺ ہی کے خلاف استعمال کرنے پر تل گئے اور اس حد تک بڑھ گئے کہ اُن میں سے اکثر میدانِ جنگ میں جہنم رسید ہوئے۔

وہ سوچتا رہا۔ یہ خیال اُس کے ذہن میں اکثر عود کر آجاتا۔ وہ اپنے ذہن میں اُٹھنے والے سوالوں کو توجہ کے سامنے سجا کے بیٹھتا تو اُس کو طرح طرح کے جواب سوجھتے۔ لیکن جب وہ اُن جوابوں کو اپنے قلبی اطمینان کی کسوٹی پر

پرکھتا تو وہ اُس کے دل سے اتر جاتے۔ کبھی وہ حضور ﷺ کی کامیابیوں اور دنیا میں اُن کے نام کا بول بالا ہونے کی دلیل لاتا، کبھی لوگوں کی اُن ﷺ کی ذات سے وابستہ توقعات کہ وہ اُن کی شفاعت کریں گے، اُن کو حوضِ کوثر کے

مشروب سے سیراب کریں گے ، محض اُن ﷺ کے نام لیوا ہونے کے ناتے اللہ تعالیٰ اپنے تمام انتظامی اور تکوینی اصولوں ، قوائد ضوابط اور قوانین کو پسِ پشت ڈال کر انہیں جنت میں داخلے کی اجازت دے دے گا۔ لیکن یہ سب درست ہو بھیتو سوال تو پھر بھی اپنی جگہ بر قرار ہی رہا کہ حضور نبی آخر زماں ﷺ کو اتنی کڑی اور سخت آزمائشوں سے کیوں گزارا گیا؟ اس میں کیا حکمت تھی؟ کیا راز تھا؟

ایک روز اُس کے بیٹے نے اُس سے اپنے اسکول کے کام میں مدد چاہی۔ اُس کو لوہے سے مقناطیس بنانے کا تجربہ کرنے میں کامیابی نہیں ہو رہی تھی ، اس لئے اُس نے اپنے والد سے مدد مانگ لی۔ وہ اُس کو بتانے لگا کہ کسی عام سے لوہے کے ٹکڑے کو مقناطیس بنانے کے دو طریقے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ کسی بڑے مقناطیس کو اُس پہ ایک خاص طریقے سے بار بار رگڑا جائے۔ یہ طریقہ وقت طلب ہے اور اس کے اثرات بھی زیادہ دیر قائم نہیں رہتے۔ جتنی دیر وہ بڑے مقناطیس کی قربت میں رہتا ہے اسی تناسب سے اُس میں بھی مقناطیسیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے طریقہ یہ ہے کہ لوہے کے ٹکڑے کو برقی رو سے پیدا کردہ مقناطیسی میدان میں رکھا جاتا ہے۔ اس سے وہ ٹکڑا اتنی دیر بہت طاقتور مقناطیس بنا رہتا ہے جب تک وہ اُس مقناطیسی میدان میں رہتا ہے۔ جب برقی رو بند کر دی جئے تو مقناطیسی میدان کے ختم ہوتے ہی اُس کی مقناطیسیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

اُس کے بیٹے نے سوال کیا۔ ''ابو! یہ بڑے مقناطیش کیسے بنتے ہیں؟ اُن کی مقناطیسی طاقت تو ختم نہیں ہوتی۔''

''ہاں بھئی ۔۔ وہ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قدرتی طور پر پائے جاتے ہیں اور دوسرے خود بنائے جاتے ہیں۔ قدرتی طور پر پائے جانے والے مقناطیس کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ لوہے کی چٹان پر آسمانی بجلی گرنے کے نتیجے

میں بنتے ہیں۔ جو کارخانوں میں خود بنائے جاتے ہیں اُن کو بنانے میں عام سے لوہے کی بجائے فولاد استعمال کیا جاتا ہے اور اُن کے بنانے میں بہت طاقتور برقی رو مہیا کی جاتی ہے۔'' اس نے جواب میں کہا۔

''فولاد ہی کیوں؟'' اُس کے بیٹے نے دریافت کیا۔

''اس لئے کہ فولاد مقناطیس بن جائے تو اُس کی مقناطیسی طاقت جلد ختم نہیں ہوتی۔'' اُس نے کہا۔ بچہ جواب سُن کر مطمئن ہو گیا۔ خاموشی کے اُس کے مختصر لمحے میں اُس کو لگا کسی نے اُس کے اندر اچانک روشنی بھر دی ہو۔ سوال کا وہ کانٹا جو اُس کے شعور میں چبھن کا سبب بنا ہوا تھا، اُس کو اس سوال کا جواب سمجھ آ رہا تھا۔ ایک بڑا اور پائیدار مقناطیس بنانے کے لئے طاقتور برقی رو سے پیدا کردہ مقناطیسی میدان کے علاوہ و علیٰ قسم کا فولاد درکار ہوتا ہے۔ فولاد جس قدر اچھی قسم اور اعلیٰ معیار کا ہوگا، اُس کو مطلوبہ صورت میں ڈھالنے اور بنانے میں اُسی قدر زور زیادہ لگے گا۔ خوشی سے اُس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ واقعی اللہ کے کاموں کی حکمت کی سمجھ آنا بڑی سعادت ہے۔ اس سعادت پہ خوش ہونا بھی چاہیے۔

''حضور ﷺ خیر البشر اور اکمل و کامل بندے کو آنے والے تمام زمانوں کے لئے اتنا بڑا مقناطیس بنایا جا رہا تھ کہ جو بھی اُن سے جڑے ''مقنایا'' جائے۔ اسی لئے اُن ﷺ کو جن مصائب اور دشواریوں سے گزارا گیا، اُس کو وہ عام لوہے کو ڈھالنے والی بھٹی اور فولاد ڈھالنے والی بھٹی کی حدت کے فرق کی مثال سے سمجھ آ رہا تھا۔ عام لوہے کو ڈھالنے والی بھٹی کی حدت اور تپش۔۔ فولاد کو ڈھالنے والی بھٹی کی حدت اور تپش سے وہی نسبت رکھتی ہے جو لوہے اور فولاد کے معیار میں ہوتا ہے۔'' اُس نے سوچا۔

اسی نہج پر سوچتے سوچتے اُس کے ذہن میں ہیرے کا خیال آیا۔ خام حالت میں ہیرے کو پہچاننے کے لئے جوہر شناسی کی قابلیت درکار ہوتی ہے۔ عام آدمی اس حالت میں اُسے ایک عام سا پتھر ہی سمجھتا ہے لیکن جوہر شناس جانتا ہے کہ تراشیدگی کے بعد یہ کتنا قیمتی جوہر ہوگا۔ ہیرا بھی اپنی کیمیائی ساخت کے سبب کوئلے کے اجزا کا حامل ہونے کے باوجود دنیا میں سخت ترین شے مانا جاتا ہے۔ جتنا بڑا ہیرا ہوتا ہے اُسی قدر اُس کی کٹائی، تراشیدگی، چھلائی اور رگڑائی کے مراحل دشوار ہوتے ہیں۔ دیگر عام پتھروں کی تراش خراش اتنی دشوار نہیں ہوتی جس قدر ہیرے کی ہوتی ہے۔ وہ جو انبیاء کی طویل مالا کا مرکزی ہیرا بننے جارہا تھا، اُس ذات اقدس کو تراشیدگی کے جن مراحل سے گزارا گیا۔ وہ جتنے دشوار تھے اسی قدر اُن ﷺ کی آب و تاب اور ضوفشانی میں اضافہ ہوا۔ اُن کو حالات کی بھٹی کی اُسی حدت سے گزارا گیا تھا، جو نوع انسانی کے سب سے اعلیٰ بندے کو کائناتی نظام کو سب سے اہم رکن بنانے کے لئے ضروری تھی۔

اس بات کے اُس کے ذہن میں صاف ہو جانے کے بعد ایک دن اُس کو خیال آیا کہ یہ ہیرے اور فولاد کی مثال ہے تو بہت خوب لیکن یہ سب حالات و واقعات تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی میں آپ ﷺ کی بعث کے بعد شروع ہوئے تھے۔ بعث سے پیشتر آپ ﷺ کی زندگی اتنی دشوار تو نہ تھی جس قدر بعث نبوی کے بعد ہوگئی۔ اس خیال نے اُسے چکرا کر ہی رکھ دیا۔ حضور ﷺ کی بعث سے پہلے کی زندگی میں آزمائشوں اور ابتلا کا بعث کے بعد درپیش دشواریوں اور سختیوں سے کوئی موازنہ ہی نہیں بنتا تو پھر یہ ہیرا اور فولاد کی مثال کے موجب تو حضور کی بعث کہیں جا کے فتح مکہ کے دن ہونا چاہیے تھی۔ یہ تو ساری صورت حال ہی کچھ اور ہے۔ آپ پہ آزمائشوں اور ابتلا کا دور نبوت ملنے

کے بعد کیوں شروع ہوا؟ نبی بننے سے پیشتر تربیت، تراش خراش اور تیاری کے جن مراحل سے گزارا گیا تھا وہ کیا تھے؟

اس سوال سے اُس نے اغماض برتنے کی کوشش کی تو یہ سوال اُس کے سر چڑھ گیا اور ایسا چڑھا کہ وہ اٹھتے بیٹھتے خود کو اسی ادھیڑ بُن میں مصروف پاتا۔ سیرت کی کتب کا مطالعہ ۔۔۔ اُس کو امید کی کرن نظر آئی۔ اُس نے سیرت پہ مختلف مصنفین کی کتب کو اس حوالے سے دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ لیکن یہ دیکھ کر اسے حیرت اور صدمہ ہوا کہ خیر البشر ﷺ کی بعث سے پہلے کی زندگی اور خصوصاً آپ ﷺ کی شادی سے لے کر بعث تک کی زندگی کے پندرہ سالوں کی روداد پہ تقریباً تمام سیرت نگار خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں۔

حضور نبی مکرم ﷺ کی زندگی کے ان پندرہ سالوں کی روداد محض چند جملوں میں یہ کہ کر قلم بند کی گئی ہے کہ بعث سے پہلے آپ ﷺ کا رجحان تنہائی کی طرف بڑھ گیا اور آپ اکثر عبادت کرنے غارِ حرا تشریف لے جایا کرتے۔ کچھ نے لکھا کہ آپ ﷺ غارِ حرا تشریف لے جاتے اور اللہ کی نشانیوں پہ غور و فکر کرتے۔ چند ایک کتب میں اُس نے پڑھا کہ آپ غارِ حرا تشریف لے جاتے اور وہاں مراقبہ کرتے۔ غارِ حرا جانا بعث سے دو تین سال پہلے آغاز ہوا ہو تو پھر باقی بارہ تیرہ برس کس حال اور کن کیفیات میں گزرے؟ اس سوال کا جواب اُس کو کسی سیرت نگار کی نگارشات میں نہ مل سکا۔

اب اس کی توجہ حضور ﷺ کی بعث سے پہلے کی زندگی میں تربیتی مراحل کی طرف مرکوز رہنے لگی۔ وہ اس ضمن میں جتنا بھی سوچتا اُس کو اُسی قدر اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا۔ وہ مطالعہ کرتا رہا اور ذہن میں بسے اس سوال کے کچوکوں سے بچنے کی تگ و دو میں لگا رہا۔ کئی بار اُس نے یہ سوچ کر ہار مانتے ہوئے طے کیا کہ حضور ﷺ کی زندگی کے

اُس دور میں راوی چین ہی چین لکھتا ہو گا اسی لئے سیرت نگاروں نے اس دور کے حالات کو قلم بند کرنا ضروری نہیں سمجھا ہو گا۔ لیکن اُس کا تنقیدی ذہن اس کو قرار نہ لینے دیتا اور وہ سوالوں کے بگولوں میں گھرا پریشان خیالی کا شکار ہوتا رہا۔

ایک روز وہ سیرت کی ایک کتاب میں بعث کا واقعہ پڑھ رہا تھا کہ کس طرح ایک روز حضرت جبرائیل امین حضور ﷺ کے پاس پہلی وحی لے کر آئے اور کہا۔ ''پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، پیدا کیا انسان کو ایک پھٹکی لہو سے، پڑھ۔۔۔اور تیرا رب بڑا کریم ہے، جس نے علم سکھایا قلم سے، سکھایا انسان کو جو وہ نہ جانتا تھا۔'' روایات میں ہے کہ اِس پہ حضور ﷺ نے کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ حضرت جبرائیلؑ نے حضور کو اپنے سینے سے لگا کر بھینچ کر چھوڑا۔ پھر وحی کے الفاظ مکرر ارشاد فرمائے۔ حضور ﷺ نے دوبارہ یہی فرمایا۔ میں اُمی ہوں۔ اس پر حضرت جبرائیلؑ نے آپ کو دوبارہ سینے سے لگا کر بھینچا۔ حضور ﷺ کا جواب اب بھی وہی تھا۔ تیسری مرتبہ بھی اسی طرح ہوا۔ اس واقعہ کے زیرِ اثر حضور ﷺ پر وحشت اور گھبراہٹ کا اس قدر غلبہ ہو گیا کہ وہ ناتوانی محسوس کرنے لگے۔ آپ ﷺ پر لرزہ طاری ہو گیا اور آپ گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھر آکر انہوں نے حضرت خدیجہ سے کہا ۔''مجھے کچھ اوڑھنے کو دو۔۔''اس پر حضرت خدیجہ آپ ﷺ کو تسلی دیتی ہیں اور پھر کافی عرصہ وحی کا سلسلہ منقطع رہتا ہے۔

یہ سبکچھ پڑھ کر اُس کے اندر ایک عجیب سے سوال نے سر ابھارا۔ وحی کے الفاظ میں ''اقراء'' کا ہونا اور حضور ﷺ کا جواب میں خود کو اُمی فرمانا۔ اس پر فرشتے کا انہیں پکڑ کر سینے سے لگا کر بھینچنا اور پھر اصرار سے دوبارہ اور سہ بار یہی حرکت فرمانا۔ وحی کی ایات اور الفاظ عربی میں ہیں اور حضور ﷺ کی عربی فصاحت اور بلاغت

کسی طور زیرِ بحث نہیں آسکتی ۔ تو انہوں نے جب خود یہ فرمایا کہ میں اُمی ہوں یعنی پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو ہماس کا مفہوم الفاظ کی منہ سے ادائی لیتے ہوئے یہ ماننے پر کیوں مصر ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کا منشا و مقصد محض ان الفاظ کی تلاوت کروانا اور اُن کو حضور ﷺ سے کہلوانا ہی تھا۔ جبکہ اس مقصد کے لئے ''قل'' یعنی کہہ دیجیئے کا لافظ بھی نہیں برتا گیا اور نہ ہی وہاں یتلو یعنی تلاوت کیجئے کہا گیا۔

اس کے شعور میں ایک سرسراہٹ سی ہوئی ، اس کی سمجھ میں یہ بات آنے لگی کہ وہاں حضرت جبرائیلؑ نے حضور ﷺ کے سامنے کوئی تحریر رکھنے کے بعد کہا ہوگا۔''اسے پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، یدا کیا انسان کو ایک پھٹکی لہو سے ، پڑھ ۔۔۔اور تیرا رب بڑا کریم ہے ، جس نے علم سکھایا قلم سے ، سکھایا انسان کو جو وہ نہ جانتا تھا۔ اور اس پر حضور ﷺ نے کہا''میں پڑھا ہوا نہیں ہوں''۔ اس پر جبرائیلؑ نے انہیں سینے سے لگا کر آپ ﷺ کو اُس تحریر کو پڑھنے کی صلاحیت منتقل فرمائی۔ بعد کے واقعات بھی اسی امر کی طرف اشارہ کناں ہیں کیونکہ اپنے اندر اچانک ایک نئی صلاحیت کے اجاگر ہونے سے انسان کا اختلاج محسوس کرنا امرِ بشری ہے۔ رفتہ رفتہ کسی صلاحیت کا بیدار اور اجاگر ہونا ایک بات ہے اور اُسی صلاحیت کا خارقِ عادت طریقے سے ابھارا جانا ایک بالکل دوسری بات ہے۔

رہی یہ بات کہ وہ تحریر کیا تھی؟ تو اس کا جواب اُس کے اندر سے فوراً ہی ابھر آیا۔ وہ ضرور کتاب المبین ہوگی۔ اس جواب کے ذہن میں آتے ہی ، اپنے مرشد کریم کے فرمائے ہوئے یہ الفاظ اُس کے حافظے کی اسکرین پر جگمگا اُٹھے۔ نظامتِ تکوین میں حضور ﷺ کتاب المبین کے انچارج ہیں۔

اب اس کو ہر بات بالکل واضح طور پر سمجھ آ رہی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کو بعث سے سرفراز فرمایا تو آپ ﷺ کی تربیت، تیاری، تراش خراش، سب کچھ اللہ تعالیٰ خود فرما چکا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے مناسب سمجھا آپ ﷺ کو نبوت کے اعلان کا حکم دے دیا۔ نابوت کا اعلان کرتے ہی شیطانی اور طاغوتی قوتیں آپ ﷺ کے خلاف سرگرم عملہو گئیں۔ شیطان نے اپنے ماننے والوں کو اپنا آلہ کار بناتے ہوئے حضور ﷺ کا راستہ روکنے کی سر توڑ کوشش شروع کر دی۔ حضور ﷺ اس بات سے خوب اچھی طرح واقف اور آگاہ تھے۔ اسی لئے آپ نے کبھی بھی اُن لوگوں کے لئے بدُعا نہیں فرمائی جو آپ ﷺ کی مخالفت میں حد سے گزر چکے تھے بلکہ اُلٹا اُن کے راہ ہدایت پہ آنے اور فلاح کی دُعا ہی فرماتے رہے۔

وہ مقامِ قرب تلک گئے

ایک مسلمان ہونے کے ناتے ہم یہ بات مانتے اور اُسے اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھتے ہیں کہ ہم جس نبی مرسل ﷺ کے ماننے والے ہیں اُن کو ہر نبی اور رسول پر ایک برتری اور فوقیت حاصل ہے۔ لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو کیا ہم مسلمانوں کو حضور ﷺ کے اُس عالی شان مرتبے اور عالی مقام حیثیت کا، جو انہیں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے ، واقعاً کچھ ادراک بھی ہے یا نہیں؟ دیکھنے میں یہی آتا ہے کہ ہم مسلمانوں کی اکثریت کی عقیدت حضور ﷺ سے محض رسمی ہی ہے۔ معدودے چند لوگ ایسے جن کو اس بات کا واقعی کچھ اندازہ ہے کہ حضور ﷺ کے عالی مرتبت ہونے کا اصل مفہوم کیا ہے؟ ورنہ اکثریت کا عقیدہ تو یہ ہے کہ حضور ﷺ باعثِ تخلیقِ کائنات اور نورِ اول ہیں لیکن اُن کو اس بات کا مکمل شعور اور کوئی واضح ادراک حاصل نہیں۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کے مقام کا کچھ اندازہ عطا فرما دیتے ہیں، اُن لوگوں کو زمانہ عاشقِ رسول ﷺ کے طور پر جاننے لگتا ہے اور حبِ رسول ﷺ ان کا وطیرہ اور چلن قرار پاتا ہے۔ وہ عشقِ رسول ﷺ میں کچھ ایسے گرفتار ہو جاتے ہیں کہ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے اُن کے پیشِ نظر یہی بات رہتی ہے کہ اُن کا تعلق کہ اُن کا تعلق حضور ﷺ سے کیونکر جڑ سکتا ہے اور جڑنے کے بعد اُس میں اُستواری اور پائیداری کیونکر آسکتی ہے؟

معجزات کے ضمن میں روحانی علوم جاننے والوں کا کہنا ہے کہ ہر معجزہ جو کسی بھی پیغمبر سے صادر ہوتا ہے، وہ اُس علم کا اظہار ہوتا ہے جو اُس نبی کو عطا ہوا تھا۔ نبی کو جو بھی علم دیا جاتا ہے وہ اُن کے زمانے میں مروج علوم پر اس قدر حاوی اور برتر ہوتا ہے کہ اُس دور کے ماہرین اور علما کا علم اُس نبی کے علم کے سامنے عاجز رہ جاتا ہے۔ جیسے قومِ ثمود سنگ تراشی کے فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے حضرت صالح کو یہ معجزہ عطا فرمایا کہ

انہوں نے کسی قسم کے مادی وسائل کے بغیر پہاڑ میں سے زندہ اونٹنی نکال کر دکھا دی۔ فن اور ہنر کی یہ معراج دیکھ کر وہ قوم بجائے اس کے کہ اُن پر ایمان لاتی، اُس نے کٹ حجتی کی اور بالآخر اُس اونٹنی کو ہی مار ڈالا۔

یہی صورت حال حضرت موسیٰ کو درپیش ہوئی۔ اُن کے زمانے میں جادو گری کا بہت زور تھا۔ لوگ خارق العادت کمالات سے اپنی برتری ثابت کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو جو معجزات عطا فرمائے، انہیں دیکھ کر اُس دور کے ماہرینِ فن دنگ رہ گئے اور اُن کا علم حضرت موسیٰ کے علمِ نبوت کے سامنے عاجزی اور بے بسی سے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ کے دور میں طب اور مسیحائی کے بہت چرچے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو اس علم و فن میں اتنا یکتا کر دیا کہ محض پھونک مار دینے یا ہاتھ پھیر دینے سے ہی مریض صحت یاب اور مردہ زندہ ہو جاتا۔ ہر گمراہ قوم کی طرح اُن کی قوم نے بھی بجائے اس کے وہ اُن سے یہ علم سیکھتی اُن سے پیچھا چھڑانے کو انہیں مصلوب کروانے کی سازش کی۔

دین اسلام مذاہب عالم میں وہ واحد و مذہب ہے جس کی بابت اللہ تبارک و تعالیٰ نے آقائے نامدار ﷺ کو یہ بشارت دی۔ ''آج ہم نے دین کو آپ کے لئے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت آپ ﷺ پر تمام کر دی'' یہ بات کسی دین یا مذہب کے بانی نے نہیں کہی کہ اُس کا مذہب تکمیل و کاملیت سے سرفراز کر دیا گیا ہے۔ اسی لئے خاتم النبیین، حبیب کبریا ﷺ نے بارگاہِ رب العزت سے یہ اعزاز پایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خاتم النبیین قرار دے کر اُن ﷺ کے بعد بابِ نبوت کو ہی بند کر دیا۔ مذاہب عالم میں تحقیق کرنے والوں نے اس بات کو خوب نوٹ کیا ہے کہ ہر مذہب کے بانی نے سرکارِ دو عالم کی صفتِ محمدیہ کو اجاگر کر کے بیان کیا۔ اس بات کو اُن کی پہچان بتایا کہ وہ خالق اور مخلوق دونوں کے لئے محبوب ہوں گے۔ حضرت عیسیٰ نے اُن کو ''فارقلیط'' لا لقب دیا تو اہلِ ہنود کے بانیان

مذاہب نے آپ ﷺ کی پہچان یہ بتائی کہ وہ صحرا میں سفید گھوڑے پر سفر کرنے والا ہوگا۔ دیدوں میں آپ کے لئے نراشنس اور موہن مدن یعنی بہت تعریف کیا گیا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

حضور نبی کریم ﷺ جس وجہ سے امام الانبیا قرار پائے وہ آپ ﷺ کا سفر معراج کا واقعہ ہے جس کی بابت پروردگارِ عالم فرماتا ہے۔ ''پاک ہے وہ ذات جو لے گئی رات میں اپنے بندے کو مسجد الحرام سے برکتوں والی مسجد اقصیٰ تاکہ اُس کو مشاہدہ کروادے اپنی نشانیوں کا۔'' (سورہ اسرا) اس سفرِ معراج کی جزئیات و تفصیلات ہمیں احادیث میں ملتی ہیں۔ اجمالاً یہ واقعہ کچھ یوں ہے۔ ایک رات جبرائیلؑ امین براق نامی سواری لے کر بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کو سفرِ معراج پر لے گئے۔ اس سفر کے دو مرحلے تھے۔

پہلے مرحلے میں آپ ﷺ خانہ کعبہ سے مسجد اقصیٰ پہنچے اور وہاں تمام انبیا کی امامت فرمائی۔ اُس کے بعد آپ ﷺ نے رب العامین سے بالمشافہ ملاقات فرمائی۔ قرآنِ حکیم اس ملاقات کو قابِ قوسین کے معنی خیز الفاظ سے بیاں کرتا ہے کہا اللہ اور اُس کے بندے کے درمیاں کوئی فاصلہ نہ رہا جو کچھ آپ ﷺ نے دیکھا وہ غلط نہ تھا۔ آپ ﷺ نے وہ باتیں کی جو دل نے چاہئیں۔

اس سفرِ معراج کا سب سے حیرت ناک پہلو یہ ہے کہ سارا سفر وقت کی ایک تہائی قلیل اکائی میں مکمل ہوا۔ اس سفرِ معراج سے سردار الانبیا ﷺ نے ٹائم اسپیس (زمان و مکاں) کی حدود میں جاری ہر قانون سے بالاتر ہو کر اپنی برتری اور قوتِ تسخیر کا ثبوت دیا۔ فخر موجودات نے اپنی عبودیت سے عبدیت کا وہ اعلیٰ ترین مقام حاصل کیا جہاں خالقِ ارض و سما نے جھک کر انہیں اپنی طرف بلند کر لیا۔ عبدیت کی اس سربلندی سے جہاں ہر قانون کی نفی ہو گئی

اور ہر حد فسخ کر دی گئی وہاں بشریت اپنے حد کمال پر پہنچ کر شرف خلافتِ الٰہیہ سے سرفراز ہوئی اور وجہِ تخلیق کائنات کا مدُعا مکمل ہوا۔

روایت ہے کہ تحفہ صلوٰۃ حضور پُر نور ﷺ کے اسی سفرِ معراج کی یاد ہے اور اسی سبب حضور نبی کریم نے صلوٰۃ کو مومن کی معراج قرار دیا ہے۔ ہر نماز کی تکمیل پر التحیات کا پڑھنا فرض قرار دیا ہے۔ وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے حکمت اور فہم و فراست سے نوازا ہے اور انہوں نے غور و فکر سے کام لیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ التحیات کے الفاظ درحقیقت اللہ تعالیٰ اور اُس کے بندے ﷺ کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ریکارڈ ہیں۔ یہ اُس اجلاس کی کاروائی کا اظہار ہیں جو اللہ اور خیر البشر ﷺ کے مابین معراج میں منعقد ہوا یعنی یہ اُس ملاقات کے Minutes of Meetingہیں جو خالق اور سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے درمیان اس سفر کا نکتۂ عروج تھی، جس کی نظیر نوعِ انسان پیش کرنے سے قاصر و عاجز ہے۔

جب ہم التحیات کا جائزہ لیتے ہیں تو اس میں ہمیں کل چار کلمات ملتے ہیں۔ پہلا جملہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مان لیا جائے تو دوسرا جملہ اللہ ربِ کریم کا فرمان معلوم ہوتا ہے۔ تیسرا جملہ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد کردہ ہے اور چوتھا جملہ۔۔ جس میں اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور ربوبیت اور صاحبِ محمود ﷺ کی عبدیت اور رسالت کی گواہی دی جاتی ہے۔۔ فرشتوں اور دیگر مخلوقات کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔۔ اس میٹنگ کا ماحاصل ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب پیغمبر کامل ﷺ اللہ جل شانہ کے حضور حاضر ہوئے تو انہوں نے حضرت موسیٰ کی طرح یہ سوال نہیں پوچھا۔ کون؟ اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے اُن کے سوال کے جواب میں اپنا تعارف بتوتے ہوئے کہا۔ ''میں ہوں تیرا رب!'' بلکہ یہاں پورے فہم و ادراک، ہوش و حواس اور یقین اور مشاہدے سے کہا گیا۔

التحیات للہ ولصلوٰۃ و طیات۔ یعنی تحیہ ہو اللہ کا جس کو سزاوار ہیں ہر طرح کی عبادات کا تعلق خواہ وہ جسمانی ہوں یا مالی۔ حضرت عالیٰ مقام ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی ثنا کے لئے جو الفاظ انتخاب فرمائے وہ نہایت غور طلب ہیں۔ تحیہ کا مفہوم ۔۔ جے ہونا ۔۔ سربلندی اور عالی وقار ہونا مادہ حی ہونے کے سبب زندہ باد کے نعرہ کے جذبات کا اظہار بن جاتا ہے ثنا اور تعریف کی اتنی موثر اور بلیغ صورت اور کیا ہو سکتی ہے؟

اپنے محبوب ترین بندے کی یہ بات سن کر اللہ تبارک تعالیٰ اُن کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔

"السلام"علیک ایّھا نبی " ورحمتہ اللہ وبرکات یعنی سلامتی ہو آپ ﷺ پر اے میرے نبی اور رحمت ہو اللہ کی آپ ﷺ پر اور برکت دی آپ ﷺ کو۔

یہاں یہ بات محل توجہ رہے کہ یہ کوئی رسمی کلام نہیں بلکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا کلام ہے یہ اُس ذاتِ بزرگ و برتر کا فرمان ہے جس کے کن کہہ دینے سے پوری کائنات وجود میں آگئی، اُس ذاتِ اقدس نے اپنے محبوب کو سلامتی، رحمت اور برکت سے نوازا۔

روحانی نکتہِ نظر سے یہ تینوں باتیں ہم معنی اور مترادف نہیں ہی بلکہ ان میں سے ہر ایک کی معنویت اور اہمیت ایک انفرادی اور امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔ سلامتی، رحمت اور برکت نظامِ کائنات کے تین عظیم الشان شعبے

ہیں۔ ان میں کسی بھی طرح کی کمی اور خرابی کسی بھی چیز کے وجود کو عدم میں دھکیل دیتی ہے۔ اُس کو فنا سے دوچار کر دیتی ہے یا اُس کو ادھورا اور بے کار بنا دیتی ہے۔

عظیم روحانی سائنسدان حضور قلندر بابا اولیاء نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف ''لوح و قل'' میں ان باتوں کو واشگاف کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ ''اللہ تعالیٰ کا کوئی بھی اسم دراصل ایک تجلی ہے۔ یہ تجلی اللہ تعالیٰ کی ایک خاص صفت کی حامل ہوتی ہے۔ زندگی کی ہر ہر حرکت اللہ تعالیٰ کی صفتِ خالقیت کے تحت واقع ہوتی ہے یعنی صفتِ خالقیت کی حدود میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس حرکت کا محفوظ رہنا اللہ تعالیٰ کی کسی ایسی صفت میں ممکن ہے جو احاطہ کر سکتی ہو اور حفاظت کر سکتی ہو چناچہ یہ لازم ہوا کہ جو حرکت صفتِ خالقیت کے تحت شروع ہو اُس کی تکمیل صفتِ قدرت کی حدود میں ہو یعنی ہر حرکت کے لئے لازم ہو گیا کہ وہ صفتِ خالقیت یعنی رحمت کی حدوں میں شروع ہو اور صفت مالکیت یعنی صفتِ

قدرت کی حدوں میں تکمیلِ پزیر ہوا۔ اس اصول سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ رحمت اور قدرت کے سائے میں ہی حرکت وجود پا سکتی ہے اور ان دونوں صفات کا سہارا لئے بغیر کسی بھی حرکت کا وجود نا ممکن ہے۔''

اس بیان سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ زندگی رحمت اور قدرت کا مجموعہ ہے اس بیان کی روشنی میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندے کو یہ کہہ رہا ہے۔ السلامُ علیک ایُھانبی و رحمۃ اللہ وبرکات تو یہ محض رسمی یا دُعائیہ الفاظ نہیں ہیں بلکہ خالقِ کائنات وجہ تخلیق کائنات کو اپنی صفات میں سے تین اہم صفات سے نواز رہے ہیں۔ اس نوازش اور عطا کا سلسلہ یوں تو رب ہونے کے ناتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یوں بھی اپنی مخلوق کے

لئے جاری رہتا ہے لیکن اگر کوئی بندہ عبودیت کی انتہا پر پہنچ کر خود اللہ تبارک تعالیٰ کی ہستی تک پہنچ اور رسائی حاصل کر لیتا ہے تو لا محالہ اللہ تعالیٰ کی نوازشات کا رنگ اور بھی ابھرا ہوا ہو گا۔

التحیات کا اگلا جملہ بھی حضور ﷺ سے منسوب ہے۔ جس میں آپ نے فرمایا۔ السلام علینا و علی عباد للہ الصالحین (سلامتی ہو ہم پر اور اللہ کے اُن بندوں پر جو اللہ کے لئے خالص ہو کر کام کرتے ہیں) یعنی آپ ﷺ نے ایک شعبہ کائنات ۔۔ سلامتی کو کھڑے کھڑے اللہ کے صالح بندوں کے ساتھ شیئر کر لیا اور باقی دو شعبے رحمت اور برکت اپنے براہ راست چارج میں رکھ لیے۔ آپ ﷺ کی یہ ادا دیکھ کر ملائے اعلیٰ بے اختیار گواہی دینے لگے۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ ہی سزاوارِ الٰہیت ہے جس نے اپنے محبوب کو اس قدر نوازا اور یہ کہ بلاشبہ حضور پُر نور محمد مصطفےٰ ﷺ کی ذات عبدیت اور رسالت کا حق رکھتی ہے۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ روحانی علوم کی اصطلاح میں "یعنی بندہ ایک عہدہ ہے جس پر کسی فرد کی تقرری اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں حضرت موسیٰؑ کو علومِ لدنیہ سے متعارف اور روشناس کروانے کو اللہ تعالیٰ انہی اپنے بندوں میں سے ایک بندے کے پاس جانے کا حکم دیتے ہیں وہاں یہ بات کھل کر سامنے اتی ہے کہ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو صرف اور صرف رضائے الٰہی کے لئے کام کرتے اور اُن کو اللہ تعالیٰ اپنی جناب سے براہ راست اپنے کاموں کا علم اور حکم عطا فرماتا ہے۔

حضور احمدِ مجتبیٰ ﷺ عبدیت کی اُس انتہا کو چھو لیتے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ انہیں اپنے بندوں میں، اپنے رسولوں اور پیغمبروں میں ممتاز اور منفرد کرتے ہوئے انہیں اپنی رحمت اور برکت سے نوازتے ہیں۔ قرآن اس بات کی تصدیق اور گواہی میں یہ بات رہتی دنیا تک کے لئے واشگاف کر دیتا ہے۔

"وماارسلنک الا رحمۃ اللعالمین"

اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو سوائے اس کے کہ آپ ﷺ عالمین کے لئے رحمت بنا دیئے گئے ہیں۔

درود و سلام ہو اُس ذات، نذیر و بشیر پر جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ رحمت سے اتنا نوازا اور انہیں اپنے اتنا قریب کر لیا کہ انہیں اپنی کائنات کے عالمین کے تخلیقی اور تکوینی نظام کے شعبہ رحمت کا انچارج مقرر فرما دیا۔ اسی لئے ہر مسلمان چاہے اس بات سے شعوری طور پر آگاہ ہو یا نہ ہو، جب بھی اللہ تعالیٰ سے ربطہ اور تعلق استوار کرنے کو صلوٰۃ قائم کرتا ہے تو وہ التحیات کے الفاظ کرتے ہوئے ذہن و شعور میں اُس ملاقات کے Minutes دہراتا ہے جو خالقِ کائنات اور اُس کے کامل ترین بشر ﷺ کے مابین ہوئی تاکہ اُس کو بھی وہ انوار منتقل ہو سکیں جو سفرِ معراج کا زادِ راہ ہیں۔

اَللّٰہُ اَکبَرُ

بعض اوقات نہ چاہتے ہوئے بھی بالکل غیر ارادی طور پر کسی عام سی بات پر توجہ کچھ اس انداز سے مرکوز اور مرتکز ہو جاتی ہے کہ وہ عام سی بات انتہائی خاص بات بن کر ابھر آتی ہے۔

ہر وقت سامنے رہنے والی باتوں کو ہم اکثر معمولی جاننے کے سبب ہم کوئی اہمیت نہیں دے پاتے اور ذہن غیر معمولی کی تلاش اور جستجو میں لگا رہ جاتا ہے۔ عام اور معمول کی باتوں میں ہمیں نہ تو کوئی قدرت نظر آتی ہے اور نہ ہی کوئی معنی آفرینی لیکن اگر کبھی توجہ کسی ایسی بات کی طرف مبذول ہو جائے اور ذہن اس کی گہرائی میں اُترتا چلا جائے تو ذرے میں آفتاب، قطرۂ آب میں سمندر اور لفظ میں اک جہانِ معانی بے نقاب ہو کر عقل کو خیرہ فہم کو سیراب اور وجدان کو توانائی مہیا کر دیتے ہیں جب کبھی ایسا ہو جاتا ہے تو پھر بات ذہن کی گہرائیوں تک رسائی کے لئے مستعد اور تیار ہو جاتی ہے اور پھر کوئی بات معمولی، عام اور لایعنی نہیں لگتی۔

وہ عیدِ قربان کا دن تھا۔ گھر کے سبھی افراد صبح سویرے اُٹھ کر تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ بچے نہادھو کر نمازِ عید کے لئے نئے نئے کپڑے پہن کر تیار ہوئے۔ نماز دوگانہ ادا کر کے واپس آکر قربانی کی تیاری ہوئی۔ قصاب نے جانور کو الٹا لٹا کر اللہ اکبر کہتے ہوئے چھری چلائی۔ بچے نہایت اشتیاق سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ خون کو بہتا دیکھ کر اُس کی بیٹی نے افسوس اور تاسف محسوس کیا اپنے ابو کے نزدیک ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اُس بچی کے ذہن میں کئی سوال ابھرے اور ڈوب گئے۔ سُنی ہوئی باتوں کی بازگشت ابھری۔ قربانی کے جانور پر بیٹھ کر اُس نے جنت کے راستے میں آنے والے پُل صراط پر سے گزرنے کی بات کے حوالے سے اُس بات کی تصدیق کے لئے اپنے والد سے پوچھا۔ ”کیا ہم سب گھر والے اِس پر بیٹھ کر اُس معلق پل پر سے گزر جائیں گے؟ اُس کی بات اور کہنے کے انداز کی معصومیت پر وہاں

موجود سب نے لطف لیتے ہوئے اثبات میں جواب دیا۔ تو اُس کی ہمت بندھی۔ قربانی سے فارغ ہو کر، گوشت تقسیم کرنے، بانٹنے، پکانے اور کھانے تک اُس نے کئی اور سوال بھی پوچھے۔ اُس کے باپ نے حسبِ عادت اُس کے ہر سوال کے جواب میں اُس کو مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی۔ لیکن اُس بچی کو یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اُس کے امی ابو اور سب بھائی بہن اکٹھے ایک ہی دنبے پر کیوں کر بیٹھ سکیں گے۔ ایک سکوٹر پر تو وہ سب اکٹھے بیٹھ نہیں سکتے۔ اتنے سے دنبے پر کیسے بیٹھ سکیں گے۔ اُس کے بھائی نے اُس کی اس الجھن پر کہا۔ ''وہاں اللہ میاں کے پاس جا کر یہ دنبہ گھوڑے جتنا بڑا ہو جائے گا۔ جب تک ہم وہاں پہنچیں گے اُس وقت تک یہ اتنا ہی تھوڑا رہے گا۔ اچھا تو یہ بات ہے۔ اُس نے آنکھیں مٹکائیں۔۔اسی لیے دنبہ ذبح کرتے وقت قصاب اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر کہہ رہا تھا تا کہ اللہ اس کو بڑا کر دے۔''

وہ بچی کی بات سُن کر ہنس پڑا۔ وہ کیا سب ہی گھر والے اُس معصوم سی سوچ سے لطف لیتے ہوئے ہنسنے لگے۔ آٹھ نو سال کی عمر میں سوچ میں اتنی ہی لطافت اور معصومیت ہونی چاہیے۔ جب ظہر کی اذان ہوئی اور موذن نے طویل لے میں اللہ اکبر کہا تو اُس کے ذہن میں اپنی بیٹی کی بیان کی ہوئی توجیہہ ابھری اور معدوم ہو گئی۔ نماز کے دوران اُس نے جتنی بار بھی اللہ اکبر کہا۔۔ایک لطیفا ور خوشگوار تاثر اس کے اندر سے ابھرتا اور اُس کو اللہ کے بڑے ہونے کی بجائے اشیا کو بڑا کرنے کی معصوم سی غلط فہمی کی طرف متوجہ کرتا رہا۔

نماز کے بعد وہ آرام کرنے لیٹا تو اُس کی بیٹی بھی آ کر اُس کے پاس لیٹ گئی۔ عید کے زرق برق لباس میں وہ گڑیا لگ رہی تھی۔ اپنے ابو کو عیدی میں مہمانوں سے ملنے والے پیسوں، اپنی سہیلیوں سے ملنے، نئی گڑیوں سے کھیلنے، سکول میں اپنی ٹیچر کی کہی ہوئی باتوں کو دہراتے وہ مسلسل بول رہی تھی کہ اُس کی امی نے اُس کو ٹوکا۔ ''اچھا اب اپنے

ابو کو آرام کرنے دو۔'' اُس نے اپنی ماں کی مداخلت پر برا سا مناتے ہوئے اپنے ابو کی طرف دیکھا۔۔ وہ آنکھیں موندے اُس کی بات سُن رہے تھے۔

''ٹھیک ہے۔۔ شام کو ابو مجھے پارک لے جائیں گے نا؟'' آرام کرنے دینے کے عوض یہ سودا کرنے کا سنہری موقع تھا۔

''ہاں۔۔ کیوں نہیں بیٹا!'' اُس کو کہتے ہی بنی۔

اور وہ یہ سنتے ہی اپنے بھائیوں کو اطلاع دینے دوڑی۔

عصر کی اذان سنتے ہوئے اُس نے گنا۔ مؤذن نے اذان دیتے ہوئے چھ بار اللہ اکبر کہا۔ اب اقامت میں بھی چھ بار تکبیر کہی جائے گی۔ ہر رکعت میں بھی چھ ہی تکبیریں ہوتی ہیں۔ اُس نے دن بھر میں ادا کی جانے والی نمازوں میں رکعتوں کی تعداد کو چھ سے ضرب دے کر اندازہ لگایا کہ ہر روز اوسطاً تین سو بار اللہ اکبر کہلوایا اور سنایا جاتا ہے۔

نوافل زیادہ ہوں تو یہ تعداد مزید بڑھ جاتی ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو اُس کے کان میں اذان اور اقامت، مختلف مواقع پر تکبیرات، عید کے دن اہتمام سے تکبیر کا ورد، نمازِ عیدین میں زائد تکبیرات، جانور ذبح کرتے وقت اور زندگی کے مختلف مواقع پر نعرہ تکبیر کی صورت ہم زندگی بھر اس کلمے کو بھلا کتنی بار کہتے اور سنتے ہیں؟ اُس نے سوچا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ایک متوسط عمر کا مسلمان جو تیس چالیس سال نماز پنجگانہ پابندی سے ادا کرتا رہے وہ اس کلمے کو لگ بھگ تیس چالیس لاکھ مرتبہ سے زائد سُنتا اور اپنے منہ سے ادا کرتا ہے۔ ذہن اچنبھے کا شکار ہو گیا۔ حیرت ہے! اس سے پیشتر تو میں نے کبھی اس طرح سے سوچا ہی نہیں۔

قرآنِ حکیم میں اس کلمے کی بابت کیا کہا گیا ہے؟ اُس کے شعور میں ایک سوال ابھرا۔ اُس نے اس استعجاب کو نظر انداز کرنے کی سعی کی لیکن ذوقِ تجسس نے اُس کی پیش نہ چلنے دی۔ وہ کلام پاک میں اس کو ڈھونڈتا ہی رہ گیا۔ جب اُس کو یہ اندازہ ہوا کہ یہ لفظ قرآنِ حکیم میں استعمال نہیں ہوا ہے تو اُس کو اور بھی حیرت ہونے لگی۔ ثنا، درود، التحیات، بھی تو قرآن سے نہیں لئے گئے۔۔ اُس نے سوچ کر خود کو بہلایا۔

نماز کے دوران اس لفظ کو ادا کرتے ہوئے شعوری طور پر اس کے مفہوم کی طرف ہوتا رہا۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔۔ نہیں۔۔ بلکہ اللہ ہی تو ہے جو سب سے بڑا ہے۔ اُس نے اللہ کی بڑائی کو اپنے تصور میں محسوس کرنے کی کوشش کی۔ اس کائنات سے بھی بڑا۔ ذہن و تصور میں اتنی وسعت اور فراخی کہاں کہ وہ اللہ کی بڑائی اور کبریائی کا احاطہ کر سکے۔ اس ہی لئے تو قلب مومن کی شرط رکھی گئی ہوگی۔۔ اس نے سوچا۔

یہاں سے اُس کی سوچ اس طرف مڑ گئی کہ جو ذات کائنات کی وسعتوں سے بھی ماورا ہے وہ قلب مومن میں کیوں کر سما جاتی ہے؟ کائنات زیادہ وسیع ہے قلب انسانی؟ شعور خیالات اس رو کے دھارے میں مزاحم ہوا۔ قلب تو اک جزوِ کائنات ہے، تو وہ کل سے ماورا اور بڑا ہے جزو میں کیوں کر سمیٹا جا سکتا ہے؟ اس منطق نے اُس کو الجھا کر رکھ دیا۔ اسی سوچ میں نماز تو تمام ہوئی لیکن سوچ جاری رہی۔

وہ فکر کے زینوں پر شعوری طور پر چڑھنے کی کوشش کرتا لیکن جلد ہی اُس کی سوچوں کا دم پھول جاتا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی کو اپنی محدود سوچ سے محسوس لرنا چاہ رہا تھا۔ اُس سوچ سے جو اُسے ماں باپ سے ملی تھی۔۔ اُس سوچ سے جو اُسے ماحول اور آس پاس کے لوگوں سے ملی تھی وہ اللہ کی بڑائی کا تصور کرنے لگا۔ اس کائنات سے بھی بڑا۔

شعور ایسی وسعت اور فراخی رکھتا کہ وہ اللہ کی بڑائی اور کبریائی کا احاطہ کر سکتا تو شعور کیوں رہتا؟ اس کے لاشعور نے بتایا کہ ہم اللہ کو مادی حواس کے پیمانوں، فاصلوں اور جسمانی طول و عرض کے حوالے سے بڑا مانیں گے تو یہ الجھن لامحالہ درپیش رہے گی کہ وہ ہمارے نفس میں کیوں کر سما سکتا ہے؟ اُس کی بڑائی کا تعلق یقیناً طول و عرض کی بجائے اہمیت، عظمت و عالی مقام ہونے سے ہے۔

جس انتظام اور اہتمام سے حضور ﷺ نے اس ترکیب کی تکرار کا بندوبست فرما دیا تھا، یہ بات اُس کے لئے انتہائی جاذبِ توجہ بن گئی تھی۔ انتہائی غیر محسوس انداز میں اتنی بار تکرار کروانے میں یہی مصلحت رہی ہو گی کہ ہر مسلمان کے اندر اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور کبریائی کا احساس نقش ہو کر گہرا ہوتا رہے۔ لیکن وہ اپنے ارد گرد کسی میں اس احساس کو دیکھنے قاصر تھا۔ وہ آج تک خود بھی اس ترکیب کو محض منہ سے ادا ہی تو کرتا آیا تھا۔ یہ تو آج اُس کی بیٹی کی طفلانہ سوچ نے اُس کو اس طرف متوجہ کر دیا تھا ورنہ اُس کے ذہن میں اس سے پیشتر یہ بات کیوں نہ آئی تھی؟

ابتدائے سحر مؤذن کی اسی اذان سے ہی تو ہوتی ہے کہ اللہ ہی کی ذات ہے جو سب سے بڑی ہے اور دن کا اختتام بھی اسی صدا پر ہوتا ہے لیکن ہر بار یہ صدا ذہن کو مہمیز کرنے کے بجائے جس طرح اُس کو تھپک کر سُلا دیتی ہے وہ ظلمت اور جہالت ہی کی دلیل ہے۔ یہ المیہ ہے کہ ہم الفاظ سُنتے ہیں اور انہیں سمجھتے نہیں، کہتے ہیں لیکن بلا جانے بوجھے۔۔ جب خود کہنے والے پر بھی مفہوم واضح نہ ہو تو اُس میں اثر اور تاثیر کہاں سے آئے گی اور سننے والا اُس کی طرف کیوں متوجہ ہونا چاہے گا؟ چاہے اُس کی تکرار لاکھوں نہیں کروڑوں بار ہی کیوں نہ ہو۔

کئی روز و شب اسی ادھیڑ بن میں گزر گئے۔ وہ جب جب اللہ اکبر کہتا تو جیسے کوئی اُس کے اندر اُس کا منہ چڑاتا۔ وہ اپنے محدود حواس کی حدود میں مادی پیمانوں سے بڑائی کو ناپنے کی کوشش کرتا۔ زمین و آسمان کی نہائیوں سے پرے تک محیط اور بسیط، لا محدود ذات کے پھیلاؤ کو محسوس کرنے کی سعی کرتا اور اُس کی عقل خبط ہو کر رہ جاتی۔

ایک روز اُس کو اپنے بابا جی کا کہا ہوا ایک جملہ یاد آیا۔ کسی نے اُن سے نماز کے دوران ذہن میں آنے والے خیالات سے بچنے کا طریقہ دریافت کیا تھا۔ اُس پر انہوں نے کہا تھا۔ ”جب آپ نے اللہ اکبر کہہ دیا تو اب اگر کوئی خیال آیا تو اس کا مطلب ہو کہ وہ خیال بڑا ہوا۔ آپ اللہ کو بڑا مان لیں تو ہر شے اُس کی بڑائی کی اوٹ میں چلی جانی چاہیے اور کسی بھی چیز کا خیال نہیں ائے گا۔“ اُس وقت جب یہ بات کہی گئی تھی اُس نے اُس کو محض سطحی طور پر سُنا تھا اور

رعایتِ لفظی کی حد تک لطف لیا تھا لیکن اب اس بات پر غور و فکر کرتے ہوئے مفہوم و معانی کی نئی جہتیں کھلیں۔ ہم اللہ کو مادی فاصلوں اور جسمانی قامتوں کے اندازوں کی بنیاد پر بڑا ماننے کی عادت ترک نہیں کریں گے تو یہ مسئلہ کبھی حل نہیں ہو گا۔

اور جہاں تک اس بات کو مان لینے کا تعلق ہے تو اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ انسان کی اپنی ذات بنتی ہے۔ وہ جب تک خود کو چھوٹا تسلیم نہیں کر لیتا اللہ کی بڑائی اس کے اندر راسخ ہو نہیں سکتی۔ جب تک آدمی کی اپنی ذات ترجیحات میں سر فہرست رہتی ہے ہر چیز کی اہمیت ثانویت کے درجے میں رہنے کی پابند ہے۔ اسی لئے نفی ذات کا درس دیا جاتا ہے تاکہ آدمی کی اہمیت، اختیار اور طاقت کے کسی بھی حوالے سے خود کو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کو بڑا مانے۔

جب تک انسان کے ذہن میں کسی چیز کی کوئی اہمیت بر قرار رہتی ہے۔ اس وقت تک وہ شے اُس کے ذہن میں اپنا مقام بنائے رکھتی ہے اور جب اُس شے کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے تو وہ شے بھی ذہن سے اُتر جاتی ہے۔

اس لئے جب تک آدمی اللہ تعالیٰ کو اہمیت نہ دینے لگے اللہ کا دھیان اس کے اندر راسخ نہیں ہو سکتا۔ ان ترجیحات پر ہمہ وقت نظر رہنی چاہیے اور اسی لئے اللہ نے اپنے محبوب کے ذریعے یہ پروگرام ترتیب دے کر اُس کو جاری فرما دیا ہے کہ انسان دن میں تین سو بار سے زائد مرتبہ اس بات کی تکرار کرے کہ انسان کی کسی بات، کسی چیز، کسی خیال کی کوئی اہمیت نہیں اگر کسی کی اہمیت ہے تو وہ صرف اللہ کی ہے اور اس کی اہمیت کے سامنے ہر چیز کی اہمیت معدوم ہی ہو جانی چاہیے۔

اس نے دو چار دوستوں سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ وہ سب بھی خود اسی کی طرح آگاہی کی اس منزل پر کھڑے تھے جو روشنی سے بہت دور تھی۔ اس کے ایک دوست نے اُس کو اِس طرف بھی متوجہ کیا کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اس ادارے کا سب سے بڑا افسر کون ہے؟ تو ہمارے ذہن میں اس افسر کے جثے، قدو قامت یا جسامت کے حوالے سے جواب نہیں ابھرتا بلکہ اس کا مفہوم اختیار اور اقتدار میں آخری اور حتمی فیصلہ کرنے، پالیسی بنانے میں خود مختاری اور آزادی رکھنے والے کی ذات ہی آتی ہے۔ اپنے دوست کی بات سنتے ہوئے اُس کو اپنے بابا جی کی ایک اور بات حافظے میں تازہ ہو گئی۔

انہوں نے اپنے مرشد کریم کی ایک بات سناتے ہوئے ایک عجیب سے لہجے میں فرمایا تھا۔ ''اجی اللہ میاں تو اتنے بڑے ہیں کہ وہ جو جی چاہے کریں کوئی اُن کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ وہ ایک ذرا سے کیڑے سے کہہ دیں کہ انسان بن جاؤ اور وہ نہ بنے یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اُس کے اندر اس بات کی تہیں کھلنا شروع ہوئیں۔ تو اس

کا مطلب یہ ہوا کہ اس بات کا علم بندے کے اندر راسخ کرنے کے لیے اُس کو اللہ کی بڑائی اور کبریائی کی تکرار کروائی جاتی ہے کہ وہ اس بات کو محسوسات میں شامل کرنے کے بعد ماننے پر مجبور ہو جائے کہ اللہ ہی کی ذات ہے جو اس کائنات میں سب سے بڑی ہے۔ اُس کے ذہن میں ایک اور گتھی بھی سلجھتی چلی گئی۔

کبھی کبھار وہ سوچا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات میں سے بعض صفات ایک دوسرے کی ضد ہیں مثلاً رحیم ہونا اور عدل کرنا۔ جو عدل کرے وہ رحم کیونکر کر سکتا ہے اور سراسر رحم اور عفو ہو وہ عدل کیسے کرے گا۔ وہ آج تک اس گتھی کو سلجھانے میں ناکام ہی رہا تھا۔ لیکن اب جب اللہ نے اُس پر اپنا کرم کرتے ہوئے اُس کی توجہ اپنی صفت کبریائی کی طرف مبذول کروائی تو ساتھ میں یہ گتھی بھی حل ہوئی اور الجھن بھی رفع ہو گئی۔

اب جب بھی اذان ہوتی وہ شعوری طور پر اللہ کی صفت کبریائی کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ ایک ایسی صفت جو ہر صفت کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ جنگوں اور لڑائیوں میں مسلمان شاید اسی لئے نعرہ تکبیر بلند کرتے ہیں کہ اُن کے اندر بھی بڑائی کی صفت متحرک ہو جائے اور یہ بات تو اکثر مشاہدہ میں آتی ہے کہ نعرہ تکبیر سے جہاں ایک طرف اللہ اکبر کہنے والوں میں طاقت، توانائی اور حوصلے کی ایک نئی لہر ابھرتی ہے وہاں دوسری طرف مخالف گروہ پر اس کا اثر اُن کے حوصلوں کے پست ہونے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جس رزمیہ گیت میں اللہ اکبر کی تکرار ہوتی ہے اُس کو سننے والے کے اندر ایک عجیب قسم کی لہر ابھرتی اور پھیلتی ہے۔ توانائی کی لہریں جذبات کو بر ماتی اور احساس کو گرماتی بھی ہیں بلکہ انسان کو عمل و حرکت پر اکساتی اور ابھارتی ہیں۔

وہ ایسی باتوں کو ابھرتے دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ توجہ بھی کیا چیز ہے؟ انسان متوجہ ہی نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ کبریا بھی لا محسوس ہو اور اگر توجہ کا باریک سا نقطہ کسی ایک جگہ ٹھہر جاتا ہے تو لیزر بیم کی طرح ہر وقت سامنے رہنے

والی چیز میں بھی معنویت کے وہ زاویے روشن ہو جاتے ہیں۔ جو بے توجہی اور لاعلمی کے اندھیروں میں چھپے رہتے ہیں اگر توجہ کا دائرہ سکڑ کر ایک نقطے کی صورت اختیار کر لے تو وہ تاریکی اور جہالت کو چھیدتا ہوا اُس کے دوسری جانب موجود علم و آگہی کی روشنی تک پہنچا دیتا ہے۔

اُس کو یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ وہ جو کل کو گھیرے میں لئے ہوئے ہے جزو میں کیوں کر بس رہا ہے۔ اس بات پر اُس نے نہ کوئی حیرت محسوس کی اور نہ ہی کوئی انوکھا پن۔ بس ایک خوشی کی لہر اُس کے اندر ابھری اور پھیلتی چلی گئی۔۔ وہ لہر اُس کے سارے وجود کو اپنے گھیرے میں لینے کے بعد اُس کی روح تک کو سرشار کر رہی تھی۔

تعلیمات قلندر بابا ؒ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن خوبیوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے وہ خود اللہ کی صفات کا عکس ہے اس لیے ان کی نشو نما اور مناسب استعمال کے لیے ہر قوم اور ہر خطہ ءارض پر یکے بعد دیگرے انبیائے کرام کو معبوث کیا جاتا رہا۔ انبیائے کرام کے سلسلے کا اختتام اس وقت ہو گیا جب اللہ کے محبوب رحمۃ اللعالمین حضور ﷺ پر اللہ نے اپنے دین کی تکمیل فرمادی حضور ﷺ کے ہاتھوں دین مبین کی تکمیل کے بعد چونکہ مزید کسی نئے دین، کسی تازہ نظام شریعت اور غور و فکر کے کسی نئے انداز کی ضرورت نہ رہی لہٰذا اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کو ایک نسل سے دوسری نسل تک ۔۔۔اور ایک دور سے دوسرے دور میں منتقل کرنا طے فرمادیا اور ہر دور میں ایسے سعید افراد فرمائے جنہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کے عکس کو دھندلانے سے روکنے میں اپنا کردار بھرپور اور مؤثر انداز میں ادا کیا۔ اللہ کے ان سعید بندوں نے ہر دور میں حضور ﷺ کی تعلیمات کا پرچم سربلند رکھا اور بنی نوع انسانی کو اس طرف راغب کیا کہ وہ ان تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر نہ صرف اس مادی زندگی بلکہ حیات اُخروی کو بھی پُر سکون، کامیاب اور کامران بنالے۔

مسلمانوں نے جب بھی حضور ﷺ کی تعلیمات سے روگردانی کی، قرآن حکیم کی آیات پر غور و فکر ترک کیا، تحقیق اور ریسرچ سے منہ موڑا اور اجتماعی انداز نظر کو چھوڑ کر ذاتی اور انفرادی مفادات کا کھیل شروع کیا تو وہ علمی پسماندگی اور معاشی ابتری کے علاوہ فکری انتشار اور زبوں حالی کا شکار ہو گئے۔ ان کی وحدت و اتحاد کا شیرازہ بکھر گیا۔ وہ مفلوک الحال اور دوسری اقوام کے دست نگر بن گئے۔

صوفیائے کرام اور اولیائے عظام نے اس صورتِ حال کی اصلاح میں ہمیشہ اپنا کردار ادا کیا ہے۔ لیکن ایسا بھی ہوتا رہا کہ ان اصحابِ بصیرت نے نبی کریم ﷺ کے مشن کی ترویج و اشاعت کی جو بھی کوششیں کیں وہ مسلمانوں پر طاری جمود کے پیشِ نظر مجموعی طور پر کچھ مؤثر ثابت نہ ہو سکیں۔ مسلمانوں نے حقیقت شناسی میں بے اعتدالیوں، عقیدتوں میں افراط و تفریط اور احکام خداوندی کی بجا آوری میں غلو کے ہاتھوں نقصان اُٹھائے۔ دوسری طرف غیر مسلم اقوام روحانی تقاضوں کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے مادی ترقی کے تعاقب میں اتنی دور نکل گئیں جہاں سے واپسی کی ہر راہ مادی ترقی کے سراب نے مسدود کر دی ہے۔ مادیت کے عفریت نے انہیں اس طرح نگل لیا ہے کہ ان کی روحیں بلبلا اُٹھی ہیں۔ بے چینی اور اضطراب نے انہیں ایسی وحشتوں سے دوچار کر دیا ہے کہ وہ نسل انسانی کو ہی مٹا کر رکھ دینے کے درپے ہو گئے ہیں۔ ان کی ہر ایجاد فائدے کے ساتھ ایسے منفی اور مضر اثرات کی حامل ہے جس نے انسانی صحت اور سکون کو تہہ و بالا کر دیا ہے۔ قُدرت اور فطرت کے اصولوں کی نقالی کے باوجود وہ ان سے متصادم اور برعکس ہونے کے سبب ان ایجادات نے آج پوری دنیا کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا ہے۔

تاریخ انسان کے اس موڑ پر مادی ترقی کے عفریت کے شکار اور اس کے ادبار کے مارے ہوئے انسان کو نجات کے لئے جس روحانی انقلاب کی ضرورت تھی قدرت کے دستِ فیض رساں نے اس کے لیے حضور قلندر بابا اولیاء کا انتخاب کیا۔ صاحبِ حق الیقین حضور قلندر بابا اولیا اللہ کے وہ سعید بندے ہیں جنہوں نے کائنات میں جاری و ساری تخلیقی فارمولوں اور تسخیری قوانین کو علمِ نبوت کے حوالے سے واضح کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی تخلیقات کے پسِ پردہ کام کرنے والے نظام پر غور و فکر کر کے اُس کیکہنہ تک پہنچنے کی جو دعوت بار بار دی ہے حضور قلندر بابا اولیا نے اُن پر عمل پیرا ہو کر اللہ تعالیٰ کی صفات، اس پر قائم نظامِ تخلیق کے قوانین، اصول و ضوابط اور اس کے انتظامی امور اور بندوبست کو نہایت آسان، مؤثر اور زود فہم انداز میں واضح کیا۔

انہوں نے آسمانی اور الہامی کتب میں مذکور روحانی علوم کا محض نظری اور فکری جائزہ ہی نہیں لیا بلکہ ان کی تشریح اس انداز میں فرمائی کہ ہر کس و ناکس کے لئے ان پر کاربند ہو کر ان کے فیوض اور برکات سے عملی طور پر بہرہ مند ہونا ممکن اور آسان ہو گیا۔ ان علوم سے بہرہ مند ہو کر تسخیر کائنات اور نیابت الٰہیہ کا جو فریضہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے ذمہ واجب فرمایا ہے اس سے عہدہ برآ ہونا آسان اور سہل ہو گیا ہے۔

حضور قلندر بابا اولیا حق اور یقین کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز المرام وہ ہستی ہیں جنہوں نے وارث علمِ نبوت ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے حضور ﷺ کے مشن میں انقلاب آفرین پیش رفت فرمائی اور ایک ہجومِ بندگان کو حق شناسی، معرفت اور عرفان کی راہوں پر گامزن فرمایا۔

حضور قلندر بابا اولیا کی تعلیمات کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ معاملہ چاہے تخلیقی فارمولوں اور تسخیری قوانین کا ہو یا عام دنیاوی معاملات کا، اُن کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے لازم ہے کہ انسان ایک غیر جانبدارانہ طرزِ فکر اور اندازِ نظر رکھتا ہو۔ آپؒ کا ارشاد ہے کہ ہر شخص کو طرزِ فکر کے دو زاویے حاصل ہیں۔ ایک زاویہ بحیثیت اہلِ معاملہ اور

دوسرا غیر جانبدارانہ زاویہ۔ جب انسان غیر جانبدارانہ ہو کر تجسس کرتا ہے تو اُس پر حقائق منکشف ہو جاتے ہیں۔ بابا صاحبؒ فرماتے ہیں تجسس کی یہ صلاحیت ہر ہر فرد کو ودیعت کی جاتی ہے تاکہ دنیا کا کوئی طبقہ معاملات کی درست تفہیم اور درست فیصلوں سے محروم نہ رہ جائے۔

جب انسان غیر جانبدار طرزِ فکر سے آراستہ ہو جاتا ہے تو اُس کی تلاش اور کھوج کے زاویے اور انداز بدل جاتے ہیں۔ وہ مفروضات کی بجائے اصل حقائق اور وقتی مصلحتوں اور انفرادی مفادات کی بجائے ابدی، لافانی اور آفاقی سچائیوں سے واقف رہنا چاہتا ہے۔

قلندر بابا اولیا کی تعلیمات کا دوسرا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ انسان اپنے اندر موجود اصل اور حقیقی انسان سے واقف اور مانوس ہو جائے۔ اُس انسان سے جس کا نام انبیائے کرام کی زبان میں روح ہے۔ یہ روح ہی انسان کا وہ اصل جسم ہے جو انسان میں موجود خفتہ اور بیدار، پنہاں اور آشکار صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اُن تمام صلاحیتوں کے مجموعے کو ہم زندگی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

آپؒ کے ارشاد کے مطابق انسان کے مادی جسم کی مثال ایک لباس کی ہے۔ جس طرح لباس گوشت پوست کے جسم کو ڈھانپنے کے کام آتا ہے اسی طرح یہ گوشت پوست کا جسم اصل انسان یعنی روح کے مادی اظہار کا ذریعہ بنتا ہے۔ جب تک لباس جسم پر ہوتا ہے۔۔ جسم کی حرکات منتقل ہو کر اُس کو ملتی ہیں اور جب لباس جسم سے الگ ہو جاتا ہے تو اُس کی تمام حرکات ساقط ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح جب تک ہم زندہ رہتے ہیں ہمارے اصلی یعنی روح کی حرکات ہمارے مادی جسم کے ذریعے واقع ہوتی ہیں۔ مرنے کے بعد ہمارے مادی جسم کی حیثیت ایک اترے ہوئے لباس کی رہ جاتی ہے۔ اصل انسان اُس میں موجود نہیں رہتا اور وہ اُس لباس کو چھوڑ کر کہیں چلا جاتا ہے۔

حضور بابا صاحب فرماتے ہیں ''جب مشاہدات اور تجربات نے یہ فیصلہ کر دیا کہ گوشت پوست کا جسم محض ایک لباس ہے، اصل انسان نہیں تو یہ تلاش کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ اصل انسان کیا ہے؟ کہاں سے آتا ہے اور کہاں چلا جاتا ہے؟

ان امور سے واقف ہونے کے لیے ہمارا ذہن تجسس کرتا ہے۔ آپؒ کا فرمان ہے کہ تجسس ایک ایسی حرکت کا نام ہے جو پوری کائنات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ آپؒ نے یہ بات بھی وضاحت سے بیان فرمائی کہ انسانی شعور کی نگاہ کائنات کے ظاہر کو دیکھتی ہے اور انسانی لاشعور کی نگاہ باطن کو۔ بالفاظ دیگر انسان کا لاشعور اچھی طرح جانتا ہے کہ

کائنات کے ہر ذرّے کی شکل و صورت، حرکات اور باطنی کیفیات کیا ہیں لیکن وہ اِن تمام باتوں کو صرف اس لئے نہیں سمجھ سکتا کہ اُس کو اپنے لاشعور کا مطالعہ کرنا نہیں آتا۔ لاشعور کی صلاحیتوں سے استفادہ اور اُن کے مطالعہ کا ذکر حضور قلندر بابا اولیا شخص علمی یا نظری مباحث کے طور پر ہی نہیں کرتے بلکہ اُس کے عملی پہلوؤں کو بھی سامنے لا کر اُس سے استفادے کے طریقے بھی تعلیم فرماتے ہیں۔

اِس ضمن میں اُن کا یہ فرمان خصوصی توجہ کا طالب ہے کہ جب انسان یہ چاہے کہ میرا ذہن لاشعور کی حدوں میں داخل ہو جائے تو اُس کو چاہیے کہ وہ ماحول کے ہجوم کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کرے۔ انسانی ذہن ماحول سے آزادی حاصل کر لینے کے بعد شعور کی دنیا سے ہٹ کر لاشعور کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ ذہن کے اس عمل کا نام استغنا ہے اور یہ استغنا اللہ تعالیٰ کی صفتِ صمدیت کا عکس ہے اس ہی عمل کو عرفِ عام میں انخلائے ذہنی کہتے ہیں۔ سلوک کی راہوں میں جتنے بھی اسباق پڑھائے جاتے ہیں اُن سب کا مقصد انسان کو خالی الذہن بنانا ہی ہوتا ہے۔ خالی الذہن ہونے کی مشق کے لئے آپؒ نے مراقبہ کے عمل کو بہت اہمیت دی ہے۔

مراقبہ انبیائے کرام کی طرزِ فکر اور اندازِ نظر حاصل کرنے کا ایک اہم طریقہ بھی ہے۔ حضور ﷺ کی غارِ حرا کی سنت ۔۔ مراقبہ کے احیاء اور اُس کی ترویج واشاعت کے لیے آپؒ نے مراقبہ ٹیکنالوجی کی عملی تعلیم کے لیے خانقاہی نظام کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے، انفرادی طور پر مراقبہ کے علاوہ اجتماعی طور پر مراقبہ کرنے کا طریقہ رائج فرمایا تاکہ انبیاء کی طرزِ فکر کے حصول کے متلاشیوں کو سہولت رہے۔

انبیائے کرام کی طرزِ فکر کی وضاحت کرتے ہوئے قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں۔ جب انبیاء کسی چیز کے متعلق سوچتے تو وہ اُس چیز اور اپنے درمیان کوئی رشتہ براہ راست قائم نہیں کرتے تھے۔ اُن کی طرزِ فکر ہمیشہ یہ ہوتی کہ

کائنات کی تمام چیزوں اور ہمارا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ کسی چیز کا ہم سے براہ راست کوئی رشتہ اور تعلق نہیں ہے بلکہ ہم سے ہر چیز کا رشتہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔ اس طرزِ فکر کے استحکام کے نتیجے میں جب وہ کسی چیز کی طرف مخاطب ہوتے تھے تو اُس چیز کی طرف خیال جانے سے پیشتر اُن کا خیال پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف جاتا تھا۔ انہیں کسی چیز کی طرف توجہ دینے سے پیشتر یہ احساس عادتاً ہوتا تھا کہ یہ چیز ہم سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ اس چیز کا اور ہمارا واسطہ محض اللہ تعالیٰ کی وجہ سے ہے۔

بلاشبہ اس طرزِ فکر کی مشق حاصل ہونے کے بعد ہی کوئی شخص انبیاء کی پیروی، اطاعت اور اتباع کا دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہوگا۔ حضور قلندر بابا اولیا نے اس بات کو نہایت واضح انداز میں بیان کیا ہے کہ انبیاء اپنی تعلیم میں ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ ذاتِ مطلق کو سمجھنے کی کوشش ضروری ہے۔ بغیر ذاتِ مطلق کے سمجھے اُس کے عمل کا سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ فکرِ انسانی میں ایسی روشنی موجود ہے جو کسی ظاہر کے باطن اور کسی حضور کے غیب کا مشاہدہ کر سکتی ہے۔ بالفاظ دیگر ہم کسی چیز کے باطن کو دیکھ سکیں تو پھر اُس کے ظاہر کا پوشیدہ رہنا ممکن نہیں۔

انبیائے کرام اور مادی حکماء کے مابین اندازِ نظر کا جو فرق ہے اور اُس فرق کی وضاحت سے انبیاء کی طرزِ فکر کی اہمیت کس طرح سے واضح ہو جاتی ہے، اس کے لیے حضور قلندر بابا اولیا کا یہ ارشاد محلِ نظر رہنا ضروری ہے کہ انبیاء باطن کو تلاش کرتے ہیں اور حکما خارج کے ذریعے اشیا کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ آپؒ فرماتے ہیں۔ کسی حد تک حکما کی طرز تلاش غلط نہیں ہے لیکن اُن کی طرز میں ایک نقص ہے کہ وہ جن چیزوں کی علامتیں خارج میں نہیں دیکھتے اُن کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس رویے سے کائنات کی ساخت میں جتنے مخفی حقائق ہیں وہ زیادہ تر انجانے رہ جاتے ہیں۔ جب کہ انبیاء علیہم السلام کے رویوں میں ایسا کوئی نقص نہیں ہے۔ وہ ذاتِ مطلق کی ذریعے امرِ مطلق کو تلاش کرتے

ہیں۔ اس طرح اُن کی فکر ایسے اجزا کو پالیتی ہے جو مظاہر کے پابند نہیں ہیں۔ انبیاء مظاہر کو نظر انداز نہیں کرتے تاہم وہ مظاہر کو اصل قرار دے کر صرف مظاہر کی روشنی میں گم نہیں ہو جاتے وہ مظاہر کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں جتنی مظاہر کی اصل کو۔ انبیاء کی زبان میں مظاہر کی اصلوں کا نام صفاتِ الٰہی ہے۔ وہ اسی طرح یعنی صفات کے ذریعے ذاتِ مطلق تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ اس رسائی کے نتیجے میں اُن پر ذاتِ مطلق کی مصلحتیں منکشف ہو جاتی ہیں۔ پھر یہ اُن کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اُن مصلحتوں کو نظر انداز کر دیں یا اُن کو مقصدِ حیات نہ بنائیں۔

حضور قلندر بابا اولیاء کو اللہ تعالیٰ نے اس شرف سے بھی نوازا ہے کہ انہوں نے قرآن حکیم میں مذکور کائناتی فارمولوں، تسخیری قوانین اور تخلیقی اصولوں کو موجودہ دور کے شعور کی سکت کی مناسبت سے بتصریح بیان فرمایا ہے۔ آپؒ نے اس امر سے پردہ اُٹھایا ہے کہ بیداری اور خواب کے حواس کی اصل ایک ہی ہے اور دونوں یکساں طور پر حقیقی ہیں۔ آپؒ کا ارشاد ہے۔ انسان کے ادراک و حواس میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ نے اُس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

ایک حصہ وہ ہے جس کا تعلق رات کے حواس سے ہے اور دوسرا حصہ وہ ہے جس کا تعلق دن کے حواس سے ہے۔ اس ہی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں لیل اور نہار کے الگ الگ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ رات کے حواس کو تاریکی، غنودگی یا نیند کہہ کر غیر حقیقی تصور کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے موجب اس تصور کی تردید ہو جاتی ہے اور یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک رات اور دن کے حواس یکساں ٹھوس اور حقیقی ہیں۔ اگر ہم ذرا سا تجزیہ کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ دن کے حواس کو اجتماعی شہادت حاصل ہے اور رات کے حواس کو انفرادی۔

غلطیاں اجتماعی ہوں یا انفرادی اُن سے محفوظ رہنے کا طریقہ بھی حضور قلندر بابا اولیاء نے تعلیم فرماتے ہوئے بتایا کہ ہر انسان کو ایک ایسی کیفیت حاصل ہے جس کو وہ اپنی زبان میں ضمیر کے نام سے پہچانتا ہے۔ وہ ضمیر کی آواز سنتا ہے اور اُس کی رہنمائی میں نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ فی الواقع یہ اللہ تعالیٰ کی آواز ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا بخشا ہوا نتیجہ ہوتا ہے۔ نتیجہ انسان کی ذات تک پہنچتا ہے تو نفس کی تنقید شروع ہو جاتی ہے اور یہ تنقید انسان کی نیت کو صحیح رکھتی ہے یا غلط کر دیتی ہے۔ جب تک انسان اندرونی آواز پر توجہ نہیں دیتا، رہنمائی حاصل نہیں کر سکتا۔

اس کے ساتھ ساتھ فہم وادراک کو محدود طرزوں سے نکالنے اور اُس میں وسعت اور گہرائی پیدا کرنے پر بھی حضور قلندر بابا اولیا نے بہت اصرار کیا ہے۔ آپؒ کا فرمان ہے کہ اگر ایک شخص کی دلچسپیاں اُس کے خاندان تک محدود ہیں تو اُس کی فہم صرف خاندان کی حدود میں ہی سوچ سکتی ہے۔ اُس کے تجربات اور مشاہدات بھی اسی مناسبت سے محدود ہوں گے۔ یوں کہیے کہ اُس نے اپنی فہم کو محدود کر لیا ہے۔ انسان کی آنکھ اور کان اُس کی اپنی فہم کی حدودوں میں دیکھتی اور سنتے ہیں۔ فہم کی حدوں سے باہر نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ سن سکتے ہیں۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے اطراف میں دیکھ رہے ہیں اور سُن بھی رہے ہیں لیکن اُس کی فہم کو اپنے خاندان سے باہر کسی چیز میں ذرہ بھر دلچسپی نہیں ہوتی۔ اُس کے شعور کا حال چند سالہ بچے جیسا ہوتا ہے۔ ایک ایسے بچے کا جس کو آپ ریڈیو پر ساری دنیا کی خبریں سنوادیں مگر وہ نہ کچھ سمجھے گا اور نہ کچھ محسوس کرے گا۔ اگر کوئی شخص پچاس سال کی عمر میں صرف اپنے خاندان کی حدود میں سوچتا ہے تو روحانیت کی رو سے اُس کی عمر چند سال سے زیادہ تصور نہیں کی جا سکتی۔ کسی ایسے انسان کا شعور جو محض اپنے انفرادی مفاد کو مدِ نظر رکھتا ہو، سو سال کی عمر میں بھی بلوغت کو نہیں پہنچتا۔ کائنات کی اسٹیج پر اُس کی وہی حالت ہوتی ہے جو ایک تین سال کے بچے کی کسی بین الاقوامی فورم میں ہو سکتی ہے۔

حضور قلندر بابا اولیا فرماتے ہیں مذہب اس ہی وجہ سے لازمہ حیاتِ انسانی ہے۔ جس قوم کا ایمان کائنات کا اخلاص نہیں وہ قوم نہ تو کائناتی قدروں کا مشاہدہ کر سکتی اور نہ ہی اُس کی فہم کائناتی علوم تک پہنچ حاصل کر سکتی ہے۔ اس وضع کی قوم ہزاروں سال کی عمر پانے کے باوجود پالنے کا بچہ ہی رہے گی۔

آپؒ نے یہ وضاحت فرمائی کہ انسان کو ادراک کے دو زاویے حاصل ہیں ایک وہ جو انفرادیت یا افرادی مفادات تک محدود ہے اور دوسرا وہ جو انفرادیت کی حدود سے باہر ہے۔ جب ہم انفرادیت کے اندر رہتے ہوئے دیکھتے تو کائنات شریک نہیں ہوتی لیکن جب ہم انفرادیت سے باہر نکل کر دیکھتے ہیں تو کائنات شریک ہوتی ہے۔ جس زاویے میں کائنات شریک ہے اُس کے اندر ہم کائنات کی تمام اشیا کے ساتھ ساتھ اپنا ادراک بھی کرتے ہیں۔ انفرادیت ایک شخص، ایک جماعت یا پوری قوم پر مشتمل ہو سکتی ہے۔ آپؒ نے بتایا کہ انفرادیت کے زاویے کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ یہ کسی نہ کسی مرحلے میں کائنات کی اور اشیاء سے منحرف ہو جاتی ہے۔ اس زاویے میں نگاہ ہمیشہ غلط دیکھتی ہے۔ مثلاً کسی چیز کی جسامت ہوا میں کچھ اور نظر آتی ہے اور پانی میں کچھ اور۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ یہ اختلافِ نظر زمان و مکاں کی پابندیوں کے سبب ہے۔ دیکھنے والا جب تک زمان و مکاں سے آزاد نہ ہو جائے کسی شے کی حقیقت کو نہیں پا سکتا۔

زمان و مکاں کیا ہیں؟ امر خلق کیا ہیں؟ زمانوں کی کتنی اقسام ہیں؟ حواس اطلاعات کو کس طرح موصول کر کے ادراک کو مہیا کرتے ہیں؟ تصورات و خیالات کہاں سے آتے ہیں؟ ذہن میں ادراک کس طرح تشکیل پاتا ہے؟ کائناتی نظام کن فارمولوں پہ اور کس طرح قائم ہے؟ اس طرح کے ہر سوال کا جواب حضور قلندر بابا اولیا نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب ''لوح و قلم'' میں صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان فرما دیا ہے۔

اس کتاب میں آپؒ نے بیان فرمایا ہے کہ بیداری شعوری طرز ہے اور خواب لاشعوری طرز۔ بیداری یعنی شعور میں رہتے ہوئے آدمی زمانیت کی گرفت میں ہوتا ہے لیکن خواب یا رات کے حواس یعنی لاشعور میں داخل ہونے کے بعد آدمی ٹائم اور سپیس کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔

جب انسان محدود اندازِ نظر اور طرزِ فکر سے باہر آجاتا ہے تو اُس کو وہ دولتِ عرفان نصیب ہو جاتی ہے جس کی تلاش میں وہ عالمِ ارواح سے چل کر جنت کے راستے سے ہوتا ہوا اس عالمِ رنگ و بو میں اتارا گیا ہے۔ اسی دولت عرفان کے حصول کے لیے انبیاء علیہم السلام نے وہ انداز نظر تعلیم فرمایا جو خود اُن کو بارگاہ رب العزت نے اپنی رحمت سے عطا فرمایا تھا۔ یہی وہ طرز فکر ہے جس کو عام کرنے کی سعی میں انبیائے کرام نے اذیتیں برداشت کیں۔ کئی ایک نے تو اپنی جانوں کے نزرانے تک اس راہ میں پیش کئے۔

حضور قلندر بابا اولیا نے جہاں ایک طرف روحانی علوم کو سائنٹفک انداز اور جدید خطوط پر منضبط اور مدوّن کر کے نظری طور پر پیش کیا وہاں دوسری طرف آپ نے ان علوم کی عملی ترویج کے جو شاندار بے مثال اقدامات کئے اُن میں سرِ فہرست انبیاء کے علوم کی سوجھ بوجھ اور سمجھ پیدا کرنے، اُن علوم کی درست تفہیم ور اُن پر کامیابی سے عمل پیرا ہونے کے لیے خانقاہی نظام کا احیاء کرنے کو سلسلہ عظیمیہ کی بنیاد رکھنے کے ساتھ ساتھ اس سلسلہ کو چلانے، لوگوں کی روحانی تربیت کرنے کے لیے ایک ایسا بندہ تیار کیا جس کی مثال یہ زمانہ شائد آئندہ کئی صدیوں تک پیش کرنے سے قاصر ہی رہے گا۔

الشیخ خواجہ شمس الدین عظیمی مدظلہٗ العالی وہ نابغہ روزگار ہستی ہیں جن کی تربیت کا اہتمام کرنے کو حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے انہیں سولہ سال، روز و شب لگاتار اپنی قربت سے نوازا اور اُن کو روحانی علوم کے اُس ورثے سے بہرہ مند کیا جو انبیاء کے علوم کا ترکہ ہے، اور پھر انہیں خانوادہ سلسلہ عظیمیہ مقرر فرمایا۔

بلاشبہ سعید وہ لوگ جنہوں نے انبیائے کرامؑ کے مشن کو اپنایا اور اُس کو اپنی زندگی کا منشا اور مقصد بنالیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے اُن کے درجات بلند فرمائے ہیں۔

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را۔